ذاکر صاحب: ذاتی یادیں

(۲)

- ☆ جناب [illegible] احمد فاروقی
- ☆ جناب اشتیاق محمد خاں
- ☆ ڈاکٹر اطہر پرویز
- ☆ ڈاکٹر اقبال حسین
- ☆ جناب اکبر رضا جمشید
- ☆ ڈاکٹر محمد اکرام خاں
- ☆ ڈاکٹر امین اشرف
- ☆ پروفیسر اولاد احمد صدیقی
- ☆ کرنل بشیر حسین زیدی
- ☆ جناب سید حسن
- ☆ جناب خلیل الرب
- ☆ نواب رحمت اللہ خاں شروانی
- ☆ پروفیسر سعید احمد اکبرآبادی
- ☆ ڈاکٹر سلیمان اطہر جاوید
- ☆ پروفیسر سلیم الزماں صدیقی (کراچی)
- ☆ پروفیسر محمد شبیر خاں
- ☆ محترمہ شکیلہ اختر
- ☆ جناب شہاب الدین دسنوی
- ☆ جناب سید شہزاد حیدر
- ☆ جناب ضیاء الحسن فاروقی
- ☆ پروفیسر ظل الرحمٰن خاں
- ☆ ڈاکٹر ظہیر احمد صدیقی
- ☆ جناب عبد اللطیف اعظمی
- ☆ جناب عبد الماجد خاں
- ☆ جناب مرزا عزیز اللہ بیگ
- ☆ پروفیسر عطاء الرحمٰن عطا کاکوی
- ☆ جناب عیاض انصاری
- ☆ پروفیسر خواجہ سید کمال الدین حسین مدنی
- ☆ جناب کے۔ بی۔ سرکار
- ☆ ڈاکٹر سید محمد مثنیٰ رضوی
- ☆ پروفیسر محب الحسن
- ☆ پروفیسر سید محمد محسن
- ☆ قاضی معز الدین احمد
- ☆ جناب ناصر حبیبی

★

خدا بخش اورینٹل پبلک لائبریری، پٹنہ

تقسیم کار
صدر دفتر
مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، جامعہ نگر، نئی دہلی۔ ۱۱۰۰۲۵

مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، جامعہ نگر، نئی دہلی۔ ۱۱۰۰۲۵

شاخیں

مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، اردو بازار، دہلی۔ ۱۱۰۰۰۶
مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، پرنس بلڈنگ، بمبئی۔ ۴۰۰۰۰۳
مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، یونیورسٹی مارکیٹ، علیگڑھ۔ ۲۰۲۰۰۲

اشاعت ۱۹۹۵ء
قیمت : ایک سو روپے

پاکیزہ آفسیٹ، شاہ گنج، محمد پور روڈ، پٹنہ۔۶ میں طبع ہوئی۔

فہرست

ذاکر صاحب — ذاتی یادیں

پیش گفتہ

ڈاکٹر ذاکر حسین (۱۸۹۵ - ۱۹۶۹ء) کے اقوال و اعمال کے بارے میں قریبی لوگوں کی ذاتی یادوں کا ایک مرقع پیش کیا جا رہا ہے۔ اس میں نظر کے گوناگوں زاویے ملیں گے لیکن ہر زاویے سے تصویر کا ایک ہی رنگ ابھرتا دکھائی دے گا، خلوص اور لگن سے کاڑھی ہوئی اخلاقی شخصیت کا رنگ جس نے اخلاق النبی تک پہنچنے کے لیے ابن آدم کا تانا بانا راسا قائم کیا تھا، عدم سے عظمت کا راستہ۔

بڑی شخصیتوں کے افعال و اقوال، ان کے بعد آنے والے اپنے بعد آنے والوں کے لیے، مرتب کر جاتے ہیں کہ انھیں سن کے، پڑھ کے، اگر اپنے اندر اہلیت اور صلاحیت ہو تو، ایک شخصیت برتر وجود میں آسکے کہ ۔ برتر سے برترین تک حصول شخصیت کا سفر ہی ساری انسانی تگ و دو کا حاصل ہے۔

اب تک صوفیہ کے ملفوظات کثرت سے سامنے آتے رہے ہیں متصوفانہ شخصیت میں بھی ایک عظمت ہے لیکن وہ سامنے اس طور سے لائے گئے ہیں کہ گویا حسیات ڈرنے کے رہ گئے ہیں۔ کوئی نقش پا ایسا نہیں جس پر کوئی دوسرا بھی چلنے کی جرأت کر سکے، ہمت لا سکے۔ اخلاقی شخصیت، اسی ہماری آپ کی عملی بڑی دنیا میں پلی بڑھی شخصیت ہوتی ہے جو زندگی کے ہر اونچ نیچ سے گزرتی، اپنا احتساب کرتی اور کراتی، دوسروں کے لیے جی کر عظمت کے راستے اپنے کو گویا جیتی کاڑھتی اور خدائی اخلاقی سانچے میں ڈھالتی ہوئی، اردگرد کو روشنی کے سیلاب میں نہلاتی ہے

مشہور صوفی حضرت عبدالقدوس گنگوہی کا ایک قول ہے کہ محمد عربی معراج میں آسمانی بلندیوں کے آخری نقطے تک جا کے لوٹ آئے۔ قسم خدا کی،

ان کی حکومت ہوتی تو ہرگز واپس نہ آتا۔ اقبال نے یہ قول دہراتے ہوئے
کہا کہ ایک صوفی اور ایک نبی میں یہی فرق ہے کہ صوفی معراج سے ایک محدود
تک جا کر حیات اور دنیا کو فانی سمجھتا ہے، پیغمبر تجربے کی مدد سے اور تازہ
ولولہ پھر زمان و مکان کی دنیا میں واپس آجاتا ہے کہ تاریخ سازی کر سکے۔
رسول اللہ کی ذات میں متصوفانہ شخصیت اور اخلاقی شخصیت کا حسین ترین
امتزاج مل جاتا ہے

○

ڈاکٹر صاحب کی شخصیت ایک اخلاقی شخصیت تھی، جو متصوفانہ شخصیت
کے عناصر سے اور سموتی جاتی تھی کہ نکلا وہ آگے گیا اور شخصیت سازی کا سفر
ادھورا رہ گیا۔ ایک حقیر بندگی میں یہ سفر کس نے پورا کیا ہے! لیکن اسی انسانی
بے بسی میں انسانی عظمت کا اشارہ پنہاں ہے۔ محدود کا لا محدود کو چھو لینے کا
عزم بھی! بے بس ہوتے ہوئے بھی انسان کتنا مہتم بالشان ہے کتنا حقیر اور کیسا عظیم!

○

جامعہ اور علی گڑھ کو حیات نو بخشنے کے بعد لکھا یوں ہی تھا کہ
بہار کے عظیم ترین علمی ادارے خدا بخش کو بھی ذاکر صاحب کے ہاتھوں نئی
زندگی ملے۔ وہ ۱۹۵۷ء میں گورنر ہو کر آئے اور جب ۱۹۶۲ء میں بہار چھوڑا
تو خدا بخش کو ایک مضبوط بنیاد فراہم ہو چکی تھی۔

ڈاکٹر صاحب کہا کرتے تھے جو ملت اپنے محسنوں کے احسانات کو
بھلا دیتی ہے، خدا اس پر محسن اتارنا بند کر دیتا ہے۔ خدا نہ کرے کہ کبھی
اس بشارت کے مخاطب ہم بنیں۔

خدا بخش لائبریری نے اپنے محسن کی یاد میں ذاتی یادوں کو
منضبط کرنے کا ایک سلسلہ شروع کیا ہے جسے رفتہ رفتہ ایک مرتب
شکل دی جاتی رہے گی۔

● عابد رضا بیدار

ذاکر صاحب: ذاتی یادیں

۲

جناب سید شہزاد حیدر
3- Madrasa, Upper Kote
بلند شہر

ذاکر صاحب: ذاتی یادیں

میرے والد سید اشفاق حیدر رضوی مرحوم کا اور ڈاکٹر ذاکر حسین صاحب مرحوم کا ساتھ ۱۹۰۶ء میں جب کہ تقسیم بنگال کی وجہ سے ملک میں شورش تھی اور ڈاکٹر صاحب کا ساتھ اسلامیہ ہائی اسکول اٹاوہ (یوپی) کے درجہ چہارم میں ہوا اور یہ ساتھ لگاتار اسی اسکول میں برسوں تک قائم رہا۔ پھر ۱۹۲۱ء تک مختلف عادات، تعلیم مختلف شعبوں میں ہم آہنگی کی وجہ سے دونوں کے درمیان ایسی محبت اور تربیت قائم ہو گئی جو تا دم حیات قائم رہی۔ یہاں کی تعلیم سے فارغ ہو کر ذاکر حسین صاحب مزید اعلیٰ تعلیم کی غرض سے جرمنی چلے گئے اور میرے والد نے تعلیم سے فارغ ہو کر وکالت کا ڈپلوما حاصل کرنے کے بعد فوجداری کے وکیل کی حیثیت سے اپنی زندگی کے دوسرے دور کا آغاز کیا۔ میرے والد کو چونکہ وکالت کا پیشہ شروع

جناب سید اشفاق حیدر رضوی مرحوم

ہی سے ناپسند تھا، اس لیے اس پیشہ کو چھوڑنے کی غرض سے کچھ دیگر راستے ۱۹۲۶ء تک اختیار کیے مگر کسی میں کامیابی نہ ہوئی اس وجہ سے ۱۹۲۶ء کے بعد سے مستقل طور پر پیشۂ وکالت کو ذریعہ معاش بنایا۔ اس پیشہ میں میرے والد کو جو کامیابی مثل دیگر وکیلوں کے ہونی تھی اس کی خاص وجہ یہ تھی کہ انھوں نے کبھی بھی کسی جھوٹے مقدمہ کی پیروی نہیں کی۔ وہ ہمیشہ کہا کرتے تھے کہ ایک مسلمان وکیل کا جھوٹے مقدمہ میں جھوٹے موکل کی طرف سے پیروی کرنا مذہب اسلام اور قرآن سے خیانت ہے۔ ظاہر ہے ایسے وکیل کو کامیاب ہونے کے مواقع کہاں حاصل ہو سکتے تھے۔ چنانچہ ان کی زندگی بلکہ ان کے عزیزوں کی بھی زندگیاں تنگدستی اور افلاس کا شکار رہیں۔

ڈاکٹر ذاکر حسین صاحب مرحوم ابتدا ہی سے کانگریسی خیالات کے رہے اور گاندھی جی، پنڈت نہرو وغیرہ لیڈروں کے حلقہ میں رہے۔ برخلاف ان کے میرے والد نے کبھی بھی سیاست سے دلچسپی نہیں لی۔ غالباً اس کی وجہ یہ رہی ہو کہ اول تو مذہبی رنگ جس میں ترک قصص بھی شامل تھا گزارنے کے عادی تھے، اور دوسری بات یہ تھی کہ وہ فرنگیوں کی مکاری کانگریس کی قومی یکجہتی خلافت کمیٹی کی تحریک ترک موالات اور آغاخاں کی صدارت میں مسلم لیگ کی پالیسی کو سمجھتے تھے اپنے آپ کو الگ رکھتے تھے اور یہی ایک واسطہ تھا جو میرے والد اور ڈاکٹر ذاکر حسین کے درمیان تھا۔ ڈاکٹر صاحب سے تعلقات [illegible] کبھی اثر نہیں پڑا جیسا کہ جب ڈاکٹر ذاکر حسین صاحب مسلم یونیورسٹی کے وائس چانسلر ہوگئے تو انہوں نے خود ہی یہ محسوس کیا۔ میرے والد کے اندر وہ خوبیاں ہیں جو ایک قابل وکیل کے واسطے ضروری ہیں اس وجہ سے انہوں نے اپنی چٹھی نمبر ۱۱۰ مورخہ ۲ مئی ۱۹۵۲ء کے ذریعہ میرے والد کو مسلم یونیورسٹی علی گڑھ کے لیے [illegible] کی حیثیت کی پیشکش کی جس کو میرے والد نے قبول کیا۔ ڈاکٹر ذاکر حسین صاحب مسلم یونیورسٹی سے منتقل ہونے کے بعد [illegible] سے نائب صدر جمہوریہ ہند اور آخر میں صدر جمہوریہ ہند کے عہدہ پر پہنچ گئے۔ اس تمام عرصہ میں دونوں ہستیوں کے تعلقات مستقل رہے۔ خط و کتابت رہی آنا جانا رہا جب بھی ہم لوگوں کو کوئی پریشانی ہوتی اور ڈاکٹر صاحب کو معلوم ہو جاتا تو وہ اس کو حل کر دیتے، یہاں تک کہ ایک مرتبہ جب میرے بھائی [illegible] بیمار پڑ گئے تو [illegible] نے دہلی لا کر ان کا علاج کرا دیا۔ جب میں نے انٹر کلاس پاس کر لیا تو انہوں نے بہت خوشی کا اظہار کیا اور مزید تعلیم کو جاری رکھنے کے واسطے پڑھائی کا خرچہ برداشت کرنے کی ذمہ داری اپنے اوپر لے لی جیسا کہ وہ ہمیشہ پرنسپل ڈی اے وی کالج [illegible] شہر کے نام جہاں میں تعلیم پاتا تھا چیک روانہ کر دیا کرتے تھے یہ سب کچھ تھا جہاں تک وہ ہمارے ساتھ ہمدردی اور مدد اپنی جیب اور ذاتی کوشش سے کر سکتے تھے ہمیشہ تیار رہتے تھے، مگر جب ہماری مدد کا سوال بجائے ڈاکٹر حسین کے راشٹرپتی یا راشٹرپتی بھون سے ہوتا تو اس کے واسطے دروازہ مقفل ہو جاتا اور ایسا ہوتا کہ ہماری ہزار کوشش کے باوجود بھی نہ کھلتا۔ مثلاً انہوں نے جب وہ راشٹرپتی تھے تو کسی ایسے فنڈ سے جو صدر کے پاس ایسے کاموں کے واسطے مخصوص ہوتا ہے، میرے والد کا ایک قلیل سا وظیفہ مقرر کر دیا تھا جو ان کو تاحیات ملتا رہا۔ چونکہ نام وظیفہ کا تھا اور رقم نہایت قلیل اس وجہ سے میرے والد نے ان کو تحریر کیا کہ کیا اچھا ہو کہ اگر آپ اس وظیفہ کو اس PENSION میں تبدیل کر دیں جو مجھے ماہ کی پہلی تاریخ کو جہاں جہاں سے ملا کرے، تو اس کا جواب ڈاکٹر صاحب نے اس طرح دیا: "میں آپ کے مقصد کو سمجھ گیا۔ مگر چونکہ آپ اپنی زندگی کے کسی حصہ میں بھی سیاست میں داخل نہیں ہوئے اس وجہ سے آپ پولیٹیکل سفرر نہیں ہیں، جب

آپ اس خانہ ہی میں نہیں آتے تو میں کس طرح آپ کی PENSION کا بوجھ سرکاری خزانہ پر ڈال سکتا ہوں۔ جو وظیفہ مل
رہا ہے، وہ آپ کو زندگی بھر ملتا رہے گا" خواہ صدر کوئی ہو۔ جب ڈاکٹر ذاکر حسین صاحب ملک کے صدر تھے، تو کبھی کوئی
ایسا کام نکل ہی آتا کہ وہ میرے والد کو بلا لیتے اور جب وہ لکھنؤ میں پہنچ جاتے خواہ یہ نہ کیوں ۔ ساتھ ہوں، سرکاری
سطح پر مہمان بن کر قیام کرتے۔ مگر جب کبھی میرے والد اپنے کسی کام سے ڈاکٹر صاحب سے ملاقات کرنے کی تاریخ
مانگتے تو ڈاکٹر صاحب بڑی احتیاط سے تاریخ دیتے مگر ساتھ میں یہ بھی تحریر فرما دیتے کہ آپ کا قیام راشٹرپتی بھون میں نہیں ہو سکے
گا۔ ایک مرتبہ میرے والد نے میری ملازمت کے بارے میں طویل خط لکھا، اور یہ بھی لکھا کہ شہزادے اب بی۔ اے کر لیا ہے اگر اس
کو کوئی مناسب ملازمت مل جائے، تو ہمارے واسطے کافی سہولت ہو جائے۔ جس کا جواب ڈاکٹر صاحب نے اپنے ہاتھ سے تحریر کئے ہوئے
خط سے دیا (چٹھی نمبر ۳۰۵۶۴/۱۲/۱ پی مورخہ ۲۲ مارچ ۱۹۶۶ء)۔

"WITH REGARD TO SHAHZAD I AM AFRAID I WILL NOT BE ABLE TO
FO ANYTHING I HAVF MY OWN RFASONS FOR SAYING THIS. I
HOPF YOU WILL UNDFRSTAND AND LXCUSF MF

یہ اسی مضمون کو تفصیل کے ساتھ اردو میں اپنے ہاتھ سے تحریر کر کے منسلک کیا۔ تعجب
تو یہ تھا کہ باوجود ایسی سرد مہری کے جواب سے دونوں کے تعلقات میں کوئی کمی نہیں آتی تھی اور درمیان میں
کوئی فاصلہ نہ تھا۔ یہاں تک کہ ایک مرتبہ صدر کی حیثیت سے شہر کا دورہ کر رہے تھے تو وہ ڈاکٹر ذاکر حسین جس کو تمام دنیا
کے دوست ممالک قومی ترانے کے ساتھ گارڈ آف آنر دیں، ۲۱ توپوں کی سلامی دیں ملک کے اندر جب وہ دہلی کی جامع مسجد
میں نماز جمعہ پڑھنے آئیں تو انتظامیہ پوری جامع مسجد کو اپنے گھیرے میں لے لے۔ لیکن جب وہ شہر کا دورہ کرتے تو اونچے کوٹ
محلہ کی گلیوں میں سے گزرتا ہوا اپنے مخصوص عملہ کے ساتھ ہمارے گھر میں آ گئے، باتیں کیں، تعلقوں کے دن یاد
کرے، ایام بچپن یاد کرے۔ بچپن کے بعض دوستوں کو یاد کرے، خود ملے اور دوسروں کو بلائے گویا صحیح معنوں میں اپنی رضا
کا بچپنے کا لنگوٹیا یار آیا ہے۔ درمیان میں نہ کوئی شکوہ ہے۔ نہ شکایت۔ ایک دوسرے سے ملتے ہیں اس کے باپ ہیں دوست
ہیں میں اور دو شخص ذاکر حسین میں بچپن کی یادیں ہیں اور خلوص ہے یا یہ علم ہے شہزادہ میرے لئے کیا کیا ہو گے ابھی پڑھ رہا ہے
یہاں تک تو میرے والد اور ڈاکٹر ذاکر حسین صاحب مرحوم کے تعلقات کی تصویر تھی۔ اب میں آپ کے سامنے
ایک واقعہ کا تذکرہ کرتا ہوں، جو قریب قریب ڈاکٹر صاحب کی حیات کے آخر میں واقع ہوا۔
جیسا کہ مندرجہ بالا مضمون سے ظاہر ہے میں نے اپنے بچپن میں ذاکر حسین صاحب کی گود بھی دیکھی تھی اور انگلی
بھی پکڑی تھی جب بڑا ہوا تو کبھی گھڑی مانگ لی اور کبھی قلم جھٹک لیا یہ جب کسی موقع کو سہی تو وہ نہ تو میرے دعا گو

کہ انھوں نے آواز دی "شہزاد" میں نے جیسے آواز کو سنا ہی نہیں۔ بدستور قدم اٹھاتا رہا اور چلتا رہا لیکن پھر ایک کڑک دار آواز سنائی دی "شہزاد" میں رک گیا واپس آیا فرمایا بیٹھ جاؤ۔ چند سکنڈ تک ڈاکٹر صاحب بھی خاموش رہے اور میں بھی خاموش رہا۔ اب میں نہیں بول رہا تھا میرا مفکر اور غمگین چہرہ بول رہا تھا اور ڈاکٹر صاحب اس کو پڑھ رہے تھے، اس کے بعد فرمایا "شہزاد ناراض ہو گئے"۔ میں تمہارا چچا ہی نہیں حق باپ کے ہوں۔ تم کو اپنی اولاد کی طرح سمجھتا رہا اور سمجھتا ہوں۔ لیکن یہ سب اپنی جگہ پر ہے۔ میں اس ملک کا صدر ہوں، راشٹرپتی ہوں اس ملک کے تمہاری عمر کے تمام بچے میرے برابر کے بچے ہیں۔ ہو سکتا ہے کہ تم میرے اوپر زیادہ حق رکھتے ہو، مگر کیا تمہاری طرح کے اس پریوار میں اور ہزاروں جوان نہیں ہوں گے جو اپنی کسی نہ کسی کمی کی وجہ سے مجبور نہ ہوں گے مگر وہ بچے میرے پاس آ نہیں سکتے، تم آ سکتے ہو، وہ چاہتے بھی میرے پاس نہ آئیں، نہ آ سکیں میرے نزدیک آنے والے اور نہ آنے والے میں کوئی فرق نہیں بیٹا اگر میں تمہارے سلسلہ میں یہ سفارشی چکر چلاؤں تو مجھے ان سب کے ساتھ بھی اسی طرح کا چکر چلانے کے واسطے ہر وقت تیار رہنا پڑے گا جس کی وجہ سے DESERVING CANDIDATE کی حق تلفی ہوگی نہ میرے پاس اس کام کے واسطے وقت ہے اور نہ میرا ضمیر گوارا کرتا ہے۔ اب تم جا سکتے ہو، I AM SORRY EXCUSE ME ڈاکٹر صاحب نے چند جملوں میں سب کچھ کہہ دیا سب کچھ آئینہ کر دیا۔ اب میرے واسطے کوئی گنجائش نہ تھی زبان گنگ ہو گئی تھی میں کھڑا ہوا آداب کہا اور رخصت ہوا اور چل پڑا جب دروازہ کی طرف بڑھ رہا تھا اور دروازے سے لبوں میں تھے ہدایت کو رہتے تھے ظلماں بسے چل رہا تھا۔

دہلی سے واپس ہو رہا تھا، اور نہ معلوم کتنی مرتبہ یہ شعر پڑھا ہوگا سہ

گلگونہ عارض ہے نہ ہے رنگ حنا تو ۔۔۔ اے خون شدہ دل تو تو کسی کام نہ آیا

میں نے اپنا مقصد آگے چل کر اپنی کوشش سے حاصل کر لیا اس ملاقات کا ذکر اور بیان میں نے مندرجہ بالا سطور میں اپنے الفاظ میں کیا ہے۔ لیکن زیادہ تر الفاظ اور جملے وہی ہیں جو ڈاکٹر حسین صاحب مرحوم کی زبان سے نکلے تھے آج میں سوچنے پر مجبور ہوں کہ ڈاکٹر صاحب اپنی جگہ پر بالکل صحیح تھے۔

●●

ڈاکٹر محمد اکرام خاں
جامعہ ملیہ اسلامیہ، نئی دہلی

ڈاکٹر صاحب بڑے آدمی تھے اور بڑے بھی ان بڑوں میں تھے جو قریب سے دیکھنے پر اور بڑے ہو جاتے ہیں۔ وہ ایسے بڑے تھے جن کو دور سے دیکھنے والے عزت کرتے ہیں اور قریب سے دیکھنے والے ان پر عاشق ہو جاتے ہیں۔ ڈاکٹر صاحب کے ایک عاشق خواجہ غلام السیدین بھی تھے۔ اپنے ایک خط میں لکھتے ہیں:

"محبی محترم،

بینائی، بیماری کا سفر اور قلم ایک امتحان، اس لیے قلم برداشتہ لکھنے کی معافی چاہتا ہوں۔ اس سفر کے دوران میں نے علی گڑھ کا خطبۂ صدارت پڑھا "خَلَقَ الْاِنْسَانَ عَلَّمَهُ الْبَيَانَ"، اور علی گڑھ گزٹ کا "ذاکر نمبر"۔ دل عقیدت سے لبریز ہے اور آنکھیں پرنم اور قدرت سے یہ شکایت کہ جب وہ ایسی تخلیق کر سکتی ہے تو ہم جیسے خس و خاشاک پر طبع آزمائی کی زحمت کیوں فرمائی۔" آپ کا

سیدین ۸ر فروری ۷۰ء

یہ خط میں نے اس لیے پڑھا کہ اس مجمع میں ایسے بہت سے بزرگ اور احباب تشریف فرما ہیں جنہوں نے سیدین صاحب کی طرح ڈاکٹر صاحب کو دیکھا ہے، اُن کے ساتھ برسوں کام کیا ہے، اُن کے سامنے بیٹھ کر پڑھا ہے، اُن کے مشوروں کو مانا ہے، ان کی سرپرستی اور نگرانی میں، ان کی کڑی تنقید اور ماں باپ جیسی شفقت سے اپنے کو بنایا ہے اور اپنی زندگی کے رُخ اور رنگ کو بدلا ہے۔ یہاں کچھ وہ لوگ بھی ہیں جو ان کی نگرانی اور شفقت کے ہٹ جانے کے بعد یہ سمجھے ہوں گے کہ ان کے نہ ہونے سے کون سا اچھا کام ہے جسے دھکا نہیں لگا۔ وہ جب تک ساتھ رہے تو اُن کے کاموں کا حلقہ پوری طرح دکھائی نہیں دیتا تھا۔ اب اُن کے اٹھ جانے کے بعد محسوس ہوتا ہے کہ ایک آدمی کا ہاتھ کہاں کہاں تھا اور اس کی عقابی نظر کہاں کہاں پہنچتی تھی اور وہ حاجت مندوں، دکھ درد کے ماروں اور زمانے کے ستائے ہوئے لوگوں کی کس طرح مدد فرماتے تھے

اس مجمع میں زیادہ تر وہ لوگ ہیں جنھیں ذاکر صاحب کے ساتھ کام کرنے یا ساتھ رہنے کا موقع نہیں ملا ہوگا اور کچھ ایسے بھی ضرور ہیں جنھوں نے ذاکر صاحب کو دیکھا بھی نہ ہوگا۔ برسوں کی تعداد اب بڑھتی چلی جائے گی۔ نئے حالات ہوں گے، نیا زمانہ ہوگا اور نئے مسائل۔ کیا عجب ہے کہ جامعہ جس کے چپہ چپہ میں ذاکر صاحب کی روح موجود ہے اور جس کی نئی اور پرانی عمارتوں کی ایک ایک اینٹ سے ان کے خون جگر اور پسینے کی مہک آتی ہے زندہ رہے اور ذاکر صاحب کو بھلا دیا جائے۔ اگر خدا نخواستہ ایسا ہوا تو ہمارے بعد آنے والی نسلیں بہت بڑی قومی دولت سے محروم ہو جائیں گی نہیں ایسا نہیں ہو سکے گا اور ان شاء اللہ ہوگا یہ کہ جو ذاکر صاحب سے نہیں مل سکا ہے وہ ان سے جامعہ میں مل لے گا جو ان کو نہیں دیکھ سکا ہے وہ انھیں یہاں دیکھ سکے گا، جو ان کے پاکیزہ خیالات اور ان کی جسمانی ذہنی اور روحانی قدروں سے استفادہ نہیں کر سکا ہے وہ انھیں جامعہ میں پالے گا اور پورے طور سے فائدہ اٹھا سکے گا، پھر ان سے مل کر، ان کو پاکر اور ان کو دیکھ کر اپنے سانچے گا اور اپنی زندگی کا رخ صراط مستقیم کی طرف موڑ سکے گا۔ جامعہ ذاکر صاحب کے فلسفۂ حیات اور فلسفۂ تعلیم کی جیتی جاگتی تصویر ہے۔

ذاکر صاحب کا ذکر کروں اور یہ نہ بتاؤں کہ میری تقدیر ان کے دینے سے مل گئی ہے اور مان گئی ہے تو احسان فراموشی ہوگی۔ غریب پرورست، سخی تھے انھوں نے میری طرح انگنت بے سہارا اور بے یار و مددگار لوگوں کی زندگیاں سنواری اور سدھاری ہیں۔ انھوں نے ہزاروں غریبوں کا پیٹ پالا ہے ہزاروں بیواؤں کی سرپرستی فرمائی، ہزاروں یتیم بچوں اور بچیوں کو ماں باپ جیسا پیار دیا۔ کیا بتاؤں خدا نے ان سے کیسے کیسے اور کتنے نیک کام کرائے ہیں اور اس احتیاط سے کہ کسی کا دل نہ دکھ سکے، اپنے دل کو مستقل دکھیا بنا لیا۔ انھیں دوسروں کی خدمت کا شوق تھا اور اس شوق میں اس سے کبھی غافل نہیں ہوئے تھے خطاؤں سے چشم پوشی کرتے اور اچھائیوں کو ڈھونڈھ نکالتے، کہتے تھے کہ "آدمی آدمیوں کے متعلق اچھے سے اچھا گمان رکھے اور چاہے زود فریب کہلائے، نہ پیدا ہونے سے پہلے اور آدمی سے نیک دل اور نیک یقین کرے اور عقل مندوں کو اور بے وقوفوں کو کہ دونوں گمراہ ہوتے ہیں، معاف کرے۔" ذاکر صاحب علی گڑھ میں آٹھ سال بحیثیت وائس چانسلر رہے اپنی صحت کی خرابی کی بنا پر استعفیٰ دیا تو انڈین کیسریس کے نامہ نگار نے یہ سوال دریافت کیا کہ آپ کے نزدیک اچھی اور کامیاب زندگی کیسی ہونی چاہیے؟ ذاکر صاحب نے جو جواب دیا وہ یہ ہے۔ "زندگی میں سب سے سکون بخش چیز یہ ہے کہ آدمی اپنے ساتھی انسانوں کی خدمت کرے اور اس کے دل میں یہ یقین ہو کہ وہ گھٹیا کام نہیں کر رہا ہے یہ ہے میرا نظریہ اچھی زندگی کے بارے میں۔"

اگر یہ بات بے محل اور بے جوڑ نہ معلوم ہو تو میں علی گڑھ یونیورسٹی کی سالانہ رپورٹ سے وہ چند جملے پیش کروں جن میں ذاکر صاحب کی خدمات کو سراہا گیا ہے: "انھوں نے دلیری سے حالات کا مقابلہ کیا۔ اپنے اعتماد اور نیچے

ساتھیوں اور طلبا کے پکے عقیدے کے ساتھ اس ادارے کو صورت دینے میں کامیاب ہوئے۔ مقصد کی لگن، تعلیمی مسائل پر گہری نگاہ، استادوں اور طلبا کی مشکلات سے ہمدردانہ غور و فکر اور تمام مسئلوں میں انسانی نقطۂ نظر رکھنے کی بدولت وہ یونیورسٹی کے طلبا اور اساتذہ کے لیے دوستی، رہنمائی اور امنگ کا وسیلہ رہے۔ کونسل انتہائی محبت اور احسان مندی سے ہمیشہ ڈاکٹر ذاکر حسین کی بے پایاں خدمات کو یاد رکھے گی اور ان کے نظریات کی کامیابی کیلئے ان تھک جدوجہد جاری رکھے گی۔"

ڈاکٹر صاحب فطری طور پر استاد تھے اور اچھے استاد تھے۔ اچھے استاد کی تمام تر خوبیاں اُن کی شخصیت میں بھی ہوئی تھیں۔ ان کی طبیعت کا رجحان اپنی ذات کی طرف نہیں دوسروں کی طرف تھا۔ ان میں قوت کی آرزو، کمائی کا چسکا، جمع کر کے ڈھیر لگانے کی لت، لالچ، ہوس اور خود غرضی نہ تھا۔ ان کا دل ہمدردی، ہمدمی، میل ملاپ، فیاضی، دوسروں کو سہارا دینے اور مدد کرنے کے لیے تڑپتا رہتا تھا۔ وہ سماجی آدمی تھے اور دوسروں کو اچھا سماجی انسان بنانے کا شوق تھا۔ ان کا دل محبت اور خدمت کے جذبے سے معمور تھا۔ ان کی محبت میں مذہب و ملت کا امتیاز نہ تھا اور نہ رنگ و نسل کا لحاظ۔ انہیں بچوں سے بھی محبت تھی اور بڑے بوڑھوں سے بھی۔ انہیں جانوروں سے بھی محبت تھی اور انسانوں سے بھی۔ انہیں پودوں سے بھی محبت تھی اور پتھروں سے بھی۔ انہیں پھولوں سے بھی محبت تھی اور کانٹوں سے بھی۔ انہیں تو خدا کی ساری مخلوق سے محبت تھی اور اُن کی محبت کی اساس عزت اور خدمت تھی۔ ان کی بڑی صاحبزادی بیگم سعیدہ خورشید نے اپنی کتاب "ڈاکٹر صاحب کی کہانی" میں لکھا ہے۔ "میاں کو بچوں سے بھی محبت تھی اور بڑوں سے بھی۔ وہ ہر انسان کو عزت اور محبت کا مستحق سمجھتے تھے۔ انہوں نے شاید ہی کبھی کسی چھوٹے سے چھوٹے شخص کو بھی حقارت سے مخاطب کیا ہو۔ ہمیشہ اچھے الفاظ اور اچھے القاب سے مخاطب کرتے تھے آپ، جناب، میاں، صاحب، نام کے ساتھ۔ دل لگاتے کبھی کسی پر اپنی مصیبت نہ ڈالتے۔ اپنی تکلیفوں کا اظہار نہ کرتے۔ دوسروں کی تکلیفوں کو سنتے اور ہمدردی کرتے اور دلاسہ دیتے۔ لوگ ان کے پاس مایوس آتے اور خود اعتمادی اور حوصلہ کی دولت اپنے ساتھ لے کر لوٹتے۔ لوگ اپنے دکھ درد سنا کر ہلکے ہو جاتے اور یہ راتوں کو سو نہ سکتے کروٹیں بدلا کرتے۔ سوچا سوچتے رہتے اور ان کے مداوے کے جتن کرتے رہتے۔"

ڈاکٹر صاحب استاد بھی تھے اور مفکر تعلیم بھی۔ انہوں نے تعلیم کے متعلق جو سوچا اسے جامعہ کے تعلیمی مرکز اور دوسرے اداروں میں عملی جامہ پہنانے کی کوشش کی جس طرح اسی زمانے میں جرمنی میں کرشن اشٹائنر اور امریکہ میں جان ڈیوی پرانے تعلیمی نظام کو ختم کرنے اور جدید تعلیمی نظریات کو عملی جامہ پہنانے کی کوشش کر رہے تھے، اسی طرح ذاکر صاحب کام کے ذریعے تعلیم کے اصول پر جامعہ میں تجربہ کر رہے تھے۔ اُن کے تعلیمی طرز فکر و عمل کو دیکھ کر گاندھی جی نے بنیادی قومی تعلیم کی اسکیم ان کی صدارت میں مرتب کرائی۔ ڈاکٹر صاحب کے یہاں تعلیم کا مقصد بچے کی تمام تر پوشیدہ صلاحیتوں

کو اُبھارنا اور اُنھیں سماجی کاموں میں استعمال کرنا ہے۔ ان کے نزدیک ذہنی نشو ونما فرد اور اس کے ماحول کے درمیان عمل اور ردِ عمل سے ہوتی ہے۔ وہ دنیا کی محبوبیت کے مقابلہ میں عاقبت پر زور دیتے ہیں، اسی لئے چھ سے چودہ سال تک پوری تعلیم چیزوں اور سماجی اور قدرتی ماحول کے ربط سے مکمل کرانا چاہتے ہیں۔ ان کے یہاں انفرادی مقابلے کی بجائے اشتراکی عمل، تن آسانی کی بجائے محنت، نفرت کی بجائے محبت، انتقام کی بجائے انعام، بدگمانی اور خود غرضی کے بجائے اعتماد اور بے غرضی کے جذبات بیدار ہوتے ہیں۔ وہ انفرادی زندگی کو جماعتی زندگی کا تابع بنانا چاہتے ہیں لیکن انفرادیت کو دبانے اور کچلنے کے سخت خلاف ہیں۔ ان کے یہاں زندگی کا مفہوم سماجی ہے، جس کا مقصد خدمتِ خلق ہے اور تعلیم کا مقصد فرد کی شخصیت کی مکمل نشوونما سمجھتے ہیں" تعلیم نام ہی اس کا ہے کہ متعلم کے کُل قوائے ذہنی و جسمانی کی تربیت کرکے ان میں ہم آہنگی پیدا کی جائے اور اسے تمدنی زندگی کے کل شعبوں کا محرم بنا کر اس میں ذہنی استعداد کے مطابق حصہ لینے کیلئے تیار کیا جائے"

ذاکر صاحب کے قول اور فعل میں ہمیشہ مطابقت پائی گئی جو کہا وہ کیا، جو لکھا وہ کرنے کے بعد لکھا۔ ہمیشہ ان کے قول و فعل میں سچائی اور مطابقت پائی۔ مثال کے طور پر ان کی کتاب "تعلیمی خطبات" میں ان کا مضمون "سیرت کی تربیت" پڑھیئے۔ بڑا دلچسپ اور سبق آموز مضمون ہے۔ پورے مضمون کی تشریح یا تفسیر کا وقت نہیں لکھتے ہیں "سیرت کی تعمیر کے لیے چار عناصر کی بڑی ضرورت ہوتی ہے۔ ارادے کی قوت کا ایک حد سے کم درجہ، اجتہادِ فکر کا ایک کم سے کم مرتبہ، حسِ جماعتی کی ایک کم سے کم ذات اور اثر پذیری کی ایک کم سے کم وسعت، گو اِن اور بہ تدریج تقاضائے گستاخی ضرور ہے لیکن یہ کہنا ضروری معلوم ہوتا ہے کہ ہمارے ذاکر صاحب کو اکثر و بیشتر موقعوں پر گھر کے اندر اور باہر اس نظر سے دیکھنے کی کوشش کی کہ کہیں ان کے قول و فعل میں تضاد نظر آجائے۔ لیکن ہر موقع پر ان کی سیرت میں یہ چاروں عناصر نمودار اور پختگی کی حالت میں پائے گئے۔

میں مصروف ہوں۔ وہ میرے ہر سوال کا جواب بڑی دلچسپی سے دیتے ہیں۔ رشید صاحب کا تذکرہ کرتے ہوئے ان کی نگاہوں میں روشنی، چہرے پر شگفتگی اور لہجہ میں دلنوازی پیدا ہو جاتی ہے۔ رشید صاحب کے بارے میں اُن کا یہ جملہ آج بھی میرے کانوں میں گونج رہا ہے۔ "رشید صاحب جیسا دوست کسی کو ملے تو اس کو مطمئن ہو جانا چاہیئے۔" اسی دوران انھوں نے مجھ سے کہا کہ رشید صاحب کی سوانح کا باب تیار کر لوں تو اس کی ایک کاپی اُن کی خدمت میں ارسال کر دوں میں بات چیت کرتا رہا، جو چیز میں نے محسوس کی وہ یہ کہ ڈاکٹر صاحب نے اپنے عہدے کے شکوہ، دبدبے، رعب اور شان کو کسی طرح نمایاں ہونے نہیں دیا، بلکہ وہ ایک عام انسان کی طرح گفتگو کرتے رہے اور بحیثیت انسان کے اپنی شرافت، اپنائیت اور اپنے خلوص کا جادو جگاتے رہے، میں مسحور ہوتا رہا۔ کسی نے کہا ہے کہ بڑے آدمی کی پہچان یہ بھی ہے کہ اُس سے ملاقات کے بعد ہم میں بڑائی کا احساس پیدا ہو۔ کچھ اسی طرح بڑائی اور عظمت کا احساس لئے میں اُن سے وداع ہوا۔

اس ملاقات کو عرصہ ہو چکا ۱۹۷۵ء میں اپنے مقالے کی تیاری کے سلسلے میں مجھ کو ایک بار اور دہلی اور علی گڑھ کا سفر درپیش ہوا۔ اُسی عنایت کے ساتھ میری دی ہوئی تواریخ میں ڈاکٹر صاحب سے ملاقات کا شرف بخشا۔ ڈاکٹر صاحب سے پہلی ملاقات کے نقوش، میرے ذہن میں تازہ تھے، کسی گلاب نہیں، گلابوں کے گچھے کی طرح اور ذہن میں یہ خیالات بھی آرہے تھے کہ ڈاکٹر صاحب سے دوبارہ تعارف کی ضرورت ہوگی پہلی ملاقات کو تین سال کا عرصہ ہو گیا ہے، اس طویل عرصہ میں وہ مجھ کو کیوں یاد رکھنے لگیں پتہ نہیں ان کو روزانہ کتنے افراد سے ملاقات کرنی پڑتی ہے وغیرہ وغیرہ لیکن میرے تعجب کی حد نہ رہی میں اُسی ملاقاتی کمرے میں، جس میں نومبر ۱۹۷۲ء میں بیٹھا تھا۔ ڈاکٹر صاحب کا انتظار کر رہا تھا چند لمحے گذرنے نہ پائے کہ ڈاکٹر صاحب تشریف لائے اُن کے قدموں کی چاپ، اُن کے چلنے کا انداز میں آج تک فراموش نہ کر سکا ہوں، جیسے عزم و ایقان اور محکم ارادوں کی صلابت، کسی پیکر میں ڈھل چکی ہو، جیسے تدبر، سنجیدگی اور متانت نے کسی انسان کا روپ دھار لیا ہو۔ جیسے فکر و فلسفہ مجسم ہو چکے ہوں، جیسے شائستگی اور شرافت خراماں خراماں ہوں، جیسے کلاسیکی قدریں گوشت پوست کی صورت میں ڈھل کر چلی آرہی ہوں۔ ابھی میں تسلیم کرنے نہ پایا تھا کہ ڈاکٹر صاحب نے مصافحہ کے لئے ہاتھ آگے بڑھاتے ہوئے دریافت کیا "کہیئے، اچھے ہیں آپ! آپ کا مقالہ ختم نہیں ہوا؟"۔ ڈاکٹر صاحب کے ان الفاظ نے مجھ میں ایک عجیب امنگ اور حوصلہ پیدا کر دیا ایک خود اعتمادی دے دی۔ مجھے مسرت ہوئی کہ ڈاکٹر صاحب نے مجھے فراموش نہیں کیا ہے میں نے انھیں رشید صاحب کی سوانح کا باب پیش کیا۔ چند لمحوں کے لیے انھوں نے اُسے اِدھر اُدھر سے دیکھا۔ اظہار پسندیدگی کیا اور پھر میرے بارے میں گفتگو کرنے لگے مجھے محسوس ہوا، جیسے میں اپنے کسی عزیز سے مدت کے بعد مل رہا ہوں، اور وہ میرے حالات دریافت کر رہا ہے۔

میں محمد تقی طنز و مزاح کے بارے میں ڈاکٹر صاحب کی معلومات کچھ یونہی سی ہوں گی لیکن انھوں نے تو اردو
طنز و مزاح نگاروں پر ایک پُر مغز تبصرہ کر دیا۔ خدا تک کے نامور مزاح نگار۔ نصیر الدین خواجہ کے بارے میں اتنی معلومات
بہم پہنچائیں جو مجھے شاید ہی کہیں اور سے دستیاب ہوتیں۔ میں ہمہ تن گوش ڈاکٹر صاحب کی گفتگو سنتا رہا۔ چائے کے لوازم
کے آنے پر انھوں نے مجھ سے چائے پینے کے لیے کہا اور خود کہنے لگے۔ اسلوب کیا ہے؟ تنقید کیسی ہونی چاہیے؟ ادب میں
شخصیت کا کیا مقام ہے؟ خطوط میں شخصیت کیونکر واضح ہوتی ہے؟ وغیرہ وغیرہ۔ غرض مختلف موضوعات پر۔ ڈاکٹر
صاحب کے بارے میں جو کچھ پڑھا اور سنا تھا ڈاکٹر صاحب کی شخصیت کو اس سے کہیں زیادہ وقیع، عظیم، جامع، گمبھیر،
قد آور، دروں بیں، باوقار، پُر شکوہ اور بیکراں پایا کہیں زیادہ، کہیں زیادہ۔

ڈاکٹر صاحب سے ملاقات کے لیے خاص وقت مقرر ہوتا وہ از راہ عنایت ہمیشہ اس سے زیادہ گفتگو کرتے،
تاکہ پرائیویٹ سکریٹری اگر کہہ دیتے کہ ملاقات کے لیے کوئی اور آچکا ہے میں چاہتا کہ وہ بیٹھے رہیں۔ اور میں رخصت
کی اجازت چاہوں لیکن وہ بہت بڑے آدمی تھے۔ راستہ وہ ہو کر مصافحہ کرتے اور میرے ساتھ کمرے سے باہر تک آکر وداع کرتے
ڈاکٹر صاحب سے دوسری ملاقات کے بعد ان کی شفقت کچھ ایسی رہی کہ جب بھی خط لکھتا، بڑی چاہ سے بڑے
شوق سے جواب سے سرفراز کرتے۔ صدر جمہوریہ کی حیثیت سے ان کے انتخاب پر، پھر ان کی ہر سالگرہ پر خط لکھتا جس
کے جواب میں جوابی مکتوب آتا تہنیت کا شکریہ ادا کرتے ہوئے نیک خواہشات کا اظہار اور ڈھیر سی دعائیں۔

میں نے پی ایچ ڈی کی ڈگری حاصل کی، ان کا مبارکباد کا مکتوب آیا۔ میں نے اپنے مقالے کی اشاعت کی تیاری
شروع کی۔ رشید صاحب سے گہرے مراسم کی روشنی میں چاہتا تھا کہ میری کتاب 'رشید احمد صدیقی شخصیت اور فن' کا پیش لفظ
ڈاکٹر صاحب تحریر فرمائیں۔ میں نے اپنی اس خواہش کا اظہار کیا۔ وہ صدر جمہوریۂ ہند کے عہدے سے سبکدوش ہو چکے تھے۔ ان
کی مصروفیات اور ذمہ داریاں بڑھ چکی تھیں۔ ان کو پیش لفظ لکھنے کے لئے وقت کہاں؟ میرا ایقان یہی تھا اس لئے بھی کہ اپنی قومی
و ملکی مصروفیات کے باعث ان کی علمی و ادبی سرگرمیاں ختم سی ہو چکی ہوں، ختم ہونے کے برابر تھیں۔ انھوں نے پیش لفظ
تو نہیں لکھا لیکن حسن عمدگی اور خوبصورتی کے ساتھ گریز کیا۔ اس سے میری دل شکنی نہیں، ہمت افزائی ہوئی حوصلہ
ملا۔ وہ خط میرے سامنے ہے۔ وہ لکھتے ہیں

"سچ تو یہ ہے مجھے یہ رسم پسند نہیں۔ دوسروں سے کچھ لکھانے کی بجائے خود ہی لکھنا چاہیے۔ آپ بھی
اگر اس رسم سے بچ سکیں تو احتراز فرمائیے۔"

کتاب شائع ہوئی میں نے سب سے پہلے ڈاکٹر صاحب کی خدمت میں روانہ کی۔ ۲۰، ۲۵ روز ہی میں ڈاکٹر صاحب

کا عنایت نامہ ملا۔ انھوں نے کتاب کے بارے میں اپنی گرانقدر رائے ان الفاظ میں تحریر کی۔

"یہ کتاب مجھے اس لیے عزیز ہے کہ میرے ایک عزیز ترین دوست کی زندگی اور کام کی تصویر پیش کرتی ہے"

○

ڈاکٹر صاحب سے رشید صاحب کا حوالہ دیتے ہوئے کہا " رشید صاحب میرے بارے میں جو کچھ لکھتے ہیں وہ رشید صاحب کا ہی ہے کیونکہ رشید صاحب کے ذہن میں ایک کردار موجود ہے۔ یہ علیحدہ بات ہے کہ اُن کو اپنے تصور کا یہ کردار میری شخصیت میں ملتا ہے۔ یہ سمجھنا صحیح نہیں کہ مصنف کے کرداروں کا وجود خارج میں ہوا کرتا ہے، کیونکہ کردار کا تصور تو مصنف کے ذہن میں موجود رہتا ہے۔ وہ خارج سے اپنے کردار کے لیے کوئی نام لے سکتا ہے لیکن کردار تو بہر حال اُس کا اپنا پیدا کردہ ہے۔ میں نے ڈاکٹر صاحب سے پوچھا کہ آپ کی شخصیت میں آخر ایسی کیا بات ہے کہ رشید صاحب نے سب کا اس قدر زیادہ اثر قبول کیا۔ ڈاکٹر صاحب نے اس کے جواب میں فرمایا کہ "میں نہیں سمجھتا کہ مجھ میں ایسی کوئی خوبی ہے جس نے رشید صاحب کو متاثر کیا ظاہر ہے میں نے اپنی زندگی میں کئی لوگوں سے ملاقات کی ہے اگر مجھ میں خوبی ہوتی تو ہر شخص مجھ سے متاثر ہوتا لیکن واقعہ ایسا نہیں ہے ہر شخص مجھ سے متاثر نہیں ہے۔ یہ اس بات کی علامت ہے کہ مجھ میں کوئی خوبی ہونے سے زیادہ مصنف کے ذہن میں جو موجود ہے تو اس کو دیتے ہیں۔ سے میں لکھنے پر مجبور کرتی ہے۔

اس سلسلے میں گفتگو کرتے ہوئے انھوں نے کہا کہ اہم بات یہ ہے کہ ہم فنکار کے فن کو دنیا کی اور چیزوں سے تقابل کرتے ہوئے دیکھتے ہیں حالانکہ ایسا نہیں ہونا چاہیئے فن کو فنکار کی تخلیق سمجھ کر دیکھنا چاہیئے اور بس۔

بات شخصیت کی بھی ہو رہی تھی ڈاکٹر صاحب کے نزدیک گویا شخصیت کی ایسی اہمیت نہیں۔ وہ کہنے لگے " ادب میں مصنف جو چیز لکھ دیتا ہے وہ عموماً اُس کی شخصیت سے جداگانہ ہوتی ہے۔ فن پارے کو فنکار کی شخصیت سے رجوع کرنا اور اس کی شخصیت کے آئینہ میں دیکھنا کچھ غیر ضروری سی بات ہے اور سچ پوچھیے تو شخصیت کا سمجھنا کیا ضروری ہے۔ ادب کو ویسے شخصیت کے بغیر بھی سمجھا جا سکتا ہے۔ ادب کو ادب کی حیثیت سے دیکھا جائے ادب کے اپنے معیارات ہیں، ان معیارات کی روشنی میں اس کو جانچا جائے۔ اسی طرح ادب کا سماجی اسکول ہوتا ہے اور یہ ادب کے ہر فن پارے کو اس کے سماجی تناظر میں دیکھتے اور اس کی سماجی تعبیر ڈھونڈتے ہیں۔ یہ چیز غلط ہے اچھے باپ کے بُرے بیٹے بھی ہو سکتے ہیں اور ہوتے ہیں اسی طرح بُرے باپ کے اچھے بیٹے بھی ہو سکتے ہیں اور ہوتے ہیں بہر کیف ادب، ادب ہوتا ہے اس کا اسی زاویہ سے جائزہ لینے کی ضرورت ہے۔

رشید صاحب کے طرز تحریر کے بارے میں بعض تنقید نگاروں کا کہنا ہے کہ وہ غیر مربوط ہے اس بارے

میں اظہار خیال کرتے ہوئے ڈاکٹر صاحب نے کہا کہ کسی مصنف کا ہم ان بنیادوں پر تجزیہ کیوں کریں کہ وہ کس طرح لکھتا ہے اور اس کا طرز تحریر اسے عجیب ہے یا اس میں عیب۔ کیونکہ مصنف یا کسی اور فنکار کے لیے دوسروں کی تقلید کرنا کوئی اچھی بات نہیں مصنف کا طرز تحریر اس کا اپنا ہو۔ چاہیئے مصنف کی خوبی یہ ہے کہ وہ وہ ہو اوروں کی طرح نہ ہو بلکہ صاحب اسلوب کی پہچان یہ ہے کہ وہ اپنی طرح لکھتا ہے، وہ جو کسی اور کی طرح لکھتا ہے، اچھا نہیں لکھتا۔

اپنے ہال میں دیوار سے آویزاں ماڈرن آرٹ کی ایک تصویر کی طرف اشارہ کرتے ہوئے انھوں نے مجھ سے پوچھا، "یہ تصویر آپ کی سمجھ میں آتی ہے؟" میں نے کہا "یہ تصویر تو سمجھ میں نہیں آتی۔" تب وہ کہنے لگے "یہ ہندوستان کے ایک بہت بڑے آرٹسٹ کی تصویر ہے۔ اس آرٹسٹ کی مقبولیت کا سبب یہی ہے کہ وہ چغتائی کی طرح تصویر نہیں بناتا ہے اور نہ کسی اور نامور مصور کی تقلید کرتا ہے بلکہ اس آرٹسٹ کا فن اچھوتا اور اُس کا اپنا ہے۔ اسی طرح ہر مصنف کی اپنی طرز ادا ہوتی ہے۔ یوں بھی حکومت نے طرز ادا کے تعلق سے کوئی قانون تو منظور نہیں کیا ہے کہ ایسے لکھو اور ایسے نہ لکھو۔ وہ نقاد جو مصنف سے ان خاص باتوں کا مطالبہ کرتے ہیں وہ عجیب و غریب ہیں۔ نقاد کی سب سے بڑی غلطی تو یہ ہے کہ وہ سمجھتا ہے کہ وہ سب کچھ جانتا ہے۔ وہ سمجھتا ہے اس کے پاس ہر معیار موجود ہے لیکن سوال یہ ہے کہ آخر نقادوں کا اپنا معیار کیا ہے" ادب و تنقید کے بارے میں ڈاکٹر صاحب نے اظہار خیال کیا کہ یوں تو تنقید بہت لگ بھگ ہوتی ہے کہیں تو دستاری کی جاتی ہے اور کہیں بلاوجہ مخالفت اور مذمت۔ ڈاکٹر صاحب زندہ آدمی پر لکھنا علمی تحقیق کے لیے مناسب خیال نہیں کرتے تھے۔ اُن کے نزدیک ادب کی تحریر کے بعد جب تک ایک طویل عرصہ نہ گزر جائے وہ پڑھنے کے قابل نہیں ہوتا اور لوگ اب تو ادیب کو مرنے بھی نہیں دیتے اور اس کو اپنی تحقیق اور تنقید کا عنوان بنا دیتے ہیں۔ واقعہ یہ ہے کہ کسی زمانے میں جو ادب اچھا ہوتا ہے اور زمانے کی واہ واہ حاصل کرتا ہے دس سال گزر جانے کے بعد اس کو کوئی پڑھتا بھی نہیں۔ اس لیے چاہیئے تو یہی کہ ادب اور ادیب کو فوراً تحقیق اور تنقید کا موضوع نہ بنایا جائے۔

رشید صاحب کے بارے میں ڈاکٹر صاحب کے خیالات بڑے ہی سیدھے سادے تھے۔ ذاکر صاحب تعلیمی زندگی میں رشید صاحب سے دو سال آگے تھے۔ ڈاکٹر صاحب نے علی گڑھ میں بحیثیت طالب علم ۱۹۱۳ء میں داخلہ لیا اور رشید صاحب نے ۱۹۱۵ء میں۔ لیکن ان دونوں میں دوستی انتہائی گہری اور پرخلوص تھی، اوروں کے لیے باعث رشک۔ تعلیمی زندگی کے بعد جب دونوں نے مختلف شعبوں کو منتخب کیا، اُس کے بعد مرتے دم تک دونوں کی دوستی میں فرق نہیں آیا۔ وہی اپنائیت، وہی بے تکلفی۔ ڈاکٹر صاحب رشید صاحب کو اپنا بہترین اور نہایت ہی عزیز دوست خیال کرتے تھے۔ اُن کا خیال تھا کہ اگر کسی کو ایسا دوست مل جائے جیسے کہ رشید صاحب تھے تو اُس شخص کو دوستوں کے معاملے میں مطمئن ہو جانا چاہیے

وہ رشید صاحب کے خلوص و محبت کے بے پناہ قائل تھے۔ وہ رشید صاحب کو ایک بلند پایا مصنف قرار دیتے تھے لیکن ان کی نظروں میں رشید صاحب مصنف کی بہ نسبت معلم کی حیثیت سے زیادہ بلند تھے۔ انھوں نے کہا تھا کہ رشید صاحب نے کتنے ہی لوگوں کو لکھنے کا شوق دلایا اور کتنے ایک کے ذوق سلیم کی تربیت کی کہ اس کا احسان اردو ادب پر ان کی تصانیف سے زیادہ ہے۔ انھوں نے کہا کہ علی گڑھ میں ایک عرصہ تک اردو زبان کو اہمیت نہیں دی جاتی تھی۔ اس کی کوشش کی جاتی تھی کہ اردو فارسی کا محدود رہے لیکن رشید صاحب کی وجہ سے علی گڑھ میں اردو کی حیثیت بن گئی

ذاکر صاحب، غیر معمولی جاذب توجہ، گمبھیر اور پر اثر شخصیت کے مالک تھے میں نے ان کے انداز گفتگو میں اُن کے عہدے اور منصب کا جاہ و جلال نہیں، اُن کی شخصیت کا تدبر پایا وہ بات اس طرح کرتے گویا لفظ لفظ، تول تول کر ادا کر رہے ہیں۔ ذرہ اعظم ہر دو کے بیکہ میں نمایاں چیز اُن کی شیروانی کے بٹن میں لگا گلاب تھا۔ ذاکر صاحب کے سراپا میں بھی آپ کو ایک ایسی چیز ملتی ہے، اُن کا چشمہ۔ وہ خاموش بھی رہیں، اُن کے ہلکے سیاہ رنگ کے اس چشمے کے پیچھے سے اُن کی آنکھیں بہت کچھ کہتی نظر آتیں۔ اپنے بارے میں، مخاطب کے بارے میں اور ــــ ایک جہاں کے بارے میں۔

●●

ڈاکٹر صاحب ان کے تمام واقعات میں ایک ناموس تھا مانی تھے کہ وہ دینا ہوتی ہے۔ لیکن جب یوسف صاحب کا اصرار بڑھا تو ایک دم سے سنبھل کر بیٹھتے ہوئے یوسف صاحب کو مخاطب کر کے بولے "کیا بکتے ہو یوسف! کیا بکتے ہو؟ تمھیں تو ہمیں اتنی عرصے میں معلوم ہو چکا تم اس ذات قدیر کے متعلق ایسا سوال کر رہے ہو جس کا ہر دن ہی مخلوق اور ذات خلقت نفسی علم کرتے ہیں۔ دل میں تم آخر کس طرح بار دور رہا ہو۔" اس کے بعد یوسف صاحب ایسے چپ ہو گئے جیسے ان پر بجلی گر گئی ہو۔ وہ کچھ دیر تک خاموش رہے۔ تب ڈاکٹر صاحب اٹھ کر چلے تو میں نے انھیں روک لیا کیونکہ مجھے احساس تھا کہ گفتگو کے دوران میرے منہ سے کچھ ایسے جملے نکل گئے تھے جو نہ مجھے کہنا چاہیئے تھے اور میں نے عرض کی "خدا کے واسطے ڈاکٹر صاحب مجھے معاف کر دیجیے" فرمایا "بھئی میں ناراض ہوں تم سے آج بہت کچھ سیکھا"۔ ایسا لگتا تھا کہ میرے پاؤں کے نیچے سے زمین کھسک گئی۔ میں نے سمجھا کہ ڈاکٹر صاحب واقعی مجھ سے بہت ناراض ہیں۔ میں نے … ان تک اپنے ہاتھ جوڑ دیے اور عرض کیا "ڈاکٹر صاحب خدا کے واسطے مجھے معاف کر دیجیے میں بھلا آپ کو کیا سکھا سکتا ہوں۔ میں آپ کے سامنے ایک بچہ ہوں بھلا آپ کو کیا سکھا سکتا ہوں"۔ ارشاد ہوا "میں خدا کی قسم اس وقت مذاق نہیں کر رہا ہوں۔ پہلے اس بات کا اعادہ کرو۔ میں نے تم سے بہت کچھ سیکھا"۔ ڈاکٹر صاحب کبھی جھوٹ نہیں بولتے تھے۔ اس لیے میں محو ہو گیا اور میں آج تک یہ سمجھنے سے قاصر ہوں کہ ڈاکٹر صاحب نے مجھ سے کیا سیکھا۔

ڈاکٹر صاحب جب … تھا رات دن … کے قریب کمرے میں بیٹھے رہتے تھے۔ اسی قیام کے دوران ایک دن میں نے ان کے … شفیق سے پوچھا کہ "بھئی تمھارے میاں زیادہ تر بیٹھے رہتے ہیں آخر آدمی ہیں ان کی حاجت کیسے پوری ہو جاتی ہیں۔" شفیق مرحوم نے جو جواب دیا وہ یہ تھا "نہیں بہت سویرے آنکھیں کھول دیتے ہیں … تیار ہو جاتے ہیں۔" کہا "نواب صاحب! آپ کو شاید نہیں معلوم کہ میاں تہجد کے لیے اٹھیں گے اور چپ رہ سوئیں گے۔" تھے ڈاکٹر صاحب وہ عبادت بھی ایسے چھپ کے کرتے تھے کہ ہمیں … کر پانا بھی میسر نہیں۔

جب ڈاکٹر صاحب نائب صدر منتخب ہوئے تو … اسلامیہ کالج میں ان کو مدعو کیا گیا۔ میں بھی وہاں کالج کی مجلس عاملہ کے ایک رکن کی حیثیت سے موجود تھا۔ عصرانہ میں ملاقات ہوئی میں نے عرض کی "ڈاکٹر صاحب میرا پاسپورٹ ختم ہو چکا ہے۔ نیا پاسپورٹ بنواؤں گا تو آپ کا نام بحیثیت ضامن کے دینا چاہتا ہوں اگر اجازت ہو۔" فرمایا "مجھے کوئی عذر نہیں"۔ اس بات کو کئی سال گزر گئے۔ اوائل ۱۹۶۳ء میں جب ایک اور سلسلہ میں ڈاکٹر صاحب سے ملاقات ہوئی تو میں نے پاسپورٹ والی بات یاد دلائی۔ دریافت فرمایا "آپ نے درخواست دی؟" میں نے عرض کیا "جی نہیں ابھی درخواست نہیں دی"۔ ارشاد ہوا "بجا ہے آپ درخواست مت دیجیے اور دو سال بعد پھر پوچھیے گا کہ ڈاکٹر صاحب

آپ نے میرا کام نہیں کیا۔ میں نے عرض کیا ڈاکٹر صاحب میں آپ کا نام اس لیے دینا چاہتا ہوں کہ مجھے Foreign Exch-ange زرمبادلہ لینے میں آسانی ہو جائے گی۔ فرمایا "اس مغالطہ میں بھی نہ رہیے گا۔ میری وجہ سے آپ کو ایسی کوئی آسانی ملنے والی نہیں"۔

ذاکر صاحب کی طبیعت میں کتنی ظرافت تھی اس کا اندازہ اس واقعہ سے بخوبی کیا جا سکتا ہے۔ میں ایک دن دہلی گیا ہوا تھا، وہاں میری موٹر کا غلط پارکنگ کرنے پر چالان کر دیا گیا۔ میں پریشان ہو گیا اور سیدھا ڈاکٹر صاحب کے یہاں پہنچ گیا۔ اس وقت وہ وہاں تشریف نہ رکھتے تھے اسحق باہر نکل آئے مجھے اندر لے گئے۔ کچھ دیر بعد ڈاکٹر صاحب تشریف لائے۔ میرے پہنچنے کی علت غائی دریافت فرمائی۔ میں نے مدعا عرض کیا۔ بڑی رکھائی سے فرمایا "میں کچھ نہیں کر سکتا"۔ مجھے بُرا لگا اور میں نے عرض کیا "تو پھر مجھے اجازت دیجئے میں کہیں اور دیکھوں" بڑی متانت سے فرمایا "اب رات ہو گئی ہے اب کہاں جائیے گا۔ اب آپ کل سویرے سے پہلے کہیں نہیں جا سکتے۔ جائیے آپ کے لیے کمرہ تیار کرا دیا گیا ہے آرام فرمائیے"۔ باہر نکلا دیکھا موٹر غائب۔ اسحق سے معلوم کیا انھوں نے بتایا کہ "میاں نے آتے ہی پوچھا کہ یہ موٹر کس کی ہے میں نے پوری بات بتائی تو پائلٹ سے دریافت کیا "تم کچھ کر سکتے ہو؟" اس نے کہا اگر آپ حکم دیں تو ابھی سب ہو جائے گا۔ میاں نے پائلٹ کو کار کے ساتھ روانہ کر دیا"۔

یعنی ذاکر صاحب میرا کام کرانے کا پورا انتظام فرما چکے تھے اور مجھے یہ تاثر دیا کہ وہ کچھ نہیں کر سکتے (اسی ملاقات کے دوران پاسپورٹ والی بات بھی ہوئی تھی)۔

ذاکر صاحب جب کسی کے خلاف رائے دیتے تو ان کا طریقہ بالعموم ایسا ہوتا "میاں شاید یہ میرے نفس کا خبث ہے لیکن وہ صاحب مجھے کبھی نہ بھائے"۔

۱۹۵۸ء میں جب مولانا آزاد کا انتقال ہوا تو علی گڑھ میں عام خیال یہ تھا کہ وزیر تعلیم کی جگہ کو پُر کرنے کے لیے ذاکر صاحب سے زیادہ موزوں کوئی اور نہیں ہو سکتا۔ اس کے بعد علی گڑھ ہی میں یہ افواہ بھی اڑی کہ ذاکر صاحب نے اپنی گرتی ہوئی تندرستی کی بنا پر یہ ذمہ داری سنبھالنے سے انکار کر دیا ہے۔

جب ذاکر صاحب علی گڑھ تشریف لائے اور ازراہ کرم منزل منزل بھی آئے تو میں نے گفتگو کے دوران عرض کیا "ذاکر صاحب آپ نے یہ کیا غضب کیا کہ تندرستی کی وجہ سے وزارت تعلیم کی ذمہ داری سنبھالنے سے انکار کر دیا"۔ مسکرائے اور ایک وزیر باتدبیر کا نام لیکر فرمایا "میاں یہ صاحب سلامت مجھ غریب کو کون پوچھتا ہے"۔ اس سے یہ بھی ظاہر ہوتا ہے کہ افواہیں کیسے پھیلتی ہیں اور کیسے سچ کا جامہ پہن کر لوگوں کے ذہنوں میں جڑ پکڑ لیتی ہیں۔ ایک اور بات

جو عام طور پر غلط منسوب ہے، وہ ہے نواب اسمٰعیل خاں صاحب مرحوم اور ڈاکٹر صاحب مرحوم کا مبینہ اختلاف۔ میں نے پیشی کی حاضری کے دوران اس کی تصدیق ڈاکٹر صاحب سے چاہی۔ انھوں نے فرمایا "محض یہ تو بالکل غلط ہے، ہم دونوں ہمیشہ ایک دوسرے کے بہت قریب رہے اور سچ پوچھیے تو ۱۹۴۵-۴۶ میں ہمارا گروپ نواب اسمٰعیل صاحب کو یونیورسٹی چانسلر بنانا چاہتا تھا اور موصوف کو اس کے لیے تیار بھی کر لیا تھا۔ ہم لوگ اتفاق سے اس وقت اکثریت میں تھے۔ اگلے دن E C کی میٹنگ میں جب نواب صاحب کا نام تجویز کیا گیا تو [illegible]۔ بعد میں پوچھنے پر انھوں نے بتایا کہ کل ایک صاحب میرے پاس پہنچے اور کہا اگر آپ مجھے Treasurer بنا دیں تو میرے خاندان کے سب Votes آپ کو ملیں گے۔ مجھے یہ سودا بالکل پسند نہیں اس لیے میں نے انکار کر دیا۔ پھر نواب یوسف آ گئے اور بریانی ور ردے کا دور چلا پڑا اور ہم لوگ اقلیت میں رہ گئے۔ مجھے علی گڑھ چھوڑنے جانے کا سہرا نواب صاحب موصوف ہی کے سر ہے اس لیے کہ مولانا آزاد کے پیہم اصرار پر میں نے یہ شرط لگا دی تھی کہ میں علی گڑھ اسی صورت میں چھوڑوں گا جب نواب اسمٰعیل خاں صاحب خود مجھ سے وہاں جانے کے لیے کہیں۔ چنانچہ ایک دن جب مولانا آزاد کا طلب کردہ میں ان کے وہاں پہنچا تو دیکھا کہ نواب صاحب وہاں تشریف رکھتے ہیں۔ موصوف نے مجھ سے فرمایا کہ "ڈاکٹر صاحب یونیورسٹی کو آپ ہی سنبھالیے، اب مجھ سے نہیں سنبھلتی"۔ میرے پاس سوائے رضامندی دینے کے اب اور کوئی چارہ کار نہ تھا۔"

ڈاکٹر صاحب کی ایک ادا تو کبھی نہ بھولے گی، یہ تھی کہ اپنے ملنے آنے والے کو بالعموم اپنے پورٹیکو تک رخصت کرنے تشریف لے جاتے خواہ کوئی بھی ہو۔ میرے کارندے نے خود مجھ سے بیان کیا کہ وہ جب ڈاکٹر صاحب کے پاس دلی گئے تو موصوف انھیں چھوڑنے کے لیے بھی باہر تشریف لائے۔ علی گڑھ میں ایسا کرنے پر ایک آدھ بار جب میں نے عرض کیا کہ "آپ تشریف رکھیں" تو جواباً فرمایا "ارے بھائی میں اپنے پودوں کو دیکھنے جا رہا ہوں، کیا آپ اس کی بھی مجھے اجازت نہیں دیں گے"۔ ظاہر ہے یہ کوئی دکھاوا تو ہوتا نہ تھا اگر لوگ پھر بھی ڈاکٹر صاحب کے اخلاق کی وسعت کے معترف نہ ہوں تو اعتراف نہ کرنے والوں کا اللہ بھلا کرے۔

ڈاکٹر صاحب اپنے گورنر بنائے جانے سے زیادہ خوش نہ تھے۔ یہ بات ان کے اس خط سے مترشح ہے:

".. معلوم نہیں آپ کو میرا حال معلوم ہے یا نہیں۔ دو مہینے سے یہاں بھیج دیا گیا ہوں۔ میں اور گورنری! ایک بے جوڑ سی بات ہے۔ نہ اس کی کوئی اہلیت تھی، نہ ایسے کام کے لیے اپنے کو تیار کیا تھا۔ بہر حال خدمت کا ایک موقع جان کر اسے اپنے سر لے لیا۔ خدا کرے کہ اس کام کا حق ادا کر سکوں۔ ۱؎"

ڈاکٹر صاحب تقریر کرتے تھے کہ جادو جگاتے تھے۔ مجھے یاد ہے کہ ایک مرتبہ کسی موقع پر تقریر کرتے ہوئے

مسلم یونیورسٹی کی مالی مشکلات کا ذکر کرتے ہوئے مہمان خصوصی کو مخاطب کر کے فرمایا "ہم پر بھی وقت پڑا تھا لیکن گذر گیا۔ وقت کی سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ گذر جاتا ہے۔"

غالباً ۱۹۵۶ء کا واقعہ ہے ڈاکٹر صاحب حکیم عبداللطیف صاحب کی صاحب زادی کی شادی میں علی گڑھ تشریف لائے۔ کھانے کے بعد طارم خاص، سخن کی اہمیت کا ذکر نکل آیا۔ فرمانے لگے "بھئی میرا تعصب تھا کہ ڈاکٹر ضیاء الدین کو بڑا آدمی سمجھتا تھا۔ کسی بڑے آدمی کے پاس رہ کر آدمی اتنا اچھا نہیں ہو سکتا۔" اسی نشست میں میں نے ڈاکٹر صاحب سے پوچھا "ڈاکٹر صاحب جب کوئی باہر جائے تو کھانے کے سلسلے میں کیا کرے" فرمایا "ارے میاں سب کچھ کھائے تحقیقات کم کرے۔"

جب ۱۹۵۷ء میں ان کو زیدی صاحب نے اعزازی ڈگری دینے کے لیے علی گڑھ بلایا تو جو تقریر انھوں نے کی وہ لفظاً لفظاً تو یاد نہیں لیکن اس کا انداز کچھ ایسا تھا کہ آج بھی سوچتا ہوں تو آنکھوں میں آنسو آجاتے ہیں۔ جب تقریر کا آغاز فرمایا تو یہ مصرعہ پڑھا تھا "من بہ بوئے مست و ساقی پردہ بر میخانہ زد" شعر اس طرح پڑھتے تھے کہ معلوم ہوتا تھا کہ شاید گویا یہ شعر اسی موقع کے لیے کہا ہے۔ اسی تقریر کے دوران اپنے دور طالب علمی کے آغاز کے ایک واقعہ کا ذکر کرتے ہوئے ملک قمی کا یہ شعر پڑھا تھا

رفتم کہ خار از پا کشم محمل نہاں شد از نظر — یک لحظہ غافل گشتم و صد سالہ راہم دور شد

غالباً ۱۹۵۸ء ہی میں وہ بحیثیت گورنر بہار کے گورنر یو۔پی۔ وی۔ وی۔ گری صاحب کی دعوت پر نینی تال تشریف لائے۔ میں نے ملنے کا وقت مانگا جو مل گیا۔ لیکن اپنی پرانی ادا کے تحت آخر وقت میں اطلاع کرائی کہ خود تشریف لا رہے ہیں۔ یہی ۱۹۵۶ء میں علی گڑھ میں کیا تھا۔ بہرحال میں ان کی پذیرائی کے لیے تیار ہو گیا۔ تشریف لائے، فوراً فرمایا "میاں تمھارے یہاں یہ Bulbs کے پھول بہت خوبصورت ہیں ہمیں مل جائیں گے" میں نے عرض کیا "انشاءاللہ پیش کر دوں گا"۔ میں اس کے Bulbs اپنے ساتھ لیتا گیا اور اگلے سال کے شروع میں جب وہ علیگڑھ تشریف لائے تو یہ Bulbs ان کے ساتھ کر دیئے بہت محظوظ ہوئے اور موٹر میں اپنے ساتھ رکھا لیے۔

پٹنہ کے دوران قیام ہی علامہ اقبال سے متعلق ایک دلچسپ واقعہ سنایا۔ کہنے لگے "جب علامہ کی پہلی فارسی کتاب 'اسرار خودی و رموز بے خودی' شائع ہو چکی تھی تو میں نے ان سے کہا کہ آپ جامعہ تشریف لے آئیے"۔ اس پر علامہ نے جواب دیا کہ "میں وہاں پڑھاؤں گا کیا؟" میں نے کہا "کچھ اور نہ سہی اپنی کتاب 'اسرار بے خودی و رموز بے خودی' ہی پڑھا دیجیے"۔ اس پر انھوں نے جواب دیا "شاعر کی اس سے بڑی بدنصیبی نہیں ہو سکتی کہ وہ اپنا کلام خود پڑھائے"۔

ایک دن پوچھ بیٹھے "تمہارے پاس روپیہ کتنا ہے؟" میں نے جواب دیا کہ "کہاں ڈاکٹر صاحب تھوڑا سا ہے اور وہ بھی Victory Bonds کی شکل میں جو ۱۹۸۶ء میں Mature ہوں گے"۔ دریافت فرمایا "سال میں کتنا Interest ملتا ہے"۔ میں نے جواب دیا کہ "ڈاکٹر صاحب بہت تھوڑا۔ Income Tax وغیرہ کاٹنے کے بعد تین ہزار روپیہ تک بنتے ہیں"۔ حکم دیا "Bonds بیچ ڈالو"۔ میں نے کہا "ڈاکٹر صاحب دیوالہ نکل جائے گا اس لیے کہ بازار میں اس وقت ۷۲ روپیہ کا بھاؤ ہے"۔ اصرار فرما کر کہنے لگے "بھئی بیچ ڈالو اور Companies میں Shares خرید لو"۔ میں نے حکم کی تعمیل کی۔ اور علی گڑھ پہنچتے ہی پہلا کام یہ کیا کہ انھیں فروخت کر دیا۔ کا عدد یہ =/ ۷۵، روپیہ کا خسارہ ہوا لیکن یہ خسارہ دو ہی چار سال میں پورا بھی ہوگیا۔ معلوم کتنے قرضوں سے نجات مل گئی اور سود کی لعنت سے بھی چھٹکارا ملا۔ [illegible] صاحب نے ساتھ اور کئے تھے۔ اب [illegible] ایسے بزرگ پیدا ہیں اور نہ ہی ڈاکٹر صاحب جیسے اصلاح کار [illegible] رہ گئے۔ مجھے اس وقت تک یہ معلوم تھا کہ ڈاکٹر صاحب [illegible] (ـــــ) [illegible] ہیں۔ اگر میں اپنے اس تمثیل کی [illegible] اقبال کے اس استعارے کو [illegible]

[illegible]   عقل ہے محو تماشائے لب بام ابھی

[illegible]   عشق [illegible]

یہ سب ہمیں حال ہے کوئی ہندوستانی نہیں۔

ان کی سادگی اور دل داری کے ضمن میں ایک چھوٹے سے واقعہ کا ذکر بیان بے محل نہ ہوگا۔ ایک مرتبہ Convocation کے اختتام کے بعد وائس چانسلر کی کار مہمانوں کو چھوڑنے اسٹیشن چلی گئی۔ ڈاکٹر صاحب سواری کے انتظار میں ٹہل رہے تھے۔ میری موٹر موجود تھی۔ میں نے عرض کیا "تشریف لائیے"۔ بیٹھنے لگے تو آگے ملازم کے برابر بیٹھے۔ عرض کیا "پیچھے آئیے"۔ کہنے لگے "میاں یہیں ٹھیک ہوں"۔ عرض کیا "آپ کی اس جمہوریت پسندی نے مارا"۔ مسکرا دیے لیکن آگے ہی بیٹھے رہے ملازم کے پاس۔

مئی ۱۹۶۹ء میں جس دن ڈاکٹر صاحب کا انتقال ہوا، دوپہر کے کھانے پر میری اہلیہ نے مجھ سے کہا "تم بہت دن سے ڈاکٹر صاحب سے ملنے نہیں گئے"۔ میں نے جواب دیا کہ "اب انشاءاللہ ان سے جب ہی ملوں گا جب وہ صدر نہیں رہیں گے"۔ کھانے کے کچھ ہی دیر بعد ملازم نے اطلاع دی کہ وائس چانسلر لاج سے اطلاع آئی ہے کہ ڈاکٹر صاحب کا انتقال ہوگیا۔ یہ میری عجیب بدنصیبی ہے کہ میں اپنے غم کا اظہار عام لوگوں کی طرح نہیں کر پاتا۔ نہ آنسو ہی نکلتے ہیں اور نہ دل ہی ساتھ دیتا ہے۔ یہ ظاہری طور پر سوگ نہیں منایا تا اہل دنیا شاید یہ سمجھتے ہیں کہ میں بڑا شقی القلب

ہوں۔ سوائے ان کے جو دل کا حال جان سکتے۔ حقیقت یہ ہے کہ ڈاکٹر صاحب کا انتقال کیا ہوا گویا میری ہی موت واقع ہوگئی۔ یہ ایک حقیقت ہے کہ اس سال میں ایسا بیمار پڑا کہ بارہ جمعہ صاحب فراش رہا۔ مجھے صحیح معنوں میں دق ہوگئی تھی۔ کسے معلوم ہے بڑی کمی تھی جو میرے دل میں تھا لگ کر دیکھا۔ میرے ہمدردوں کا پتہ لگانے کی کوشش کرتا۔

سچ تو یہ ہے کہ ڈاکٹر صاحب مرحوم کا پورا کا پورا مقام حافظ کے اس شعر کی تفسیر ہے ؎

گویند سنگ لعل شود در مقام صبر
آرے شود ولیک بخون جگر شود

پروفیسر محمد شبیر خاں (پیدائش ۱۹۲۳ء)
۱۹۴۰ء میں علیگڑھ مسلم یونیورسٹی سے علم سیاسیات
میں ایم اے کیا اور ۱۹۴۹ء میں بحیثیت لکچرر سیاسیات
سے منسلک ہو گئے۔ امریکا کی تعلیمی فاؤنڈیشن
کی اسکالرشپ پر اعلیٰ تعلیم کے لیے امریکا گئے
پھر علیگڑھ میں پروفیسر صدر شعبۂ سیاسیات
اور ڈین فیکلٹی آف آرٹس کے عہدوں پر کام
کیا۔ ۱۹۵۹ء میں شکاگو یونیورسٹی اور ۱۹۶۰ء میں
ہیڈل برگ یونیورسٹی (جرمنی) کے وزیٹنگ
پروفیسر ہوئے۔ ۱۹۶۷ء میں ممتاز وزیٹنگ
اسکالر کی حیثیت سے امریکا کی مختلف
یونیورسٹیوں میں لکچر دیے۔ اسٹیٹ بینک
آف انڈیا اور لائف انشورنس کارپوریشن کے
سنٹرل بورڈ آف ڈائرکٹرس کے ممبر رہے۔
۱۹۸۲ء میں ریٹائر ہو کر علی گڑھ ہی میں مقیم
ہیں ایل این مشرا انسٹی ٹیوٹ آف
اکنامک ڈیولپمنٹ پٹنہ کے اعزازی پروفیسر ہیں

پروفیسر محمد شبیر خاں
علیگڑھ

پروفیسر محمد شبیر خاں امریکا میں ڈاکٹر ذاکر حسین کے ساتھ

میں چونکہ ڈاکٹر صاحب کا بہت عقیدت مند ہوں اور مجھے یقین ہے کہ میری طرح اور لوگ بھی متعدد تعداد میں ان کے عقیدت مند ہوں گے لہذا ان سے درخواست کرنا ضروری سمجھتا ہوں کہ ہرچند کہ ڈاکٹر صاحب میرے لئے ایک آئیڈیل تھے اور ہیں لیکن وہ بھی ایک انسان تھے اور اگر میرے مضمون میں کسی صاحب یا صاحبہ کو ڈاکٹر صاحب کی شخصیت میں کوئی کمزوری نظر آئے تو وہ مجھے معاف کردیں اس بنا پر کہ ہوسکتا ہے کہ میں نے ان کو سمجھنے میں غلطی کی ہو یا ان کی اگر کوئی کمزوری ہو بھی تو اس کو بشری فطرت کا تقاضا سمجھا جائے بجائے اس کے کہ میرے اس مضمون کو وہاں توجہ کر ان کے اندر کوئی کمزوری تلاش کرنے کی کوشش پر محمول کیا جائے اس لئے کہ میں ایسے محسن اور بزرگ کے متعلق کچھ کرسکتا ہوں نہ کرنے کی جرأت ہے۔

مضمون کی ابتدا سے پہلے میں یہ عرض کردوں کہ میں اس بات میں یقین کرتا ہوں کہ انسان کی شخصیت اس کی زندگی کی چھوٹی چھوٹی باتوں سے زیادہ بہتر طور پر سمجھی جاسکتی ہے۔ بجائے اس کے کہ اس کے بڑے بڑے کاموں پر زور دیا جائے۔ بڑی باتوں میں تو اکثر لوگ جو سطحی شخصیت کے ہوتے ہیں وہ بھی بڑے نظر آتے ہیں۔ ان چیزوں سے کسی کی بڑائی کا صحیح جائزہ نہیں لیا جاسکتا۔ اس لئے یہاں میں ڈاکٹر صاحب کے متعلق چھوٹی چھوٹی باتوں پر زیادہ دھیان دوں گا۔ اگر کوئی صاحب یا صاحبہ میری اس رائے سے اختلاف رکھتے ہوں تو ان سے معذرت خواہ ہوں۔

ڈاکٹر صاحب سے میری ملاقات بالکل عجیب طریقے سے ہوئی۔ ۱۹۴۶ء میں مسلم یونیورسٹی ایک بہت ہی خلفشار کے دور سے گذر رہی تھی اس لئے کہ ملک کی آزادی سے قبل یہاں پر زیادہ تر اساتذہ اور طلباء مسلم لیگ کے ساتھ تھے اور پاکستان بنوانے کے لئے کوشش کر رہے تھے۔ میں ۱۹۴۲ء سے ۱۹۴۷ء تک یونیورسٹی کا طالب علم رہا تھا جس سال میں نے معاشیات میں ایم۔اے پاس کیا یعنی ۱۹۴۷ء اس سال تو ایک کھلبلی مچ گئی اس لئے کہ ملک کے آزاد اور خاص طور سے بٹوارہ ہوتے ہی ملک کے زیادہ تر حصوں میں خاص طور سے جن کا تعلق پاکستان سے یا وہاں کی قربت کی وجہ سے زیادہ تھا یا جہاں پر پاکستانی خیالات کے لوگ زیادہ تھے وہاں کے مسلمانوں سے ملک کے

زیادہ تر لوگوں کا اعتماد اٹھ گیا۔ اس کا اثر علی گڑھ میں واضح طور سے دکھائی دے رہا تھا۔ اور یہاں کے اکثر لوگ پاکستان جا رہے تھے جو لوگ باقی رہے تھے چاہے اپنے خیالات سے اور اپنے دل سے ہندوستان کو اپنا صحیح ملک سمجھتے تھے لیکن ان کے دلوں میں بھی بہت دہشت تھی اس لئے کہ ملک کے اکثر باشندے یہاں کے ہر آدمی کو ناقابل اعتماد سمجھتے تھے۔ اس زمانہ میں شعبہ معاشیات کے کئی اساتذہ دوسرے شعبہ کے اساتذہ کے مانند پاکستان جا چکے تھے یا جا رہے تھے۔ سید حمید الدین صاحب مرحوم جن کا ہندوستان میں رہنے کا مکمل ارادہ تھا باوجود اس کے کہ ان کے خاندان کے اکثر لوگ جو دلی میں رہتے تھے ملک کا بٹوارہ ہوتے ہی پاکستان جا چکے تھے شعبہ معاشیات کی قیادت کر رہے تھے۔ وہ عارضی ریڈر اور عارضی صدر شعبہ تھے۔ میں ایم۔اے پاس کرنے کے بعد شاہجہاں پور کے اسلامیہ انٹر کالج میں جو اب گاندھی فیض عام ڈگری کالج کہلاتا ہے۔ مستقل طور پر ملازم ہو گیا تھا۔ سید صاحب نے اکتوبر کی ابتدا میں مجھ کو لکھ کر بھیجا کہ میں تم کو اس لائق سمجھتا ہوں کہ تم اس شعبہ میں کام کر سکو لیکن میرے اختیار میں صرف یہ ہے کہ تمہارے لئے عارضی طور پر جونیر لکچرر کے عہدہ پر چھ مہینہ کی سفارش کر سکتا ہوں۔ اور میری سفارش پر غالبًا تمہارا تقرر بھی ہو جائے گا لیکن اس دوران میں اس عہدہ کی اشتہارات میں تشہیر کی جائے گی اور چھ مہینہ کے اندر اندر سلکشن کمیٹی ہوگی اس میں تمہارا تقرر ہونا یا نہ ہونا صرف تمہاری قابلیت اور استعداد کے تحت ہوگا۔ اس کے لئے میں وعدہ نہیں کر سکتا۔ سید صاحب میرے استاد رہ چکے تھے اور میں جانتا تھا انتہائی ایماندار اور دیندار آدمی تھے۔ لہٰذا جب انہوں نے یہ بات لکھی تو میں نے اس کو اسی اسپرٹ میں سمجھا۔ اور باوجود اس کے کہ ایسا کرنے میں میرے لئے بڑے خطرہ کی گنجائش ہو سکتی تھی (اس لئے کہ مستقل تقرر کو چھوڑ کر عارضی تقرر پر اس امید پر آنا کہ وہ مستقل ہو سکتا ہے کافی خطرناک بات ہے) میں راضی ہو گیا انہوں نے میری سفارش لکھ کر بھیج دی اور ان کے لکھنے پر میرا تقرر بھی ہو گیا۔

اس کے دوسرے دن ایک صاحب جن کا نام ابوسالم صاحب تھا دلی سے تشریف لائے۔ وہ اس یونیورسٹی کے پرانے طالب علم تھے اور مجھ سے چار سال پہلے معاشیات میں ایم۔اے پاس کر چکے تھے اور معاشیات کے ایک ہفتہ وار جریدہ میں کام کرتے تھے۔ قابلیت میں وہ یقینًا مجھ سے زیادہ تھے اور آج بھی ہیں ڈاکر صاحب کی سفارش کا ایک خط سید حمید الدین صاحب کے نام لے کر آئے اور یہ سفارش اسی عہدہ کے لئے تھی جس پر سید صاحب میرے لئے ایک دن پہلے سفارش کر چکے تھے۔ تو سید صاحب نے ان صاحب سے: فرمایا کہ اس جگہ کے لئے تو میں نے کل ہی ایک دوسرے صاحب کی سفارش کی ہے لیکن اغلب یہ ہے کہ ایک آدھ مہینہ کے اندر اندر ایک سینیر لکچرر کی جگہ خالی ہو جائے گی اور اگر وہ خالی ہو گئی تو اس جگہ پر تمہارا تقرر جو سینیر لکچرر کا ہے

سے تمہاری تنخواہ سے کچھ زیادہ پر انشاء اللہ کرا دوں گا۔ اور اللہ کا کرنا یہ ہوا کہ وہ جگہ خالی بھی ہو گئی اس کے عہدہ دار بھی پاکستان چلے گئے اور سید صاحب نے اپنے وعدہ کے مطابق ان کے تقرر کی سفارش کا خط لکھ کر بھیج دیا۔ اور اس طرح ان کا تقرر بھی ہو گیا۔

اب ایک سینئر لکچرر کی اور ایک جونیئر لکچرر کی جگہیں اخباروں میں مشتہر کر دی گئیں۔ اور امیدواروں کی درخواستیں آگئیں۔ میری یہ کم عقلی تھی کہ میں نے دونوں کے لئے درخواستیں دے دیں۔ اور ابو سالم صاحب نے بھی احتیاطاً دونوں جگہوں کے لئے درخواستیں دیں اس لئے کہ وہ دلی کے حالات کو مدنظر رکھتے ہوئے علی گڑھ سے واپس نہیں جانا چاہتے تھے اور اس لئے اس بات کا خطرہ مول نہ لینا چاہتے تھے کہ ان کا تقرر کسی عہدہ پر بھی نہ ہو۔

یہ حسن اتفاق تھا کہ دسمبر کے مہینہ میں جس دن سلکشن کمیٹی دونوں عہدوں کے لئے ہونے والی تھی اسی دن ذاکر صاحب نے یونیورسٹی کے وائس چانسلر کا عہدہ سنبھال لیا۔ اور اس طرح سلکشن کمیٹی کے صدر کی حیثیت سے میری ملاقات ذاکر صاحب سے ہوئی۔ اس سے قبل نہ ذاکر صاحب نے مجھے دیکھا تھا اور نہ میں نے ذاکر صاحب کو صرف ان کے متعلق سن رکھا تھا کہ وہ ملک میں ایک بڑی حیثیت رکھتے ہیں اور ہر حلقہ میں عزت کی نگاہ سے دیکھے جاتے ہیں مجھے اس بات کا بھی علم نہ تھا کہ ذاکر صاحب نے اعلیٰ تعلیم "ایم۔ اے اور پی۔ ایچ۔ ڈی" کی ڈگری جرمنی میں برلن یونیورسٹی سے معاشیات میں حاصل کی تھی۔ سلکشن کمیٹی ہوئی جس میں متعدد امیدوار باہر کے بھی تھے۔ اور اندر سے میں اور ابو سالم صاحب تھے۔ میٹنگ کے بعد معلوم ہوا کہ جونیئر لکچرر کی حیثیت سے میرا اور سینئر لکچرر کے عہدہ پر ابو سالم صاحب کا تقرر ہو گیا۔ میں اپنے تقرر سے بہت خوش ہوا اور دو رکعت نماز شکرانہ ادا کی کہ اللہ تعالیٰ نے مستقل طور پر جونیئر لکچرر کی جگہ پر تقرر کروا دیا۔

میں تو اس لائق نہ تھا لیکن غالباً یہ ہے کہ ذاکر صاحب میرے انٹرویو سے بہت خوش ہوئے اس لئے کہ انہوں نے سید حمید الدین صاحب سے خاص طور پر فرمایا کہ وہ مجھے ان کے پاس بھیج دیں۔ دوسرے دن جب میں ذاکر صاحب سے ملا تو میری حیرت کی حد نہ رہی جب انہوں نے مجھ سے پوچھا کہ تمہیں اس بات کا افسوس تو نہیں ہے کہ تمہارا تقرر جونیئر لکچرر کے عہدہ پر ہوا۔ میں نے عرض کیا کہ میں تو بہت خوش ہوں کہ آپ جیسے قابل وائس چانسلر کی صدارت میں میرا جونیئر لکچرر کی حیثیت سے مستقل تقرر ہو گیا۔ تو انہوں نے فرمایا کہ انٹرویو کمیٹی کے لوگ تمہارے جوابات سے بہت خوش ہوئے۔ آئندہ محنت کرتے رہنا اور انشاء اللہ جلد ہی تمہارا تقرر سینئر لکچرر کی حیثیت سے ہو جائے گا اور تین ماہ کے بعد یعنی مارچ ۱۹۴۹ء میں ہو بھی گیا۔ اخبار جب پڑھا کرو تو اس میں یہ بھی دیکھتے رہنا کہ اگر کبھی کسی وقت باہر پڑھنے کے لئے کسی وظیفہ کا اشتہار ہوتا ہے تو مجھے بتانا۔ میں تمہارے لئے کوشش کروں گا اس لئے کہ باہر تعلیم حاصل کرنے سے

آدمی کے دماغ میں بہت وسعت ہوتی ہے اور مزید پڑھنے لکھنے کا ولولہ پیدا ہوتا ہے۔ اس دن میری سمجھ میں آگیا کہ لوگ جب
نوجوان لوگوں کی ستائش سے زیادہ ہمت افزائی کرتے ہیں اس لئے کہ جب انہوں نے میرے جیسے نالائق آدمی سے ایسی
باتیں کیں تو لائق لوگوں سے نہ جانے کیا کہتے ہوں گے۔ ان کی شخصیت کا میرے اوپر بہت اثر ہوا اور میں کام کرنے کا
عادی تو پہلے ہی سے تھا اس دن کے بعد تو دل و جان سے کام میں لگ گیا۔

بہت جلد ہی مجھے معلوم ہو گیا کہ ڈاکٹر صاحب شعبہ معاشیات میں آنریری پروفیسر کی حیثیت سے ہی
تقرر کئے جا چکے تھے اس لئے انہوں نے اکثر و بیشتر شعبہ میں آنا شروع کر دیا۔ ہم لوگوں سے معاشیات کے معاملات میں
گفتگو کرتے اور واپس چلے جاتے۔ ایک دن جب میں کلاس لینے گیا تو میرے پیچھے پیچھے وہ بھی کلاس میں داخل ہو گئے
اور طلباء کے ساتھ ہی کر بیٹھ گئے۔ پھر برابر بیٹھے رہے اور آس پاس کے طلباء جو لکچر سن کر نوٹس لے رہے تھے
ان کو بھی جانبا دیکھتے رہے۔ جب لکچر ختم ہوا تو کچھ طلباء نے سوالات کئے جن کے جوابات جو میں نے دیئے وہ بھی انہوں
نے سنے مگر انہوں نے ذاتی طور پر کوئی سوال نہیں کیا۔ میرے ساتھ جب کلاس سے باہر آئے تو انہوں نے دوسرے لوگوں
کے سامنے میرے لکچر کی بہت تعریف کی جو یقیناً میری ہمت افزائی کے لئے کی ہوگی۔ اور ساتھ ہی ساتھ مجھ سے یہ بھی کہا کہ
اپنے طلباء کو یہ بھی بتایا کرو کہ نوٹس کیسے لئے جاتے ہیں اس لئے کہ میں نے یہ بات دیکھی کہ اکثر طالب علم اصلی بات تو نوٹ نہیں
کرتے اور جو فالتو باتیں دہرائی جاتی ہیں ان کو خاص طور سے لکھتے ہیں۔ یہ بھی ارشاد فرمایا کہ آج کے تمہارے لکچر سے مجھے یہ یقین
ہو گیا کہ تم اپنے لکچر دینے کے لئے نوٹس لکھتے ہو گے اگر ایسا ہے تو تم وقتاً فوقتاً مجھے بھی دکھایا کرو تاکہ میری سمجھ میں جو
آئے وہ مشورہ کے طور پر میں تم کو بتا سکوں۔ ظاہر ہے یہ ان کی انکساری تھی کہ انہوں نے یہ بات مجھ سے اس طرح
کہی تھی ورنہ ان کے جیسا عالم تو مجھے بہت سی باتیں بتا سکتا تھا۔

بہر حال ان کا یہ حکم میرے لئے ان کی اکثر ملاقات ہونے کا باعث بن گیا۔ واضح رہے کہ یہ بات میرے ضمیر میں
بچپن ہی سے نہ تھی کہ میں اپنے کسی افسر کے پیچھے پیچھے پھروں۔ لیکن یہ ملاقات میری تحصیل علم کی خاطر تھی جو میں نے اپنے لئے بہت
قیمتی سمجھا۔ بعد میں کم از کم ایک بار میں ان سے ملتا اور میں ان کو اپنے نوٹس دے آتا جن کو وہ بغور ملاحظہ فرماتے
اور اکثر و بیشتر بہت سی چیزوں میں مشورہ دیتے رہتے تھے۔ میں نے اپنا طریقہ یہ کر رکھا تھا کہ کاپی کے ایک صفحہ پر نوٹس
لکھتا تھا اور اس کے پیچھے کے صفحہ کو خالی رکھتا تھا۔ جس پر ان کی ہدایات کے مطابق ترمیم و تنسیخ کرتا تھا اور
دنیا کے انگریزی زبان کے معاشیات کے بہترین جرائد اور کتابوں میں جو نئی باتیں نکلتی تھیں ان کو پڑھتا رہتا تھا۔

ایک دن میرے ایک ساتھی جو طالب علمی کے زمانہ میں میرے ساتھ کمرے میں رہتے تھے کسی اخبار سے

ایک اشتہار کاٹ کر میرے پاس لے آئے جس میں امریکہ کی تعلیمی فاؤنڈیشن کی طرف سے وظائف کے لئے درخواستیں مانگی گئی تھیں۔ اس اشتہار میں لکھا تھا کہ جو لوگ درخواست دینا چاہیں وہ سادہ کاغذ پر لکھ کر درخواست دے سکتے ہیں لیکن ساتھ میں ان کو اپنے ہائی اسکول سے لے کر ایم۔ اے پاس کرنے تک سب سرٹیفکیٹ کی کاپیاں منسلک کرنا ہونگی۔ میں نے ان سے کہا کہ بھائی میرے ہائی اسکول اور انٹرمیڈیٹ کے سرٹیفکیٹ تو ایک مرتبہ ریل گاڑی میں سفر کرتے وقت سامان کی چوری کے ساتھ چوری ہو گئے تھے میں ان سرٹیفکیٹ کی کاپیاں کہاں سے لا سکتا ہوں۔ انہوں نے کہا کہ وقت اب بہت کم رہ گیا ہے لہٰذا ان کو چھوڑیئے اور جلد از جلد ایک درخواست ٹائپ کروا لیجئے۔ جو سرٹیفکیٹ موجود ہیں ان کی کاپیاں منسلک کر دیجئے۔ میں کل دلی جا کر خود اس درخواست کو ہاتھوں ہاتھ دے آؤں گا۔ ان کی اس محبت اور ضد کی بنا پر میں بادل ناخواستہ تیار ہو گیا۔

وہ جمعہ کا دن تھا۔ اور انہوں نے اشتہار کا وہ کاغذ جمعہ کی نماز سے قبل مجھے دی تھی۔ میں نے اس کو پتہ والی کی جیب میں رکھا اور ان سے وعدہ کیا کہ جمعہ کی نماز کے بعد ہی میں یہ کام شروع کر دوں گا۔ میں جمعہ کی نماز پڑھنے گیا تو وہاں مسجد میں ذاکر صاحب سے ملاقات ہو گئی۔ میں نے مسجد سے باہر نکل کر ان کو وہ اشتہار دکھایا۔ کہنے لگے اس میں کوئی ڈگری ملنے کا تو ذکر نہیں ہے۔ میں نے کہا کہ پڑھائی تو علم حاصل کرنے کی خاطر کی جاتی ہے ڈگری ملنے کے لئے نہیں۔ فرمایا بالکل صحیح کہتے ہو۔ بہار میں میرے ساتھ چلو۔ وہاں اپنی درخواست میرے پی۔ اے مرید صاحب سے ٹائپ کروا لو۔ میں نے ایسا ہی کیا۔ جب میں نے ذاکر صاحب سے رخصت چاہی تو بولے اپنے ساتھی سے کہہ دو کہ جو بھی سرٹیفکیٹ تمہارے پاس ہوں وہ آج ہی ان کی کاپیاں مرید صاحب کو دے دیں مگر یہ کام آج ہی ہو جانا چاہیئے۔ کل میں دلی جاؤں گا اور تمہاری درخواست خود دے کر آؤں گا۔

وہ اپنے کہنے کے مطابق دوسرے دن دلی گئے اور صرف میری درخواست آفس پہنچائی بلکہ یقیناً ارباب حل و عقد سے میری سفارش بھی کی جس کا اندازہ مجھے اس بات سے لگا کہ جب مجھے انٹرویو میں بلایا گیا تو امیدواروں کا ایک جم غفیر تھا۔ میں دل ہی دل میں بہت دہشت زدہ تھا۔ لیکن جب میں انٹرویو دینے کے لئے اندر گیا اور انٹرویو لینے والوں کے سامنے بیٹھا تو میں نے اس بات کو سنا کہ فاؤنڈیشن کے ڈائرکٹر نے امریکہ کے کلچرل آفیسر سے جو ان کے پاس بیٹھے تھے کہا کہ یہ وہی صاحب ہیں۔ جن کے لئے ڈاکٹر ذاکر حسین خود آئے تھے۔ تو انٹرویو کرنے والوں نے مجھ سے صرف دو سوال کئے ایک تو پوچھا کہ کیا میں اس یونیورسٹی میں ملازم ہوں جس میں ڈاکٹر ذاکر حسین وائس چانسلر ہیں اور دوسرا یہ کہ میں امریکہ کی کس یونیورسٹی میں پڑھنا چاہوں گا۔ انٹرویو کے بعد میں واپس آ گیا۔ کچھ دنوں بعد مجھے

اطلاع ملی کہ مجھ کو وظیفہ دے دیا گیا ہے جس میں تعلیم، رہائش، کھانے پینے کے علاوہ آنے جانے کا خرچ بھی شامل تھا۔ میں بہت خوش ہوا اور جلدی جلدی تیاری کرکے امریکہ چلا گیا۔

امریکہ کی یونیورسٹیوں میں ہر مضمون کے ٹائم ٹیبل پر ان میں مختلف کورس مختلف گھنٹوں پر چھپے ہوئے ہوتے ہیں۔ داخلہ کے وقت ہی مل جاتے ہیں اور ہر طالب علم ٹائم ٹیبل کو دیکھ کر اپنے کورس خود طے کر لیتا ہے کہ کون سے کورس ایسے ہیں جن کو بلا ایک دوسرے سے ٹکراؤ کے پڑھا جا سکتا ہے۔ اور پہلے ہی دن سے پڑھائی شروع ہو جاتی ہے۔ جب میں نے پہلے دن کلاس کیا تو مجھے فوراً اندازہ ہو گیا کہ میں تو معاشیات میں جو کچھ جانتا تھا وہ قریب قریب نہ ہونے کے برابر تھا۔ پھر تو میں شروع سے دن رات کام میں لگ گیا۔ کلاس کے علاوہ زیادہ وقت لائبریری کے ریڈنگ روم اور شعبہ معاشیات کی لائبریری میں صرف کرتا۔

امریکہ کی اکثر و بیشتر یونیورسٹیوں میں گریجویٹ تعلیم کے لئے ہوسٹل میں جگہ نہیں ملتی مگر میری ضد پر یونیورسٹی والوں نے مجھے ایک ہوسٹل میں جگہ دے دی تھی اور امریکہ ہی کے رہنے والے ایک طالب علم کے ساتھ ایک کمرہ میں رہتا تھا۔ ہر چند کہ اس طالب علم کو پڑھنے لکھنے میں اتنی زیادہ دلچسپی نہ تھی لیکن وہ میرے انہماک کو دیکھ کر میں جب بھی اور جس وقت کمرے میں پڑھنا چاہتا تھا اس سے انکار نہ کرتا تھا۔

جس زمانہ میں میں امریکہ میں تعلیم پا رہا تھا ذاکر صاحب اسی زمانہ میں امریکہ کی گورنمنٹ کے دعوت نامہ پر امریکہ تشریف لائے۔ ان کو پورے ملک میں جگہ جگہ اور اچھے اور خوبصورت نیز دلچسپ مقامات پر لیجانے کا پروگرام امریکہ کی گورنمنٹ نے بنایا تھا۔ ان کی ذاتی خواہش پر ان کے لئے میری یونیورسٹی میں بھی آنے کا پروگرام بنا دیا گیا جہاں پر مجھے کئی دن ان کے بہت قریب رہنے کا موقعہ ملا۔ ان دنوں میں کلاس کے علاوہ زیادہ تر وقت ذاکر صاحب کے ساتھ گذارتا تھا۔ ان کے زیادہ قریب رہنے سے ان کی شخصیت اور خیالات کے متعلق مجھے کافی قریب سے دیکھنے کا موقعہ ملا۔ اس سلسلہ میں کچھ باتیں قابل ذکر ہیں۔

امریکہ کے قیام کے دوران میں نے ایک بات ان کے اندر خاص طور سے نوٹ کی اور وہ یہ کہ اللہ تعالیٰ نے ان کو نہایت حسین قسم کے مزاح سے نوازا تھا جس کے متعلق کم از کم میرا خیال یہ ہے کہ اس مضمون کے قارئین میں سے بہت کم کو واقفیت ہوگی۔ اس لئے اس کی کچھ مثالیں میں خاص طور سے تحریر کر رہا ہوں۔

پہلی بات تو یہ ہوئی کہ اس سال ایک ہندوستانی طالب علم کو امریکہ کی گورنمنٹ نے اپنے ملک سے نکل جانے کا آرڈر دیا تھا جس سے ہندوستانی طلباء اور دوسرے ہندوستانی جو امریکہ میں مقیم تھے ان کو بہت رنج

تھا۔ ڈاکٹر صاحب چونکہ ہمارے ملک کے بڑے لیڈر تھے اس لئے ان کے پاس کسی بڑے اخبار کی ایک نمائندہ لڑکی اس سلسلہ میں بیان لینے آئی۔ اس کے گال پر کوئی نشان لگا ہوا تھا۔ ڈاکٹر صاحب نے اس سے فرمایا کہ پہلے تم غسل خانہ میں جاؤ اپنا منہ دھوؤ اور میک اپ کر کے خوبصورت ہو۔ اس کے بعد اگر تب تم مجھ سے سوال کرو گی تو میں جواب دوں گا۔ جب وہ لڑکی غسل خانہ میں چلی گئی تو میں نے ڈاکٹر صاحب سے عرض کیا کہ میرے دل میں بھی یہ خیال آیا تھا کہ میں اس لڑکی سے یہ بات کہوں اور آپ کے دل میں بھی۔ مگر آپ نے کہہ دیا اور میں نہ کہہ سکا۔ کہنے لگے تمہارے دل میں اس کے علاوہ کچھ اور بھی تھا اس لئے نہ کہہ سکے۔ اور میرے دل میں اس کے علاوہ کچھ نہ تھا اس لئے کہہ دیا۔ مجھ کو اس پر بہت ندامت کا احساس ہوا۔ مگر انہوں نے ارشاد فرمایا کہ تم نوجوان آدمی ہو، اگر تمہارے دل میں کوئی اور خیال نہ آتا تو تعجب کی بات ہوتی۔

دوسرے دن کی بات ہے کہ میں اور ڈاکٹر صاحب یونیورسٹی کا کیمپس دیکھنے نکلے۔ ٹہلتے ہوئے جا رہے تھے۔ میرے درجہ کی امریکہ کی ایک طالبہ ملی۔ اس نے مسکرا کر مجھ سے ہیلو کہا اور آگے بڑھ گئی۔ ڈاکٹر صاحب نے فرمایا کہ یہ لڑکی تمہارے اوپر عاشق ہو گئی ہے۔ مجھے اس وجہ سے پتہ چلا کہ وہ تم کو دیکھ کر مسکرائی اور اس کے چہرہ پر خوشی کے آثار نمایاں ہوئے۔ میں نے عرض کیا کہ اس ملک میں تو یہی طریقہ ہے۔ اور میں اس کو کسی دوسرے معنی میں نہیں لیتا۔ کہنے لگے تو اچھا تمہارے اوپر عاشق ہو کر مسکرا نہیں رہی تھی تو میرے بڑھاپے کا مذاق اڑانے کے لئے ہنس رہی ہوگی۔ میں نے ان سے عرض کیا کہ ان دونوں میں سے کوئی بات نہیں ہے۔ وہ میرے ساتھ پڑھتی ہے۔ میری دوست ہے اور میں اس کی عادتوں سے اچھی طرح واقف ہوں۔ کہنے لگے تم صحیح کہتے ہو۔ لیکن اس کو کیا کہا جائے کہ ہندوستانی طلباء ہر چیز کو غلط سمجھتے ہیں اور جو خطوط مغربی ممالک سے اپنے دوست احباب کو ہندوستان یا پاکستان بھیجتے ہیں، ان میں فرضی گڑھے گڑھائے قصے لکھتے ہیں اور ایسا ظاہر کرتے ہیں کہ مغربی ممالک کی ہر لڑکی دن رات بس اسی کام میں لگی رہتی ہے کہ ان سے عشق کرے۔

اس کے بعد جو واقعہ ہوا اس نے مجھے حقیقت میں پریشان کر دیا۔ کہنے لگے میں تمہارا کمرہ ہوسٹل میں دیکھنا چاہوں گا۔ میں نے عرض کیا کہ میرا کمرہ چوتھی منزل پر ہے۔ ہوسٹل میں لفٹ نہیں ہے۔ آپ کے لئے اتنا اوپر چڑھنا مناسب نہیں ہوگا اس لئے کہ آپ کو ابھی دو سال پہلے ہارٹ اٹیک ہو چکا ہے۔ کہنے لگے مجھے ڈاکٹروں نے دھیرے دھیرے چڑھنے کی اجازت دے دی ہے اور تھوڑی تھوڑی دیر کے بعد آرام کر لیا کریں گے۔ میں نے عرض کیا کہ میں جلد اٹھنے کا عادی ہوں اور جلد ناشتہ کر کے کمرے سے باہر نکل آتا ہوں میرے کمرے کا ساتھی دیر تک سوتا ہے اور اس لئے عموماً چابی کمرے کی اس کے پاس رہتی ہے۔ اس لئے میرے پاس چابی نہیں ہے اور کمرہ نہ کھول سکوں گا۔ کہنے لگے کہ ولایت میں تو یہ شخص کمرہ کیا

یہاں کی بہت اچھی ہے۔ یہیں پر کنڈیشن ہوتی ہیں اس میں باتھ روم بھی ہوتا ہے۔ یہاں سے کل دو گھنٹے بس میں لگیں گے اور میں خود آپ کو یہاں سے وہاں پہنچا کر لوٹ آؤں گا۔ اس پر وہ فوراً راضی ہو گئے۔ میں ایک ٹیکسی میں بٹھا کر ان کو بس اسٹینڈ لے گیا۔ وہاں پر ایک بس ایسٹ لانسنگ جانے کے لئے بالکل تیار تھی۔ اتفاق سے اسٹینڈ پر ایک امریکہ کا نوجوان اسی ملک کی ایک لڑکی کو پیار کر رہا تھا۔ کہنے لگے پہلے اس کو دیکھیں۔ ________ میں نے عرض کیا کہ اس کے دیکھنے میں بس چھوٹ جائے گی تو کہنے لگے اس کے علاوہ تو کوئی بس جاتی ہوگی وہ مل جائے گی۔ میں خاموش ہو گیا۔ تھوڑی دیر بعد مجھ سے کہنے لگے کہ کیا تم کو دیکھنے میں کوئی پریشانی لگ رہی ہے۔ میری سمجھ میں کچھ نہ آیا کہ کیا جواب دوں۔ تو خود ہی کہنے لگے۔ دیکھو میں تم کو ہدایت کرتا ہوں کہ جیسے جیسے عمر زیادہ ہونے لگے تو اپنے سے کم عمر خاص طور سے نوجوان لڑکے اور لڑکیوں کے جذبات اور خیالات کو سمجھنے کی کوشش کرو۔ اور ان کی عزت کرو۔ ہر بات میں ان کا معیار تم سے مختلف ہوگا۔ وقت کے گذرنے کے ساتھ خیالات بھی بدلتے جاتے ہیں۔ اگر تم نے نوجوان لڑکے اور لڑکیوں کے جذبات سمجھنے کی کوشش نہ کی تو ہر نوجوان تم کو بڑھاپے میں سٹھیایا ہوا سمجھے گا اور تم ہر نوجوان آدمی اور نوجوان لڑکی کو خراب چال چلن کا سمجھو گے اس سے دونوں طرف کے لوگوں کو تکلیف ہوگی۔ دنیا میں ویسے ہی مسائل کیا کم ہیں کہ تم اسے بڑھاپے میں ایک گمبھیر قسم کا مسئلہ اپنے لئے مزید بنالو اور دل ہی دل میں کڑھتے رہو۔

بہرحال ہم لوگ دوسری بس سے ایسٹ لانسنگ پہنچے۔ وہاں بس اسٹینڈ سے ٹیکسی لی۔ اور ان کی رہائش کے مقام پر جس کا ان کے پروگرام میں اندراج تھا پہنچے۔ وہاں جا کر انہوں نے اور میں نے دونوں نے منہ ہاتھ دھوئے اور اور سنترہ کا عرق لیا۔ جب میں نے واپسی کی اجازت مانگی تو کہنے لگے اب میں تمہیں بس اسٹینڈ تک پہنچا دوں گا۔ میں نے بہت درخواست کی کہ اس کی ضرورت نہیں۔ کہنے لگے تھوڑی چہل قدمی ہو جائے گی۔ بس اسٹینڈ تو قریب ہی معلوم ہوتا ہے میرے بار بار منع کرنے کے باوجود بھی وہ میرے ساتھ چل دیئے۔ آگے چل کر وہ سڑک دو سڑکوں میں تقسیم ہو گئی تو میں نے ان سے عرض کیا کہ وہ ایک آدمی جا رہا ہے اس سے معلوم کر لوں کہ ان میں سے کون سا راستہ بس کے اڈے کو لے جائے گا کہنے لگے جب دو آدمی چل رہے ہوں تو بھٹکنے میں بہت مزہ آتا ہے۔ اگر غلط چلے بھی گئے تو یہیں واپس آ کر پھر دوسری سڑک پر چل پڑیں گے۔ ہر چند کہ وہ بہت شفقت کرتے تھے جو ان کی بڑائی تھی مگر میری اتنی ہمت کہاں کہ ان کے کسی ارشاد کے بعد ان سے جرح کروں۔ میں اور وہ آگے بڑھے۔ اتنے میں ایک نوجوان خوبصورت لڑکی ادھر سے گزرتی ہوئی نظر آئی۔ فرمایا جلدی اس کے پاس جاؤ اور صحیح راستہ معلوم کرو۔ میں نے بڑی ہمت کر کے عرض کیا کہ ابھی تو آپ نے فرمایا تھا کہ دو آدمی ساتھ ساتھ چل رہے ہوں تو بھٹکنے میں مزہ آتا ہے اور کسی سے راستہ نہ پوچھو۔ اس پر

کہنے لگے تو کیا تمہارا اس لڑکی کے پاس جا کر اس کو روک کر پوچھنا ٹھیک نہیں کہلائے گا،

باتیں تو زیادہ سی ہو گئیں اور قارئین سے ان کی طوالت کے لئے معافی کا خواستگار ہوں۔ لیکن یہ سب لکھنا شاید اس لئے ضروری تھا کیونکہ ڈاکٹر صاحب کی زندگی کا وہ حسین پہلو جس سے پہلے میں واقف نہ تھا اور نہ شاید ہو سکتا اگر امریکہ میں چند دنوں کا ساتھ نہ رہتا آپ حضرات کے سامنے ان کو پیش کر دوں۔

ڈاکٹر صاحب نے ایک دن میری یونیورسٹی کے قیام کے دوران میں مجھ سے پوچھا کہ کیا یہاں فوٹوگرافر کا کوئی اسٹوڈیو نہیں ہے۔ میں نے کہا وہ تو کئی ہیں۔ لیکن خیال ہے بہتر ہوگا کہ پہلے ٹیلی فون کر کے وقت کا تعین کر لیا جائے۔ اس کے بعد چلیں۔ کہنے لگے ٹھیک ہے۔ ٹیلی فون کیا تو وقت جلد ہی مل گیا۔ ڈاکٹر صاحب کہنے لگے کہ تھوڑی دیر آرام کر لوں اس کے بعد چلیں گے۔ کہتے ہی وہ سو گئے۔ اب میں سخت پریشان تھا کہ یا اللہ اگر وہ وقت سے پہلے نہ جاگے تو میں کیا کروں گا لیکن یہ ہوا کہ وقت سے پانچ منٹ پہلے وہ خود جاگ کر اٹھ گئے اور بولے چلو۔ ہم لوگ اسٹوڈیو گئے۔ جب فوٹو لینے کا سوال آیا تو میں ایک طرف کھڑا ہو گیا۔ بولے تم کیسے بے وقوف ہو۔ یہ میرے فوٹو نہیں ہیں یہ تو تمہارے ساتھ ایک فوٹو کھنچوانا چاہتا ہوں تاکہ تمہارے پاس بھی رہے اور میرے پاس بھی۔ میں نے ان کے حکم کی تعمیل کی۔ فوٹوگرافر نے مختلف زاویوں سے چار فوٹوگراف لئے۔ جو سب سے اچھا تھا اس کی تین کاپیاں بنا کر ڈاکٹر صاحب کے وہاں سے رخصت ہونے سے پہلے ہی دے دیں۔ دو کاپیاں میں نے ڈاکٹر صاحب کو دے دیں۔ اور ایک اپنے پاس رکھ لی۔ یہ حسن اتفاق ہے کہ ہم دونوں کا وہ فوٹو بہت ہی خوبصورت ہے۔ اس میں ڈاکٹر صاحب نے سوٹ پہنا ہوا ہے۔ جو بہت سے اور فوٹو کے بیچ ڈرائنگ روم کی زینت ہے۔ وہ فوٹوگراف ڈاکٹر صاحب کے گھر والوں کو بہت پسند آیا۔ تو بعد میں جب میں شکاگو یونیورسٹی پروفیسر ہو کر گیا تو میں نے فوٹوگرافر کو خط لکھا کہ وہ ڈاکٹر صاحب ہی کے فوٹو کو نکال کر اس کی تین کاپیاں بڑی بنا کر میرے پاس بھیج دے۔ اس نے جلد از جلد میرے پاس بھیج دیئے اور میں نے اس کے خرچ کی ادائیگی کر دی۔

جب شکاگو سے واپس آیا تو وہ فوٹوگراف ان کو پیش کئے۔ بہت خوش ہوئے اور انہوں نے اپنے خاندان والوں کو تقسیم کئے۔ یہ عجیب اتفاق ہے کہ جب وہ فوٹو لیا گیا تھا تو ڈاکٹر صاحب کی عمر ۶۸-۷۰ سال کی تھی۔ لیکن اس فوٹوگراف میں ان کی عمر بہت کم نظر آتی تھی اور ڈاکٹر صاحب کے انتقال کے بعد جب مختلف اخباروں اور رسائل نے ان کے مختلف فوٹوگراف شائع کئے تو اس فوٹوگراف کے نیچے لکھا "ڈاکٹر صاحب کا جرمنی کے دوران تعلیم کا فوٹو" حالانکہ وہ فوٹو میرے ساتھ والے فوٹوگراف کا ایک حصہ تھا بلکہ اگر کوئی غور سے دیکھے تو ایک طرف میرے کندھے کا ایک حصہ بھی اس میں نظر آتا ہے۔[1]

امریکہ میں میری تعلیم کے دوران میں ایک شب میرے ایک استاد پروفیسر گستھ لولانگ نے جو نہ صرف میرے

---

1 اس فوٹوگراف کا عکس صفحہ ۲۲ پر ملاحظہ ہو۔

کے بلکہ علم معاشیات میں دنیا کے تبحر ماہرین میں شمار ہوتے تھے۔ ڈاکٹر صاحب کو کھانے پر مدعو کیا۔ اور چونکہ ان کو علم تھا کہ میں اسی یونیورسٹی کا طالب علم رہ چکا تھا اور استاد کی حیثیت سے کام کر رہا تھا جہاں پر ڈاکٹر صاحب وائس چانسلر تھے تو انہوں نے از راہ کرم مجھ کو بھی ان کے ساتھ بلایا۔ کھانے پر حالانکہ مزید شفقت کے تحت جس کا میں حقدار نہ تھا ڈاکٹر صاحب سے انہوں نے میری بے حد تعریف کی جس سے ڈاکٹر صاحب کو یقیناً میرے متعلق اچھا خیال رہنے لگا ہوگا۔ یہ بات اس طرح ثابت ہوئی ہے کہ جب میں امریکہ سے تعلیم حاصل کر کے واپس آیا، اور میرے پاس رہنے کے لئے کوئی جگہ نہ تھی تو ڈاکٹر صاحب نے پرووسٹوں کا جب یہ تقرر کیا تو ان کی محفل میں کہا کہ آپ لوگ جن اصحاب کو چاہیں اپنے ہال میں ہوسٹلوں کا وارڈن رکھیں۔ لیکن ایک صاحب کی میں سفارش کرتا ہوں۔ جن کو ایسی جگہ رکھا جائے جس میں ان کی رہائش کا انتظام بھی ہو سکے ڈاکٹر نور الحسن صاحب نے جو اس وقت تک پروفیسر نہ تھے لیکن متوقع ہونے والے تھے۔ بغیر نام سنے ہی کہہ دیا کہ میں راضی ہوں۔ دوسرے پرووسٹوں کو شاید یہ خیال ہوا ہوگا کہ وائس چانسلر اپنا ایک آدمی رکھنا چاہتے ہیں جو خبر رسانی کرتا رہے اس لئے انہوں نے تامل کیا جب ڈاکٹر صاحب نے میرا نام لیا تو اس پر ڈاکٹر نور الحسن صاحب نے فرمایا کہ وہ تو بہت نیک اور شریف آدمی ہیں اور ابھی ابھی امریکہ سے واپس آئے ہیں اس لئے ان کے رکھنے سے تو بہت اچھے نئے خیال ملیں گے اور وہ تو ہمارے لئے بہت مددگار ثابت ہوں گے۔ ان کے اس بیان میں کتنی حقیقت پسندی تھی اور کتنی وائس چانسلر کی خوشنودی مدنظر تھی اس کو تو صرف نور الحسن صاحب جانتے ہوں گے۔ لیکن ڈاکٹر نور الحسن صاحب کے ساتھ کام کرنے سے پتہ چلا کہ وہ ایماندار آدمی تھے اور غالباً انہوں نے یہ بات نیک نیتی ہی سے کہی ہوگی۔ بہرکیف جب ڈاکٹر نور الحسن صاحب نے مجھ سے مسلم ہوسٹل میں وارڈن ہونے کے لئے کہا تو میں نے ان کا شکریہ ادا کیا کہ آپ نے از راہ مہربانی میری رہائش کا انتظام کر دیا لیکن جس وقت مجھے یونیورسٹی کا مکان مل جائے گا اسی وقت میں مستعفی ہو جاؤں گا۔ اس پر وہ راضی ہو گئے۔ انہوں نے مجھے اپنے ہال کے کامن روم کا انچارج بھی بنا دیا۔ جس کو اس زمانہ میں یونیورسٹی کا بہترین کامن روم سمجھا جاتا تھا۔

(۲) میرے امریکہ سے واپس آنے پر سید معین الدین صاحب جو اس مدت سے بہت تنگ ہو چکے تھے کہ ڈاکٹر صاحب اکثر محفلوں میں ان کی برائیاں کرتے رہتے تھے، اپنے عہدہ سے مستعفی ہو گئے۔ ڈاکٹر صاحب سے کہہ دیا کہ اب چونکہ ایک نوجوان آدمی آپ کو اچھا مل گیا ہے آپ اس سے کام لیجئے اور میرا استعفیٰ فوراً منظور کیجئے۔ ڈاکٹر صاحب نے ان کو کچھ عرصہ روکنے کی کوشش کی لیکن وہ نہ مانے۔ تو ڈاکٹر صاحب نے ان کا استعفیٰ منظور کر لیا اور وہ بادل ناخواستہ پاکستان چلے گئے جہاں وہ اپنی طبیعت سے ہرگز رہنا نہ چاہتے تھے۔ چونکہ وہ میرے محسن تھے اور میں ان کو بہت

جاتا تھا انکے جانے سے مجھے بہت رنج ہوا۔

یہ بات ۱۹۵۲ء کی تھی۔ اس سال انڈین اکنامکس ایسوسی ایشن کی کانفرنس شانتی نکیتن میں ہوئی تھی جس میں
میں نے بھی شرکت کی اور ڈاکٹر علی محمد خسرو جو انگلستان سے تعلیم حاصل کرکے واپس آئے تھے اور عثمانیہ یونیورسٹی میں
کام کرتے تھے انہوں نے بھی۔ یہ حسن اتفاق ہے کہ پروفیسر وی۔ کے۔ آر۔ وی۔ راؤ جو اس زمانہ میں معاشیات کے چیدہ عالم
سمجھے جاتے تھے (اور آج بھی ملک میں تنہا نیشنل پروفیسر ہیں) اس وقت دہلی اسکول آف اکنامکس کے ڈائرکٹر تھے۔ انہوں
نے میرے مقالہ کو بہت پسند کیا اور اس کی کاپی کو یہاں مجھ سے لے کر دہلی آگئے اور اپنے ساتھیوں کو بھی دکھائیں۔ انہوں
نے مجھے اس بات کی دعوت دی کہ میں دہلی اسکول آف اکنامکس میں کسی اچھے عہدہ پر کام کرنے کے لئے آمادہ ہو جاؤں
جس کے لئے میں ان کا شکر گزار ہوا لیکن اس وجہ سے انکار کر دیا کہ میں ذاکر صاحب سے وعدہ کر چکا تھا کہ میں تاحیات
مسلم یونیورسٹی کی خدمت کرتا رہوں گا۔ مجھے یقین ہے کہ انہوں نے ڈاکٹر علی محمد خسرو کا مقالہ بھی بہت پسند کیا ہوگا۔ اور شاید انکو
بھی اس قسم کی دعوت دی ہوگی جس کا مجھے صحیح علم نہیں ہے۔ مگر میں یقین کے ساتھ کہہ سکتا ہوں کہ مجھے ڈاکٹر علی محمد خسرو کا
مقالہ اور اس کے پیش کرنے کا طریقہ دونوں بہت پسند آئے۔ اور بعد میں فرصت کے وقت ان سے کہہ دیا کہ علیگڑھ
میں ایک ریڈر اور شعبہ کے چیئرمین کی جگہ خالی ہے جب مشتہر ہو تو آپ درخواست دیں اور اگر آپ ہم لوگوں کی قیادت
کریں گے تو آپ کی بہت پذیرائی ہوگی اور شعبہ کی شہرت بھی ہوگی۔

ادھر ذاکر صاحب کا سنئے کہ ایک مرتبہ ولایت کے کسی مہمان کو لے کر وی۔ ایم۔ ہال کے کامن روم کو دکھانے
کے لئے تشریف لائے جس کا میں انچارج تھا میں کامن روم میں ان کے استقبال کے لئے تیار رہتا۔ ذاکر صاحب چپکے
سے مجھے ایک طرف لے گئے اور فرمایا کہ شعبہ میں ریڈر کی ایک جگہ خالی ہے۔ اس کے اشتہار کا ایک مسودہ بنا کر کل میرے
پاس لے آنا۔ میں دوسرے دن ان کے پاس مسودہ بنا کر لے گیا۔ ان کے پاس زبیری صاحب جو اس زمانہ میں رجسٹرار تھے
بیٹھے تھے۔ مجھے ذاکر صاحب نے اندر بلا لیا۔ میں نے ان کی خدمت میں مسودہ پیش کیا۔ انہوں نے اپنا عینک جس کو وہ پہنے رہتے تھے
اتار کر پڑھنے والا عینک لگا کر دیکھا۔ اور پھر میری طرف مخاطب ہو کر بولے کہ کیا تم مجھ کو بے وقوف سمجھتے ہو۔ میں گھبرا گیا
اور عرض کیا کہ اگر کوئی غلطی ہوگئی ہو تو معافی کا خواستگار ہوں۔ انہوں نے مسودہ زبیری صاحب کی طرف بڑھا کر
کہا کہ آپ یونیورسٹی کے رجسٹرار ہیں مگر میں آپ سے مسودہ بنانے کے لئے کہتا تو کیا آپ اس سے مختلف بناتے۔
انہوں نے جواب دیا نہیں حضور میں بھی یہی بناتا۔ تو ذاکر صاحب نے مجھ سے مخاطب ہو کر فرمایا کہ پھر میں نے اس کام کے
کرنے کو تم سے کیوں کہا۔ میری سمجھ میں نہ آیا۔ عرض کیا میں تو ایسا ہی سمجھا ہوا تھا۔ فرمایا وہ چیزیں لکھ کر لاؤ جن میں تم مجھ سے اچھے ہو۔

مجھے تمہیں ریڈر بنانا ہے۔ میں نے بہت معذرت کے بعد عرض کیا لیکن میں تو ڈاکٹر علی محمد خسرو کو جو عثمانیہ یونیورسٹی میں ملازمت کرتے ہیں ان کو یہاں آنے کی دعوت دے کر آرہا ہوں۔ کہنے لگے تمہیں ان باتوں کا اختیار کس نے دیا ہے۔ اور کیا ضروری ہے کہ وہ آئیں تو ان کا تقرر بھی ہو جائے۔ درخواست دینے والے تو بہت سے ہوتے ہیں جو سب سے اچھا ہوتا ہے اس کو لیا جاتا ہے۔ اب آپ یقین کیجئے اگر میرے دل میں آیا کہ میں ان سے کہوں کہ پھر اشتہار دیا جانا چاہئے جیسا ضابطہ ہے لیکن میری اخلاقی کمزوری تھی کہ میری ڈاکٹر صاحب کے سامنے یہ کہنے کی جرات نہ ہوئی۔ آپ اس کو جس طرح چاہیں تعبیر کریں لیکن میں یہ یقین آپ کو دلا سکتا ہوں کہ اس میں میرا ذاتی لالچ شامل نہ تھا اس لئے کہ میں اپنی کمزوریوں اور نااہلیت سے بخوبی واقف رہا ہوں اور آج بھی ہوں۔

ہر حال اس جگہ کا اشتہار ہو گیا۔ اس میں میرے علاوہ خسرو صاحب، ڈاکٹر سبزواری صاحب جو میرے ساتھ شعبہ میں کام کرتے تھے اور لکھنؤ یونیورسٹی کے ایک خاص ڈاکٹر نصیر الدین صاحب بھی شامل تھے۔ اس کے علاوہ اور کون لوگ تھے، مجھے یاد نہیں۔ اس لئے کہ انٹرویو میں یہی چار آدمی آئے۔ میری حیرت کی کوئی انتہا نہ رہی جب بعد میں مجھے معلوم ہوا کہ میرا تقرر ہو گیا تو میں ڈاکٹر صاحب کے پاس حاضر ہوا اور عرض کیا کہ مجھے یقین ہے کہ خسرو صاحب مجھ سے کہیں بہتر تھے۔ آپ نے ان کا تقرر کیوں نہ کیا۔ کہنے لگے وہ بھی بہت اچھے تھے ______ لیکن یہ یقینی بات ہے کہ اگر شعبہ میں ریڈر کی دوسری جگہ خالی ہوتی تو یقیناً ان کو رکھ لیتا اس لئے کہ ایسے آدمی کا ملنا مشکل ہوتا ہے۔

بحیثیت ریڈر میری تقرری کے بعد ڈاکٹر صاحب نے فرمایا کہ جس کو تم اچھا سمجھو اور یہ یقین کر لو کہ یہ ترقی کر سکتا ہے اس کی کسی بھی طرح سے مدد کرو اور تقرر کرو۔ اب میں شعبہ کو بڑھانے کی ذمہ داری تمہارے سپرد کرتا ہوں

(۲) قارئین میں سے اکثر کو معلوم ہوگا کہ ڈاکٹر صاحب قائم گنج کے ایک مشہور پٹھان خاندان سے تعلق رکھتے تھے اور پہلے اپنا نام ذاکر حسین خاں لکھتے تھے۔ ان کے سب خاندان والے آج بھی اپنے نام کے آگے خاں لکھتے ہیں۔ لیکن جس زمانہ میں وہ شیخ الجامعہ تھے اس زمانہ میں کسی وقت انہوں نے اپنے نام سے خاں لکھنا بند کر دیا تھا۔ جس کی وجہ وہ یہ بتاتے تھے کہ خاں تو وہ لکھے جو جاہل ہو اور اکثر و بیشتر لڑنے مرنے پر آمادہ رہے۔ اپنے دل میں سے بدلے کی دشمنی کو نہ نکالے۔ کہتے تھے کہ میں چونکہ پڑھا لکھا اور شریف انسان ہوں تو اپنے نام کے ساتھ خاں کیوں لکھوں۔ خاں نہ لکھنے کا نتیجہ یہ ہوا کہ جب ان کی چھوٹی بیٹی کے پیام کا معاملہ درپیش ہوا تو ان کے کہنے کے مطابق اس بات کی تحقیق سسرال والوں کی طرف سے کی گئی کہ ڈاکٹر صاحب پٹھان ہیں بھی یا یوں ہی دعوے جتاتے ہیں۔ لیکن میں نے اپنے مشاہدہ

میں نے دیکھا کہ ان کے خاندانی پس منظر کے باوجود ان کے اندر شہزادوں کی وہ سب خصوصیات تھیں جن کو وہ ناپسند کرتے تھے۔ یہ دوسری بات ہے کہ ایک شریف آدمی ہونے کی وجہ سے ان کا اظہار کم ہونے دیتے تھے۔ اس کی کئی مثالیں دی جا سکتی ہیں۔ میں اس وقت صرف چار مثالوں پر اکتفا کروں گا۔

اول تو یہ ہے کہ اپنی طالب علمی کے زمانہ میں جب کہ وہ یونیورسٹی کے وائس پریسیڈنٹ تھے (واضح رہے کہ اس زمانہ میں پریسیڈنٹ یونیورسٹی کا وائس چانسلر ہوا کرتا تھا) تو سید محمد الدین صاحب سینئر کیبنٹ تھے جو وائس پریسیڈنٹ کی عدم موجودگی میں صدارت کر سکتے تھے۔ کسی معاملہ میں ڈاکٹر صاحب کا سید صاحب سے تصادم ہو گیا۔ وہ اس کو کبھی بھول نہ سکے۔ انھیں اکثر و بیشتر وہ سید صاحب کی برائی سخت الفاظ میں کرتے رہتے تھے۔ اور معاشیات کے کسی بھی جلسہ میں حتیٰ کہ صدر معاشیات کی انجمن اکنامکس کانفرنس ہوئی اس میں بھی علی الاعلان کہا کہ شعبہ معاشیات کے صدر نالائق ہیں اور مجھے کسی اچھے صدر کی تلاش ہے۔ یونیورسٹی کے ایگزیکٹیو کے موقع پر یہ بات ضرور دہراتے تھے۔ یہی نہیں یونیورسٹی کے دوسرے شعبہ جات میں انہوں نے سید صاحب سے کم لیاقت کے لوگوں کو پروفیسر بنا دیا لیکن ڈاکٹر صاحب کی شرافت کا ایک پہلو یہ تھا کہ ایک مرتبہ جب میں ان سے ملنے گیا تو میرے سامنے کچھ لوگوں کی محفل میں سید صاحب کی برائی سخت الفاظ میں کر رہے تھے۔ میں وہاں سے اٹھ کے چل دیا تو کہا تم ملنے آئے تھے، کوئی بات کرنا ہوگی اب واپس کیوں جا رہے ہو۔ میں نے عرض کیا کہ میں سید صاحب کی دل سے عزت اور قدر کرتا ہوں اور ان کے خلاف کوئی بات کسی سے بھی نہیں سن سکتا۔ چاہے وہ یونیورسٹی کے وائس چانسلر ہی کیوں نہ ہوں۔ تو انہوں نے میری بات کا برا نہ مانا اور کہا کہ اگر ایسا ہے تو میں تمہاری موجودگی میں کبھی ان کی برائی نہ کروں گا۔ سچ یہ ہے کہ بڑا آدمی بڑا ہی ہوتا ہے۔ ڈاکٹر صاحب کی جگہ کوئی اور ہوتا تو شاید میرے اس عمل اور میرے اس طرح کہنے سے وہ ہمیشہ کے لئے خفا ہو جاتا۔

دوسری مثال یہ ہے کہ جب میں امریکہ میں تعلیم پا رہا تھا اور ڈاکٹر صاحب نے میری یونیورسٹی میں کچھ دنوں قیام کیا تو ان کے پاس امریکی گورنمنٹ سے وقتاً فوقتاً اخراجات کے لئے چیک آتے تھے۔ ایک دن اس چیک سے روپیہ لینے کے لئے وہ میرے ساتھ اول وقت میں ایک بینک میں گئے۔ بینک کے اکثر کاؤنٹر خالی تھے۔ ایک کاؤنٹر پر ایک لڑکی بیٹھی تھی۔ اس سے جب ڈاکٹر صاحب نے چیک کے بدلے روپیہ طلب کیا تو اس نے ان سے پاسپورٹ دکھانے کو کہا۔ اتفاق سے اس وقت ان کے پاس پاسپورٹ نہ تھا اسے وہ اپنے کمرے میں چھوڑ گئے تھے۔ وہ پاسپورٹ لینے واپس آئے اور پاسپورٹ لے کر جب دوبارہ بینک پہنچے تو اس لڑکی کے کاؤنٹر پر بڑی بھیڑ تھی اور لوگوں کی ایک لمبی لائن لگی تھی۔ دوسرے کاؤنٹروں پر قدرے کم آدمی تھے اور ایک پر تو بہت کم تھے۔ میں نے ڈاکٹر صاحب سے عرض کیا کہ صاحب

آپ کو دل کا دورہ ہو چکا ہے۔ زیادہ دیر تک کاؤنٹر کے سامنے لائن میں کھڑا رہنا مناسب نہیں۔ پتہ نہیں کتنی دیر میں
نمبر آئے۔ دوسرے کاؤنٹر سے روپیہ لے لیں تو بہتر ہوگا۔ انہوں نے کافی غصہ کے انداز میں کہا کہ اگر میں روپیہ لوں گا تو اس
لڑکی سے پاسپورٹ دکھا کر لوں گا۔ چاہے مجھے پورے دن ہی کیوں نہ کھڑا رہنا پڑے۔

تیسری مثال یہ ہے کہ جب میں امریکہ سے تعلیم حاصل کر کے واپس آیا تو ذاکر صاحب نے مجھ سے کہا کہ کیا یہ
ممکن ہے کہ اصول معاشیات کے سب خیالات کو سادہ طور پر اس طرح لکھا جائے کہ اس میں قدیم و جدید خیالات
واضح طور پر نظر آئیں۔ اس سے طالب علموں کو معاشیات میں جو ترقی ہوئی ہے اس کے متعلق صحیح طور پر معلومات
ہو جائے گی۔ میں نے عرض کیا کہ یہ بالکل ممکن ہے۔ اور میں یہ کام انشاء اللہ جلد ہی انجام دے دوں گا۔ لیکن آپ کو ایک
اتنی دوں گا کہ آپ اس کو دیکھتے جائیں اور اس میں آپ جو ترمیم و تنسیخ کا مشورہ دیں، وہ میں کر دوں گا۔ وہ اس پر
راضی ہو گئے۔ میں نے یہ کام بفضلہ جلد ہی انجام دے دیا۔ انہوں نے میرا لکھا ہوا بہت پسند کیا اور کہنے لگے کہ بجائے
اس کے کہ اس کو کتاب کی شکل میں شائع کیا جائے اس کو سائیکلو اسٹائل کرنا چاہیئے۔ اور یہ کام میں اپنی نگرانی میں
کروا دوں گا۔ اس کے بعد دو ایک سال طلباء میں اس کو مفت تقسیم کر کے اس قسم کی تعلیم دی جائے۔ اس کام کو بھی انہوں نے
بہت تیزی سے کروا دیا اور مجھ سے کہا کہ فوراً اس کو پڑھانا شروع کر دو۔ اب ظاہر ہے کہ یہ کتاب یا مسودہ اس سے بہت
مختلف تھا جو اس سال کے سلیبس میں لکھا ہوا تھا۔ بہرحال میں نے یہ کتاب طلباء میں تقسیم کی اور ان کو اسی طرح پڑھانا شروع
کر دیا۔ اس پر طالب علموں نے خفگی کا اظہار کیا۔ اور سب کے سب میرے خلاف ایک جلوس لے کر ذاکر صاحب
کے پاس گئے اور ان سے کہا کہ ہم تو وہی پڑھیں گے جو سلیبس میں لکھا ہے اس سے علیحدہ ہم کچھ نہیں پڑھ سکتے۔ ذاکر صاحب
نے ان لوگوں سے سوال کیا کہ کیا اس وقت سب طلباء آئے ہیں یا کوئی باقی بچا ہے۔ طلباء اور طالبات نے بتایا۔
ایم۔ اے پریویس اور فائنل کے سب طالب علم ہیں، تو ذاکر صاحب نے ان سے بہت غصہ میں کہا کہ اچھا میں ابھی
تم سب کو یونیورسٹی سے نکالنے کا حکم دیتا ہوں۔ تم لوگ بستر باندھو اور گھر جاؤ۔ اگر دو چار سال ایم۔ اے میں معاشیات
کا کوئی طالب علم نہیں ہوگا تو کوئی آسمان نہیں ٹوٹ پڑے گا۔ جب مجھے اس کا علم ہوا تو میں ذاکر صاحب کی خدمت میں حاضر
ہوا اور ان سے عرض کیا کہ ذاکر صاحب ان کا مطالبہ تو بالکل صحیح ہے پھر آپ نے ایسا حکم کیوں دیا۔ انہوں نے جواب دیا کہ
اگر کوئی کام میری مرضی کے مطابق نہ ہو تو میں اس کو برداشت نہیں کر سکتا۔ اور اب تو میں کہتا ہوں کہ اگر ان طلباء کو یہاں
پڑھنا ہے تو یہ مضمون تم ہی پڑھاؤ گے اور میں خود ان کا ممتحن ہوں گا اور اس کتاب کے علاوہ کوئی سوال نہیں ہوگا،
چاہے اس کا سلیبس سے کوئی تعلق ہو یا نہ ہو اسی کے مطابق طالب علموں کو امتحان دینا ہوگا۔ میں سن کر خاموش واپس آ گیا۔

طلبا سے یہ بات بتائی، اس کے بعد سب کے سب مدد و محویت اس کتاب کے مطابق پڑھنے پر تیار ہو گئے۔

اور آخری مثال یہ ہے کہ ایک دن شعبہ کے ساتھیوں نے مجھ سے بار بار کہا کہ کل رات کو آپ ہم سب لوگوں کی دعوت کریں۔ میں ان سے وعدہ کر رہا تھا۔ اتنے میں ہماری ایک مرید ساتھی ڈاکٹر مسعودہ حاکم آ گئی۔ پہلے تو وہ میری شاگرد رہ چکی تھی اس کے بعد اسکول سے ہی اپنے پی ایچ ڈی کر کے شعبہ میں ملازم ہو گئی تھی۔ اس لڑکی کی انتہائی اچھی خصلت تھی اور دیکھنے میں بھی خوبصورت تھی جب اس کو معلوم ہوا کہ سب لوگوں کے اصرار پر بھی میں دعوت دینے پر تیار نہیں ہو رہا ہوں تو اس نے کہا کہ شبیر صاحب اب میرے کہنے پر آپ دعوت کریں۔ تو میں نے کہا اچھا مسعودہ چونکہ تم کہتی ہو تو دعوت ضرور کر دوں گا۔ اتنے میں ڈاکٹر صاحب شعبہ میں آ گئے۔ وہ تو اسرائیل پروفیسر تھے اور اکثر وبیشتر آتے رہتے تھے۔ تو یہ صاحب جو دل لگی کی بات کرنے کے عادی تھے۔ انہوں نے یہ پوری داستان ڈاکٹر صاحب کو سنائی اور کہا کہ دیکھئے آپ شبیر صاحب کو سمجھتے ہیں اور ان کی حالت یہ ہے کہ ہم سب کی درخواست کو تو انہوں نے ٹھکرا دیا۔ مگر ایک خوبصورت لڑکی کے کہنے پر فوراً تیار ہو گئے۔ ڈاکٹر صاحب بولے کہ اگر شبیر صاحب لڑکی اور وہ بھی خوبصورت لڑکی کے کہنے پر تیار نہ ہوتے تو ان کے برابر میں کسی اور آدمی کو احمق نہ سمجھتا۔ جب لڑکی دعوت کا مطالبہ کرے تو دعوت ضرور ہونا چاہئے۔ پھر مجھ سے مخاطب ہو کر بولے کہ کیا اس دعوت میں مجھ کو بھی بلایا جائے گا۔ میں نے کہا یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ شعبہ کے سب لوگوں کی دعوت ہو اور اس میں آپ شامل نہ ہوں۔ بولے کھانا ٹھیک آٹھ بجے شام میں ہو۔ اور اس میں اچھا مرغ اور مچھلی تلی ہوئی بھی ضرور ہونا چاہئے چونکہ مجھ کو ذیابیطس ہو چکا ہے۔ ڈاکٹروں نے ہدایت کی ہے کہ کھانا ٹھیک وقت پر ہونا چاہئے اور میں شام کا کھانا آٹھ بجے کھاتا ہوں۔ میں نے کہا یہ تو مجھے پہلے سے معلوم ہے۔ کیونکہ آپ میرے یہاں اس سے پہلے بھی کئی دفعہ کھانا کھا چکے ہیں۔ بولے پھر بھی یاد دلانا ضروری ہے۔ سردی کا مہینہ تھا جس میں اندھیرا جلدی ہو جاتا تھا۔ اب یہ اتفاق کی بات ہے کہ ادھر میں دعوت کی تیاری کر رہا تھا اور ادھر مسعودہ قریب ساڑھے سات بجے میرے پاس روتی ہوئی آئی وہ اتنا رو رہی تھی کہ کوئی بات کرنا مشکل تھی۔ بمشکل تمام میرے تسلی دینے اور اصرار کرنے پر اس نے مجھے بتایا کہ میرے ایک ہی چچا ہیں جو رکون میں رہتے ہیں، وہ آئے ہیں۔ اور چونکہ میرے باپ کا انتقال ہو گیا ہے اس لئے وہ مجھ سے جائداد سے متعلق بہت لڑ رہے ہیں۔ بہت بری بری باتیں کر رہے ہیں اور انہوں نے یہ بھی کہا ہے کہ اگر تو اس وقت کھانا کھانے تو یہ سمجھے کہ تو نے سور کا گوشت کھایا ہے۔ اور اس وجہ سے میں آپ کی دعوت میں جو آپ نے میرے کہنے پر کی ہے نہیں آ سکوں گی۔ وہ چونکہ نیک اور مسلمان لڑکی تھی اور روزہ نماز کی پابند تھی اس لئے ایسی بات سن کر بھی کیا کر سکتی تھی۔ میں نے اسے دلاسہ دیا اور میں نے اس سے کہا کہ بیٹی تم اس بات کی بالکل پرواہ نہ کرو، تم کھانے میں شرکت نہ کر سکو گی تو میں بڑا

ہرگز نہ مانوں گا۔ ذاکر صاحب وقت کے بہت پابند تھے اور ضد کے سبب لوگ ان کی عادت کو جانتے تھے اس لئے سب کے سب مسعودہ کے علاوہ آٹھ سے کچھ دیر پہلے آگئے اور ذاکر صاحب ٹھیک آٹھ بجنے میں پانچ منٹ پہلے تشریف لائے۔ میں نے آٹھ بجے ذاکر صاحب سے درخواست کی کہ آپ کو چونکہ وقت کی پابندی کھانا کھانے میں لازم ہے اس لئے میں نے کھانا میز پر لگوا دیا ہے تاکہ آپ لوگ وقت پر کھانا کھا سکیں۔ بولے یہ دعوت تو مسعودہ کے لئے کی گئی ہے ہم لوگ تو طفیلی کی حیثیت سے بلائے گئے ہیں لہذا مسعودہ کے آنے سے پہلے کھانا شروع نہیں کیا جا سکتا۔ اب آپ لوگ ان کو میری بے وقوفی اور نادانی سے تعبیر کریں یا یہ سوچیں کہ یہ میرا فرض تھا کہ کسی کا راز راز ہی رہنا چاہئے۔ میں نے یہ بات کہا تب یہ سمجھا کہ مسعودہ کسی وجہ سے میرے پاس آکر معذرت کر گئی ہے۔ اب وقت گزرتا گیا۔ میرے لئے ایک منٹ ایک گھنٹہ کے برابر ہو رہا تھا۔ اور بار بار ذاکر صاحب سے درخواست کرتا تھا کہ ڈاکٹر صاحب دیر ہوئی جا رہی ہے آپ کا معدہ بھی کے واسطے یہ تاخیر مناسب نہیں اور اب اگر آپ اجازت دیں تو کھانا گرم کر کے لگوا دیا جائے۔ مگر ذاکر صاحب تھے کہ بضد تھے کہ میں ہرگز کھانا نہ کھاؤں گا جب تک مسعودہ نہ آئے گی دوسرے لوگ اگر کھانا کھانا چاہتے ہیں تو کھانا کھا لیں۔ اب کس کی ہمت تھی کہ کھانا کھا لیتا۔ میرے تو پیروں تلے زمین نکل گئی۔ اور ایسا لگتا تھا کہ کاٹو تو بدن میں خون کا ایک قطرہ نہ نکلے گا۔ مگر ذاکر صاحب تھے کہ ٹس سے مس نہ ہوئے۔ اب یہ میری قسمت دیکھئے کہ کوئی قریب دس بجے دس بجے مسعودہ مسکراتی ہوئی آئی اور سب کو بیٹھے دیکھ کر بولی کہ معافی چاہتی ہوں آنے میں اتنی دیر ہو گئی۔ میں نے تو سوچا تھا کہ آپ لوگ کھانا کھا کر چلے گئے ہوں گے اور میں شبیر صاحب کے یہاں بچا کھچا کھانا کھا لوں گی۔ مگر آپ لوگ تو کھانا کھانے کے بجائے ابھی تک باتیں کر رہے ہیں جب کہ سردی کی راتوں میں تو یہ بہت دیر کا وقت ہے۔ جب لوگوں نے یک دم کہا کہ ہم لوگ آپ کے انتظار میں بیٹھے ہیں اس لئے کہ ذاکر صاحب نے یہ بات ٹھان لی ہے کہ بغیر مسعودہ کے کھانا نہیں کھایا جائے گا۔ مسعودہ سناٹے میں رہ گئی۔ لیکن ذاکر صاحب نے کہا کہ اصل مہمان کے بغیر کھانا کیسے کھایا جا سکتا تھا چاہے پوری رات انتظار میں گذر جاتی۔ پھر سب لوگوں نے خوشی خوشی کھانا کھایا۔ اور کھانے کے بعد بھی ذاکر صاحب دو گھنٹے قریب بیٹھ کر خوش گپیاں کر کے واپس گئے۔ میں نے اللہ تعالیٰ سے ان کی صحت کے لئے دعا کی اور خدا کا شکر ہے کہ میری دعا اس نے قبول کی اور ذاکر صاحب کی صحت اچھی رہی۔

اب آپ لوگ ان کی اس بات اور ضد کو شرافت سے تعبیر کریں یا پٹھانوں جیسی ضد سے۔ میرے خیال سے تو یہ دونوں باتیں ملی جلی ہیں۔

(۴) ذاکر صاحب ایک بہت بڑی ہستی تھے اور پورے ہندوستان میں بہت لوگ نہ صرف ان کے دلوں

میں جنہیں لوگ اپنا آئیڈیل سمجھتے ہیں۔ میں ذاتی طور پر ان کو اپنا آئیڈیل مانتا ہوں۔ لیکن اس بات سے انکار نہیں کیا
جا سکتا کہ ہر چند کہ وہ بہت بڑی شخصیت کے حامل تھے لیکن ساتھ ہی ساتھ وہ انسان بھی تھے۔ انہوں نے مجھ سے کئی
بار کہا کہ تمہارا دشمن زندگی میں یہ چاہے گا کہ تم کو تکلیف پہنچائے اور اپنے کسی قول یا فعل سے وہ تم کو تکلیف میں دیکھنا
چاہے گا۔ لیکن اگر وہ تم کو تکلیف پہنچانا چاہے تو تم اس کو خوش کرنے کی کوشش کیوں نہ کرو۔ تم کو ایسے نیچے لوگوں کی
بد دشمنوں کی جرح اور گندی حرکتوں اور باتوں سے تکلیف نہیں ہونا چاہئے۔ اس لئے کہ وہ ان کی خوشی کا باعث ہوتی
ہیں۔ مگر تم ان کی برائی کرنے کے باوجود خود خوش رہا کرو گے تو اس کو تکلیف ہوگی اور میرے خیال سے تمہارا رد عمل
یہی ہونا چاہئے۔ مگر میں نے کئی دفعہ دیکھا کہ ایسے لوگ جو ڈاکٹر صاحب سے دشمنی رکھتے تھے ان کے غلط کہنے یا
لکھنے سے ڈاکٹر صاحب کو خود تکلیف ہوتی تھی۔ مثال کے طور پر ابھی ان میں ایک بار مجھے خود ایک خط پڑھ کر سنایا
جو اپنے کسی دوست کو نیاگرا فال کے دیکھنے کے بعد اس کی خوبصورتی کے بارے میں لکھا تھا۔ نیاگرا فال اتفاق سے میں
نے بھی دیکھا ہوں۔ بہت ہی خوبصورت اور پرفضا جگہ ہے اور پہاڑ سے جس زور و شور سے پانی گرتا ہے اس کی خوبصورتی
بیان سے باہر ہے۔ اگر اس کو کناڈا کی طرف سے دیکھا جائے تو اور بھی زیادہ خوبصورت ہے۔ ڈاکٹر صاحب نے
بھی اس کو امریکہ اور کناڈا دونوں طرف سے دیکھا تھا۔ ڈاکٹر صاحب غضب کے لکھنے والے تھے۔ نیاگرا فال کی خوبصورتی
اور پر چڑھنے کے بارے میں جب انہوں نے لکھا تو وہم و گمان میں بھی ہو سکتا تھا کہ کوئی شخص اس خوبصورتی کے ساتھ
اس کی عکاسی کر سکتا ہے۔ مگر اس کے بعد فوراً ہی لکھا کہ اگر اس کو عبدالماجد دریابادی کو دیکھنے کو ملتا تو وہ اپنے کسی
مضمون میں بیان کرتے کہ جس زور و شور سے پانی پہاڑ سے گر رہا تھا۔ اس زور و شور سے قیامت کے بعد جہنم کی آگ
ذاکر حسین کے اوپر گرے گی۔ میں نے ڈاکٹر صاحب سے عرض کیا کہ ڈاکٹر صاحب اس کے لکھنے کی کیا ضرورت تھی۔
بولے ان صاحب کو بات بہت ناگوار گذری ہے کہ راج سبھا میں میری نامزدگی ہوئی ہے لہذا اس لئے کہ میرے ساتھ دو
جن لوگوں کی نامزدگی ہوئی ہے اس میں پرتھوی راج کپور بھی ہیں جو بہت بڑے فلمی آرٹسٹ ہیں۔ انہوں نے لکھا ہے کہ
اب ہندوستان کے مسلمانوں کو خوشی کے چراغ جلانا چاہئے اور مٹھائی بانٹنا چاہئے کہ ان کے لیڈر ذاکر حسین کو کنچنیوں
اور گویوں کی فہرست میں شامل کر دیا گیا ہے۔ میں نے ڈاکٹر صاحب سے عرض کیا کہ آپ ایسے لوگوں کے خیالات
سے کیوں متاثر ہوتے ہیں۔ بس ہنس دیا کہ تم نے غالب کے مصرعہ کو سنا نہیں ہے۔ دل ہی تو ہے نہ سنگ و خشت درد سے بھر نہ آئے کیوں۔
تو ظاہر ہے چونکہ خود انسان تھے لہذا جو بات وہ مجھے سمجھانے کی کوشش کرتے تھے اس پر خود بھی عمل نہ کر سکتے تھے۔
لیکن وہ ملک کے تمام علماء دین کو نیچا سمجھتے تھے۔ مثلاً مجھ کو اس کا علم ہے کہ وہ حسین احمد مدنی صاحب کے بہت مداح

مناسب ہو۔ تو طالب علم کو اس کے مناسب درجے کا تعین ہے تو اس کام کو کرنے کے لیے جو پی ایچ ڈی بند کرنا پڑے۔ اس کے کرنے
کا معیار نہیں ہونا چاہیئے۔ ان کے کام کرنے کا جو طریقہ تھا اس کی دو مثالیں میں قارئین کے سامنے پیش کرنا چاہتا ہوں۔

ایک تو یہ کہ میرے ایک طالب علم تھے جن کے متعلق مجھے یقین تھا کہ ان کے اندر کامن سینس کی تو تھوڑی
کمی تھی لیکن پڑھنے لکھنے میں بہت ہوشیار تھے اور محنت کرنے کا جذبہ ان کے اندر بہت تھا۔ ان کی بدقسمتی سے ان کا
ایم۔ ایس سی میں فرسٹ کلاس نہ آسکا۔ جب ایک جگہ لیکچرر کی تقرری خالی ہوئی تو میں نے ڈاکٹر صاحب سے عرض کیا کہ میرے خیال
میں یہ طالب علم بہت اچھا رہے گا اور پڑھانا بہت اچھا کرے گا۔ اس کا تقرر میں کرانا چاہتا ہوں۔ فرمایا ضرور کرا لو اس میں تامل کی کیا بات
ہے جگہ کا اشتہار کر دیا گیا۔ اب خود درخواستیں آئیں ان میں ہمارے دوستوں کے ایک صاحب ڈاکٹر بنرجی کی بھی درخواست تھی
جنہوں نے کیمبرج یونیورسٹی سے پی۔ ایچ۔ ڈی کیا تھا۔ اس کے بعد یورپ کے کسی ملک میں پڑھ چکے تھے۔ اور درخواست
دیتے وقت دلی اسکول آف اکنامکس میں جو ہاتھ کا ادارہ تھا عارضی طور پر لیکچرر تھے۔

ڈاکٹر صاحب میرے اوپر بہت کرم فرماتے تھے اکثر میرے گھر آکر میرے پاس بیٹھتے جو مجھے وارڈن سے کے
ایک سال کے اندر مل گیا تھا۔ اپنی کار جس سے وہ آتے واپس کروا دیتے تھے تاکہ اطمینان سے باتیں کرسکیں۔ اور
کسی کو پتہ چل جائے کہ وہ میرے یہاں ہیں۔ اگر دوپہر یا شام کے کھانے کا وقت بیچ میں آگیا تو جو بھی دال دلیا میرے
گھر میں پکا ہوتا اس کو میرے ساتھ کھا لیتے تھے۔ تو اسی قسم کی ایک ملاقات میں میں نے ڈاکٹر صاحب سے عرض کیا کہ جس
جگہ ہم صاحب طالب علم کا تقرر کراتا تھا اس کے لئے ڈاکٹر بنرجی جیسے امیدوار کی درخواست بھی آگئی ہے کہنے لگے
یہ تو بہت آسان ہے مجھے معلوم ہے کہ تم کو ڈاکٹر وی۔ کے۔ آر۔ وی راؤ جو دلی اسکول کے ڈائرکٹر ہیں بہت چاہتے ہیں
اور تمہاری عزت کرتے ہیں۔ ایک دن فرصت پاکر دلی چلے جاؤ اور ڈاکٹر راؤ سے ملو۔ وہ یقیناً تم کو اپنے دوسرے
ساتھیوں سے ملوادیں گے تو وہاں زیادہ تر لوگ جب چائے پی رہے ہوں تو یوں ہی ضمنی طور پر کہہ دینا کہ ہمارے یہاں
جو لیکچرر کی جگہ خالی ہے اور جس کا اشتہار ہو چکا ہے اس پر ایک بہت ہی لائق آدمی پہلے سے کام کر رہے ہیں لہذا کسی اور
کے لینے کا تو سوال ہی نہیں۔ ڈاکٹر بنرجی تک یہ خبر کسی نہ کسی طرح پہنچ جائے گی اور وہ خود ہی انٹرویو میں نہیں آئیں گے۔ میں
نے ایسا ہی کیا اور اپنے شعبہ کے ایک اور ساتھی کو لے کر دلی اسکول گیا۔ ڈاکٹر راؤ مجھے دیکھتے ہی بڑی محبت سے ملے۔ اور
اپنے دوسرے ساتھیوں کے پاس لے گئے جو کامن روم میں بیٹھے تھے۔ چائے منگوائی گئی۔ سب سے میرا تعارف کرایا اور
ڈاکٹر راؤ نے میرے متعلق کہا کہ یہ وہی صاحب ہیں جن کے مقالہ کو یہاں میں ٹرونڈھم سے لایا تھا اور آپ لوگوں
کو دکھلا کر بتایا تھا کہ کام اس معیار کا ہونا چاہیئے۔ میں نے ان کو دلی اسکول میں آکر ملازمت کرنے کی دعوت بھی

دی۔ لیکن ان کی علی گڑھ سے دلچسپی اتنی ہے کہ وہ چھوڑنا ہی نہیں چاہتے۔ ڈاکٹر راؤ بڑے دبدبے کے آدمی تھے۔ ان کے سامنے ان کے کسی ساتھی کو بات کرنے کی ہمت ہی نہ ہو سکتی تھی۔ میں نے جاتے جاتے باتوں باتوں میں یہ بات اس طریقہ سے کہہ دی جیسے مجھ سے ذاکر صاحب نے کہی تھی۔ تھوڑی دیر اور بیٹھا۔ معاشیات کے بعض مسائل پر بات چیت ہوئی۔ اس کے بعد میں اور میرے ساتھی علی گڑھ واپس آ گئے۔

اب جس دن انٹرویو ہوا تو میں نے دیکھا کہ ڈاکٹر سنہ جی تو اس بات کے سننے کے باوجود بھی آ گئے۔ ذاکر صاحب سے میں نے چپکے سے یہ بات عرض کر دی۔ اب ذاکر صاحب کی شخصیت ایسی تھی کہ ان کے متعلق کسی معاملہ میں کسی کو کوئی غلط فہمی ہو ہی نہیں سکتی تھی۔ انٹرویو سے پہلے مجھ سے کہا کہ مجھے تم سے ایک ضروری بات کرنا ہے۔ شاید انٹرویو کے بعد بھول جاؤں۔ ذرا دوسرے کمرے میں آ جاؤ تو بات کر لوں۔ میں ان کے ساتھ گیا تو کہنے لگے کہ آج کا انٹرویو تو یقینی اچھا ہوگا تم اس سے کوئی سوال نہ کرنا بس آخر میں صرف ایک سوال یہ کرنا کہ آپ تو بہت لائق آدمی ہیں۔ کیا آپ گریڈ کی ابتدائی تنخواہ پر آنے کے لئے تیار ہیں۔ یا تنخواہ میں کچھ اضافہ چاہتے ہیں۔ وہ یقیناً اضافہ کا مطالبہ کریں گے۔ اس کے بعد میں دیکھ لوں گا۔

میں نے ذاکر صاحب کے حکم کے مطابق سلکشن کمیٹی میں ڈاکٹر سنہ جی سے کوئی سوال نہیں کیا۔ اور آخر میں وہ سوال کیا جس کی ہدایت ذاکر صاحب نے کی تھی۔ سنہ جی صاحب میرا سوال سن کر جیسا کہ مجھ سے بہت خوش ہوئے۔ اور ساتھ ہی مزید اضافوں کا تقاضہ کر بیٹھے۔ ان بیچاروں کو کیا معلوم تھا کہ یہ کس وجہ سے کہا گیا تھا۔ اس کے بعد انٹرویو دوسرے لوگوں کے چلتے رہے۔ آخر میں ذاکر صاحب نے انٹرویو ختم ہونے کے بعد بغیر کسی سے کچھ پوچھے ہوئے کہا کہ ڈاکٹر سنہ جی سب سے لائق نظر آتے ہیں لیکن افسوس یہ ہے کہ انہوں نے مزید اضافوں کا مطالبہ کیا ہے جبکہ ایگزیکٹو کاؤنسل نہیں مانے گی لہذا ان کو لینا بیکار ہے۔ ان کے بعد بہترین آدمی ہماری یونیورسٹی کے طالب علم ہیں جو پہلے سے عارضی کام کر رہے ہیں لہذا ان کا تقرر کر دیا جائے۔ سب لوگوں نے یہی تسلیم کیا اور ان کا تقرر ہو گیا۔ مجھے ایسے طالب علم اور ساتھی سے جو امیدیں وابستہ تھیں نہ صرف انہوں نے پوری کیں بلکہ اس سے زیادہ کیا۔ جب وہ ہالینڈ تعلیم کے لئے گئے اور انہوں نے پروفیسر ٹنبرگن کے ساتھ ریسرچ کیا جن کو بعد میں پہلا معاشیات کا نوبل پرائز ملا تو ان کو میرے ساتھی کا کام اتنا زیادہ پسند آیا کہ ان کو اپنے انسٹی ٹیوٹ کے بہترین کاموں میں شامل کیا اور اپنے یہاں چھپوایا۔ اس کے بعد انہوں نے دنیا کے کئی ایک بہترین معاشیات کے جرنلز میں مضامین لکھے۔ لیکن افسوس کی بات یہ ہے کہ وہ بڑے آدمی بن کر ہمارے یہاں کام نہ کر سکے اور آج کل امریکہ کی ایک یونیورسٹی میں پروفیسر ہیں۔

دوسری مثال ذاکر صاحب کے کام کرنے کے طریقہ کی یہ ہے کہ ایک مرتبہ میں نے ان سے عرض کیا کہ میرے

ایک ساتھی جو عارضی طور پر کام بھی کر رہے ہیں مگر ایم اے اول درجہ میں کامیاب ہوتے رہے ہیں، بہت اچھے معلوم ہوتے ہیں
اس لئے میں ان کا مستقل تقرر کرنا چاہتا ہوں۔ لیکن ان کی کمزوری یہ ہے کہ وہ انٹرویو کمیٹی کے سامنے بہت پریشان ہو جاتے
ہیں اور ان کسی بھی سوال کا جواب نہ دے سکیں گے۔ کہنے لگے اگر تم ان کو اچھا سمجھتے ہو تو ضرور تقرر کرو۔ میں نے عرض کیا کہ
یہ کام نہایت مشکل ہے اس لئے کہ وہ انٹرویو نباہ نہ کر پائیں گے۔ تو کہنے لگے ایسا کرو کہ ایکسپرٹ کسی شعبہ ریڈر کو رکھو۔ اور ان
کو یہ ہدایت کر دو کہ وائس چانسلر صاحب نے آپ کو انٹرویو کمیٹی کے لئے تھوڑے سے ہی بلایا ہے ان کو تو شعبہ کے لئے کسی اچھے
آدمی کو رکھنے کی خواہش ہے اور وہ یہ دیکھنا چاہیں گے کہ آپ کو یہاں پر جو لوگ عارضی کام کر رہے ہیں ان سے
کتنی ہمدردی ہے۔ جو سوالات ایک فہرست ہے ساتھی سے بات چیت کر کے بنوا لو اور ان کے جوابات کے
لئے ان کو ہدایت کر دو کہ اچھی طرح تیار کر لیں۔ ان سوالات کی کئی کاپیاں ٹائپ کروا لو اور ایکسپرٹ کو اپنے ساتھی
کو سب کو دے دو اور خود بھی رکھو۔ تم لوگوں کے لئے بہتر ہوگا اور کوئی مشکل کام بھی نہیں کہ سب سوالات
یاد کر لو۔ تمہارے ساتھی سے وہی سوالات کئے جائیں گے تب تو ان کا انٹرویو اچھا ہو ہی جائے گا۔ چنانچہ ایسا
ایکسپرٹ صاحب سے میں آ گیا۔ اس نے سوالات یاد کر لئے میں نے بھی یاد کر لئے۔ ڈاکٹر صاحب نے ٹائپ کیا ہوا
کاغذ انٹرویو کے وقت اپنے سامنے رکھ لیا اور اس میں سے پڑھ پڑھ کر سوالات کر رہے تھے۔ ظاہر ہے ہم لوگ
زبانی یاد کر چکے تھے اس لئے اپنی ساتھی سے وہی سوالات کر رہے تھے اور وہ خوب اچھی طرح سے جوابات دے
رہے تھے۔ پھر ڈاکٹر صاحب نے ایک ایک انٹرویو کمیٹی کے سب لوگوں کے سامنے کہہ دیا کہ آپ لوگوں کو شاید یہ تو
معلوم ہی ہوگا کہ میری اعلیٰ تعلیم معاشیات ہی میں ہوئی ہے اور میں نے پی ایچ ڈی بھی معاشیات میں کیا تھا لیکن
اب اس کو بہت دن ہو گئے اور معاشیات کو چھوڑ کر تعلیمات میں پڑ گیا۔ اس لئے یادداشت کے لئے کچھ سوالات نکال کر
ٹائپ کروا کے رکھ لئے ہیں۔ ان کی شخصیت اتنی ساری عمر کم تھی کہ کوئی سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ وہ غلط بات کہہ رہے
ہیں اور اس طرح میرے ساتھی کا انٹرویو اچھا ہو گیا اور ان کا تقرر مستقل ہو گیا۔ آگے چل کر انہوں نے وظیفہ حاصل کر کے
امریکہ کی ایک بہت اچھی یونیورسٹی سے ایم اے اور پی ایچ ڈی کیا۔ لیکن افسوس یہ ہے کہ وہ اپنے گھر کے حالات
کی بنا پر جو بہت ساز گار نہ تھے، کوئی مزید کام نہ کر سکے۔

شاید آپ نے اب یہ سمجھ لیا ہوگا کہ ڈاکٹر صاحب کا خیال یہ تھا کہ کام کرنے کا مقصد اچھا ہونا چاہئے، اس
کے لئے طریقہ کوئی بھی اپنانا پڑے۔ ان کی خوش قسمتی تھی کہ ان کی بڑی شخصیت کے تحت ان کے متعلق کسی کو غلط فہمی
کا امکان ہو ہی نہیں سکتا تھا۔ ان کا کہنا تھا کہ جب بھی کوئی قابل نوجوان مرد یا عورت ملے اس کا کسی طرح شعبہ میں

تقرر کرو اور ہاتھ سے جانے نہ دو۔ اسی عہدے کے تحت انہوں نے مسعودہ کا تقرر کیا تھا۔ جن کا ذکر میں بیشتر کر چکا ہوں اور
اسی عہدے کے تحت انہوں نے ایک دوسری خاتون جن کا نام سیدہ کشور علی نواز تھا (جنہوں نے عثمانیہ یونیورسٹی سے ایم اے
کیا تھا اور شروع سے آخر تک فرسٹ ڈویژن میں پاس ہوتی رہی تھیں) جب ان کی درخواست ڈاکٹر صاحب کے پاس
آئی تو مجھے بلا کر تاکید کی کہ فوراً تقرر کر لو۔ جس وقت ڈاکٹر صاحب نے مجھے ہدایت کی کہ ان کا تقرر کر دینا ہے اس
وقت شعبہ میں صرف عارضی جگہ تھی میں نے ڈاکٹر صاحب کو بتایا تو کہنے لگے بعد میں ایک دو جگہیں اور پیدا ہو جائیں گی
یونیورسٹی میں روپیہ کی کمی نہیں ہوتی اچھے آدمیوں کی کمی ہوتی ہے

ان خاتون میں ایک خاص بات یہ تھی کہ اپنی علمی قابلیت کے علاوہ بات چیت میں بہت تیز واقع ہوئی
تھیں اور اکثر اوقات بڑے سے بڑے آدمی سے سختی سے بات کرنے میں ان کو تامل نہ ہوتا تھا۔ ایک دن انہوں نے مجھ سے
کہا کہ میں نے آپ کے وائس چانسلر ڈاکٹر ذاکر حسین کا نام بہت سنا ہے وہ خود عالم اور بڑے علم دوست ہیں ان سے میں
ملنا چاہتی ہوں کہ میں نے ڈاکٹر صاحب کے پی اے سے ان کے لئے وقت کا تعین کرا لیا کہنے لگیں مجھے بات سمجھا دیں ان کو
لے کر ڈاکٹر صاحب کے پاس گیا۔ ڈاکٹر صاحب نے مجھے بھی بٹھا لیا ان کو غلط فہمی تھی کہ وہ خاتون ان کے ایک دوست
علی نواز جنگ کی بیٹی تھیں کہنے لگے تم سے مل کر بہت خوشی ہوئی اور اچھا ہوا کہ تمہارا تقرر یہاں بر معلمی حیثیت سے
یونیورسٹی میں ہو گیا اس لئے کہ تم میرے دوست کی بیٹی ہو۔ انہوں نے ڈاکٹر صاحب کو جواب دیا کہ مجھے آپ سے مل کر
بہت افسوس ہوا میرا خیال تھا کہ آپ بڑے آدمی ہیں اور میری خوش قسمتی ہے کہ میری علمی قابلیت سے آپ کی قدر کریں گے
لیکن مجھے یہ معلوم نہ تھا کہ آپ کے خیالات اس قدر گرے ہوئے ہیں اور آپ اس بات سے خوش ہیں کہ میں آپ کے ایک
دوست کی بیٹی ہوں۔ میں آپ کی معلومات کے لئے بتا دوں کہ میرے والد مرحوم کا علی نواز جنگ صاحب سے کوئی تعلق
نہیں ہے یہ سب باتیں وہ محترمہ ایک ہی سانس میں کہہ گئیں۔ ڈاکٹر صاحب بڑے آدمی تھے وہ بات کو برداشت کر گئے
اور کہا کہ دیکھو بیٹی اگر تمہارے اندر علمی قابلیت نہ ہوتی تو تمہارا تقرر یہاں ہو ہی نہیں سکتا تھا۔ لیکن مجھے مزید خوشی اس بات
سے تھی کہ تم میرے ایک دوست کی بیٹی ہو اگر تمہارا ان سے کوئی تعلق نہیں تو کوئی حرج نہیں ہے میں خوش ہوں کہ
ایک ایسی قابل خاتون کا ہماری یونیورسٹی میں تقرر ہو گیا۔ انہوں نے جاتے ہوئے معافی مانگی اور بہت خفت اور ندامت سے بات
کرتے رہے میں سمجھتا ہوں یہ ڈاکٹر صاحب کی بڑائی کی ایک بڑی دلیل تھی ورنہ ہم لوگ ایسے ہوتے ہیں جو ایسے موقعوں پر انتقامی
کی اسی وقت ٹھان لیتے۔ پروفیسر احمد میرٹھی [illegible] کے متعلق آپ کو [illegible] بتا دوں
ڈاکٹر صاحب کی یہ بے حد خواہش تھی کہ کسی بہت قابل اور معمر آدمی کا شعبہ معاشیات میں پروفیسر کی حیثیت سے تقرر کیا

جائے۔ انہوں نے متعدد لوگوں سے جن میں کلکتہ کے پروفیسر گھوش، مدھیہ پردیش کے ایل۔ سی۔ جین۔ لندن کے پروفیسر گلیان جید
اور ڈاکٹروں میں جنگنول سبا راشاہ کے بیدفصیلیں۔ آرشناؤ جگلیر کے پروفیسر ڈی سوزا اور ڈاکٹر ہال ہم پیپرین
سے بات چیت کی، بہر صورت قریب قریب معاملہ طے پا جاتا لیکن آخر میں کسی نہ کسی وجہ سے ختم ہو جاتا تھا۔ پروفیسر ڈی۔ آر
شناؤ کا معاملہ تو اس حد تک بڑھا کہ وہ علی گڑھ آئے۔ ڈاکٹر صاحب، پروفیسر شناؤ اور میں نے مل کر کھانا کھایا۔ ان کے
لئے جس مکان کو انہوں نے پسند کیا اس کی مرمت اور آرائش شروع ہو گئی مزید برآں شعبہ کے لوگوں سے ملاقات بھی ہو گئی اور یہ بھی
طے ہو گیا کہ کون کیا کام کرے گا۔ اور آپ اور دوسرے لوگوں کے پڑھانے کے مضامین کی بنیاد پر ٹائم ٹیبل بھی بن گیا۔ لیکن
احمد آباد جا کر انکار لکھ کر بھیج دیا۔ میں بہت پریشان ہوا اور ڈاکٹر صاحب سے عرض کیا کہ ڈاکٹر صاحب اب تو ہر طرف سے
ناامیدی ہی ناامیدی نظر آتی ہے۔ اور میری خواہش ہے کہ شعبہ کی قیادت کے لئے کوئی مشہور ماہر معاشیات آ جائے
جان برادل رکھنے کے لئے ڈاکٹر صاحب نے جواب دیا کہ تم کس سے کم ہو؟ اگر تم عمر میں دراز زیادہ ہوتے۔ ابھی داڑھی رکھ کر
چھ مہینوں میں بڑھا لو تاکہ عمر میں دراز زیادہ لگنے لگو تو میں تم کو پروفیسر بنا دوں گا۔ میں نے عرض کیا کہ ڈاکٹر صاحب میں اپنی حیثیت
اچھی طرح جانتا ہوں اور میں یقین و وثوق کے ساتھ کہہ سکتا ہوں کہ میں اس پوزیشن کے قابل نہیں ہوں

تب لوگوں میں سے بہتر کو اس بات کا علم ہو گا کہ علی گڑھ مسلم یونیورسٹی میں کم از کم ملک کی آزادی کے بعد سے،
ایک کمیونسٹوں کا گروپ رہا ہے جو بہت مستحکم ہوا اور مضبوط ہے۔ وہ لوگ اس فکر میں تھے کہ لکھنؤ یونیورسٹی کے
پروفیسر ڈی۔ پی۔ مکرجی صاحب جو مارکسی خیالات کے تھے، کو یہاں پر پروفیسر بنا کر بلایا جائے۔ ملحوظ خاطر رہے کہ
ڈاکٹر صاحب کو کمیونسٹوں سے کوئی نفرت نہ تھی۔ وہ اس خیال کے حامی تھے کہ یونیورسٹی ایسی جگہ ہوتی ہے جہاں مختلف
خیال اور مختلف آئیڈیالوجی کے لوگ جمع ہوں جن کے مختلف النوع خیالات اور علمی تصادم سے نئے نئے نظریات
قائم ہوتے ہیں۔ اتفاق کی بات، پروفیسر ڈی پی مکرجی صاحب کو یہاں کے کمیونسٹ گروپ کے کہنے پر یونیورسٹی
میں ایک تقریر کے لئے بلایا گیا۔ مجھے خوب اچھی طرح یاد ہے کہ اس کی صدارت ڈاکٹر صاحب نے خود کی۔ اور جلسہ اسٹریچی
ہال میں جو اس وقت یونیورسٹی میں سب سے بڑا ہال تھا منعقد کیا گیا۔ پروفیسر مکرجی نے جس موضوع پر لکچر دیا وہ
تھا: کیا معاشیات اپنے مقصد میں کامیاب ہوئی یا ناکام؟ انہوں نے جانے (جس کے متعلق میں یقین سے نہیں کہہ
سکتا اس لئے کہ میری ذہانت اتنی نہ تھی) کچھ غلط حوالے اپنے لکچر میں دیئے۔ بولتے وہ غضب کے تھے۔ ایک سماں بندھ
گیا۔ سب حاضرین جلسہ نے ان کی تعریف میں بار بار تالیاں بجائیں لیکن ڈاکٹر صاحب تھے کہ ان کی طرف سے ناخوش
ہو گئے۔ تقریر ختم ہونے کے وقت ہو چکا تھا۔ تقریر کے بعد جب ڈاکٹر صاحب جانے لگے تو میں نے ان سے عرض کیا کہ میں

پروفیسر کرجی صاحب کو میں انکنس سوسائٹی میں تقریر کے لئے دعوت دے رہا ہوں۔ آپ اس میں تشریف لائیے۔
بہت جھلا کر کہا کہ کیا تم سمجھتے ہو کہ میرے پاس اس سے زیادہ وقت ضائع کرنے کو ہے۔ منع کر چکا۔ اب وہ صاحب تشریف لے گئے۔

جب میں ہر طرف سے مایوس ہو گیا تو ڈاکٹر صاحب کی خدمت میں حاضر ہو کر عرض کیا کہ ڈاکٹر صاحب پروفیسر کرجی ہمارے کام کے آدمی ہیں۔ ملک کے ماہرین معاشیات میں سے ایک یہ بھی ہیں اور لیکچر بہت اچھا دیتے ہیں۔ میری درخواست یہ ہے کہ آپ ان کو بلا لیں۔ کہنے لگے۔ اس شخص کو معاشیات بالکل نہیں آتی وہ تو سماجیات جانتا ہے اور وہ بھی کچی کچی۔ لیکن تم بضد ہو تو میں دعوت نامہ ان کے پاس بھیج دوں گا حالانکہ میری ذاتی طور پر طبیعت نہیں چاہتی۔ میں نے کہا کہ بے حد ممنون ہوں کہ آپ نے میری درخواست قبول کر لی۔ ایک ہفتہ کے بعد انہوں نے مجھے بلایا اور کہا کہ وہ معاملہ بھی ختم ہو گیا۔ میں نے پوچھا کیا پروفیسر کرجی نے معذرت کر لی۔ فرمایا نہیں۔ مگر میں نے ان کو تین سال کے لئے بلایا تھا۔ انہوں نے جواب میں لکھا ہے کہ میری عمر اس وقت ۵۸ سال کی ہے۔ دو سال تو میں اپنی یونیورسٹی میں ملازمت کر سکتا ہوں۔ صرف ایک سال کے لئے میں اپنا سب سامان اور خاندان کو منتقل کر دوں تو اس کے تو کوئی معنی نہیں۔ انہوں نے لکھا ہے اگر آپ میرا تقرر پانچ سال کے لئے کریں تو میں آنے کے لئے تیار ہوں۔ میں نے عرض کیا کہ ڈاکٹر صاحب جس آدمی کا تین سال کے لئے تقرر کیا جا سکتا ہے اس کا تقرر پانچ سال کے لئے بھی ہو سکتا ہے۔ آپ اللہ کا نام لے کر ان کو پانچ سال کے لئے بلا لیجئے۔ بولے تم بہت ضدی آدمی ہو۔ تم کو معلوم نہیں ہے کہ میری وائس چانسلری کے اس یونیورسٹی میں صرف چار سال رہ گئے ہیں۔ میں چاہتا ہوں کہ تین سال کے بعد پروفیسر کرجی چلے جائیں اور اس کے بعد ایک سال کے اندر اندر میں تمہارا تقرر پروفیسر کی حیثیت سے کر کے جاؤں۔ میں نے بہت معافی کے ساتھ عرض کیا کہ ڈاکٹر صاحب، میرے لئے اس سے زیادہ خوش قسمتی کی اور کوئی بات نہیں ہے کہ آپ میرے متعلق ایسا خیال رکھتے ہیں۔ لیکن یہ کام تو صرف اللہ تعالیٰ کے کرنے کا ہے۔ اگر اس کو منظور ہوگا تو میں آپ کے جانے کے بعد بھی پروفیسر ہو سکتا ہوں اور اگر اسے منظور نہ ہوگا تو میں آپ کے ہوتے ہوئے بھی نہ ہو پاؤں گا۔ کہنے لگے یہ تو ٹھیک کہتے ہو لیکن یونیورسٹی کی ایسی خدمت کم از کم علی گڑھ میں تو مجھے دیکھنے میں نہیں آئی۔ میں ان کو پانچ سال کی دعوت دے دوں گا گو میں پھر بھی کہتا ہوں کہ میرا دل اس کو نہیں کہتا ہے۔ لیکن اس بات کی تاکید میں تم کو کرتا ہوں کہ شعبہ کی قیادت تم ہی کو کرنا ہوگی اور وہ شعبہ کو بہتر نہیں چلا سکتے۔ میں نے عرض کیا کہ آپ جیسا حکم دے رہے ہیں تعمیل کروں گا۔ مگر شعبہ کی شہرت کے لئے ان کو بلا لیجئے۔ غرض ڈاکٹر صاحب نے پانچ سال کی دعوت پروفیسر کرجی کو دے دی جس کو انہوں نے فوراً ہی منظور کر لیا۔ ہم لوگوں نے ان کے تشریف لانے پر ان کے مرتبہ کے مطابق استقبال کیا۔

اس زمانہ میں یہاں پر یہ روایت تھی کہ پروفیسر کو اپنے تقرر کے بعد ایک افتتاحی خطبہ عام مجمع میں دینا ہوتا تھا۔

کرتے ہیں تو میری سمجھ میں یہ نہیں آتا کہ علی گڑھ مسلم یونیورسٹی میں یہ کام کیوں نہیں ہو سکتا جبکہ اس درسگاہ کے بانی نے اس یونیورسٹی کا خاکہ ان ہی یونیورسٹیوں کے نقشے پر تیار کیا تھا۔

آج جب سوچتا ہوں تو احساس ہوتا ہے کہ کیا شخصیت تھی ڈاکٹر صاحب کی کہ وہ ان لوگوں کی ضرورت سے زیادہ بہت افزائی کرتے تھے اور اگر ان میں سے کسی کی قابلیت کا یقین ہو جاتا تو اس کی حد درجہ عزت کرتے تھے میں آپ لوگوں کو یہ بتا دوں کہ پروفیسر کرجی کے حلقے کے اندر مجھے کمتری کا احساس ہوتا تھا کیونکہ مجھے صحیح طور پر علم تھا کہ یہ کمزوری کہاں ہے۔ میں نے مستقل پڑھنے لکھنے نوٹس بنانے اور کتاب لکھنے میں لگی۔ کتاب کا موضوع تہذیب کے اصول ترقی تھا۔ اس میں تحقیق اس بات کی کی گئی تھی کہ تہذیب کے خیالات کو کن لوگوں نے متاثر کیا اور اس میں مارکس، اینگلز اور ان لوگوں کے جو کینس کے خیالات کے حامی تھے اور جنہوں نے ان کے اصولوں کی بنا پر اصول ترقی کی بنیاد رکھی تھی، کے خیالات کا گہرے طور پر جائزہ اور موازنہ کیا گیا تھا۔ کتاب کے دو حصے تھے۔ ایک موجودہ اصول ترقی کینس کے خیالات کے مطابق اور دوسرا مارکس کے اصول ترقی پر۔ یہ سب کام میں نے بہت جلد ختم کر لیا۔ اور جب کتاب کا آخری مسودہ تیار ہو گیا تو میں اس کی ایک ٹائپ کاپی ڈاکٹر صاحب کے پاس لے گیا اور ان سے اس کتاب کو ان کے نام انتساب کرنے کی اجازت مانگی۔ انہوں نے فرمایا کہ اس کتاب کا مسودہ چھوڑ جاؤ اس کو میں دیکھوں گا۔ کچھ دن کے بعد بلایا اور کہا کہ مجھے تمہاری کتاب اچھی لگی۔ کاش کہ کوئی ایسی ہی کتاب ورنر زومبارٹ پر بھی لکھتا۔ ورنر زومبارٹ جرمنی میں ان کے استاد رہ چکے تھے اور ڈاکٹر صاحب ان سے بہت متاثر تھے۔ میں نے ان سے عرض کیا کہ ان کا کام تو صرف دو چھوٹی کتابوں کے علاوہ (جن کا ترجمہ انگریزی میں ہو گیا ہے) سب کا سب جرمن زبان میں ہے اس لئے میں شاید ہی کام کو آپ کی خواہش کے مطابق انجام دے سکوں گا۔ اس لئے کہ مجھ کو جرمن زبان بالکل نہیں آتی۔ اور اگر میں نے اب اس بات کی کوشش کی کہ جرمن زبان کو سیکھوں اور اس کے بعد ورنر زومبارٹ پر کام کروں تو مجھے شبہ ہے کہ اس کام کو اس معیار پر بھی پورا کر سکوں گا جس معیار کی موجودہ کتاب ہے۔ کہنے لگے نہیں یہ کتاب تو بہت اچھی ہے۔ اور تم میرے نام انتساب کر دو تو مجھے خوشی ہوگی۔ لیکن تاکید کی کہ اس کی انگریزی زبان کسی سے درست کروا لو۔ اگرچہ تمہاری انگریزی اچھی ہوتی تو شاید یہ کام خود کو ہم دیتا۔ دراصل زبان کو درست کروانا اس لئے ضروری ہے کہ مجھے یقین ہے کہ ہمارے ملک میں اصول معاشیات جاننے والے بہت کم ہیں۔ ان کی سمجھ میں کتاب کا موضوع تو صحیح طور پر آ سکے گا۔ اور چونکہ کوئی کسی نہ کسی تعریف میں جانا تو چاہے گا مگر انگریزی زبان کی غلطیاں ہوں گی ان کا تذکرہ کر کے خوش ہوگا۔ اس سے زیادہ انگریزی کی غلطیاں نکالے گا۔ مزید فرمایا کہ آج کل کے سائنس کے دور میں کس کے پاس اتنا وقت ہے جو تمہاری جیسی کتاب کے

یہی احساس رہا کہ وہ سب کو سب سے زیادہ چاہتے تھے۔ اب کس کو کتنا چاہتے تھے اس کا علم تو صرف اللہ تعالیٰ کو تھا یا
ان کو معلوم ہوگا۔ وہ انتہائی ملنسار آدمی تھے۔ جب بھی کوئی ان سے ملنے جاتا بہت خوشگوار باتیں کرتے۔ اور اس کو
چھوڑنے ہمیشہ ڈرائنگ روم کے دروازہ سے باہر آتے۔ چونکہ ان کو ہارٹ اٹیک یہاں آنے کے دو ایک سال
کے بعد ہی ہو گیا تھا اس لئے سائنس گروپ ہی لیکچر تے تھے۔ اساتذہ کی عزت تو کرتے ہی تھے لیکن کلرک اور چپراسیوں
کی عزت بھی اسی طرح کرتے تھے۔ میں نے ان کو اپنے خیالات میں بہت وسیع القلب پایا۔ وہ اپنے سے چھوٹوں کو
صحیح بات بتانے میں دریغ نہیں کرتے تھے۔ اکثر و بیشتر شعبہ معاشیات کے لوگوں کو علی گڑھ سے باہر آگرہ وغیرہ تفریح
کے لئے لے جاتے تھے۔ شعبہ معاشیات سے ان کا گہرا تعلق اس لئے بھی تھا کہ وہ معاشیات کے امریکی پروفیسر بھی
تھے۔ جب وہ باہر تفریح کے لئے جاتے تو ان کے ڈاکٹر بھی ان کے ساتھ ہوتے۔ اس زمانہ میں مجھے انڈے کھانے کا
بہت شوق تھا۔ ڈاکٹر صاحب کھانے کا سب سامان اپنے ساتھ لے جاتے۔ ایک دن ہم لوگ ان کے ساتھ کا
لے جایا ہوا سامان کھا رہے تھے تو میں نے ایک انڈا لینے کے بعد دوسرا لینا چاہا۔ بولے نہیں۔ ابھی نہیں پہلے دوسرے لوگوں
کو لے لینے دو۔ اگر اس کے بعد بھی بچیں تو لے لینا۔ وہ سامان تو اتنا لے جاتے تھے کہ نہ بچنے کا کوئی سوال ہی پیدا نہ ہوتا تھا
لیکن ان کی عادت تھی کہ اپنے سے چھوٹوں کو صحیح بات خود سمجھاتے تھے۔

ایک مرتبہ جب ہم لوگ ڈاکٹر صاحب کے ساتھ آگرہ سے واپس آئے تو علم ہوا کہ امریکہ کے کوئی پروفیسر آئے
ہیں جو اس وقت پاکستان میں مقیم تھے۔ وہاں سے انہوں نے ہندوستان کی گورنمنٹ کو لکھا کہ مجھے علی گڑھ مسلم یونیورسٹی
سے دعوت نامہ آیا ہے۔ لہٰذا میں ہندوستان آنا چاہتا ہوں۔ اور یونیورسٹی کو لکھا کہ مجھے ہندوستان کی گورنمنٹ نے
[illegible]۔ اس لئے یونیورسٹی بھی آنا چاہتا ہوں۔ جب ہم لوگ واپس آئے تو معلوم ہوا کہ وہ یہاں آ چکے ہیں۔ ڈاکٹر صاحب نے
مجھ سے ارشاد کیا کہ میں ان کی دیکھ بھال کروں۔ اللہ جانے کیسے صاحب ہیں خود بخود یہ سب کر گئے ہیں۔ لیکن مہمان کی خاطر
ہر حالت میں ضروری ہے۔ جب ان صاحب کو دعوت میں لے گیا جب ان کے لئے تمام اقسام کے کھانے کا انتظام کیا
گیا تو انہوں نے کہا کہ بغیر پیئے شراب پیئے گا۔ مجھے یاد ہے سنتے تھے مجھ سے ڈاکٹر صاحب نے کہا کہ تم ان صاحب کو
بیچ گھر لے جا کر شراب پلا کر لے آؤ۔ اس کے بعد کھانا کھائیں گے۔ میں نے عرض کیا۔ ڈاکٹر صاحب میں تو شراب پیتا
نہیں ہوں تو ان کو کھانا ہی سے ماؤں گا۔ کہنے لگے تم چل باہر سے لو شراب لے آنا۔ دیکھا میں نے بھی کام کرنا چاہیے
برا اگر شراب نہیں پیتے تو کوئی حرج نہیں۔ لیکن دوسروں کو پلانے کے لئے اپنے پاس رکھا کرو اتنے لئے کہ مہمان کی
خاطر کے لئے یہ بھی کبھی کبھی ضروری ہو جاتا ہے۔

ڈاکٹر صاحب کے اندر میں نے ایک بات خاص طور پر ملاحظہ کی کہ ان کا قیام بہت مستحکم تھا کہ ایک یونیورسٹی کے
اندر رہیں ان ۔ یعنی باغ و بہار گروپ کو روا رکھا ہے۔ جب ڈاکٹر صاحب یہاں گورنر تھے اس وقت یونیورسٹی میں کرنل
لی۔ انگریز یدی وائس چانسلر کے عہدہ پر فائز تھے تو ڈاکٹر صاحب کے تعلقات دوستوں میں سے تھے اور یہ پروفیسر یوسف حسین خاں
صاحب تو ان کے چھوٹے بھائی تھے۔ یونیورسٹی کے پرو وائس چانسلر تھے۔ اس دوران عجیب و غریب حالات پیش
آئے۔ کمیونسٹوں اور ان کے مخالفین میں بہت سخت پارٹی بندی ہو گئی۔ چنانچہ کمیونسٹوں کی تعداد کم تھی لیکن وہ بہت
ہوشیار اور ایک دوسرے سے جڑے رہنے والے لوگ تھے۔ ان کی سرکردگی زیدی صاحب کر رہے تھے۔ اور اینٹی
کمیونسٹوں کی تعداد زیادہ تھی جن میں آپس میں اختلافات بھی تھے لیکن کمیونسٹوں کی مخالفت میں وہ سب ایک
دوسرے کے ساتھ تھے ان کے لیڈر ڈاکٹر یوسف حسین خاں صاحب تھے۔ حالات اس درجہ خراب ہوئے کہ ایسا
معلوم ہوتا تھا کہ یونیورسٹی کی اینٹ سے اینٹ بج جائے گی۔ اب آپ اس کو میری بدقسمتی کہیں یا محض اتفاق کہ
میں پروفیسر یوسف حسین خاں صاحب کی پارٹی میں شامل تھا جو کہ میری عمر کم تھی بے حد پر جوش تھا اور میرے اندر بہت
اہم سے تھا اس لئے وہ لوگ میری پارٹی والے کمیونسٹوں کے خلاف تقریر کرنے کے لئے ہر کمیٹی اور کاؤنسل میں بڑھا دیا کرتے تھے۔
زیادہ تر لوگ اس رنگ میں جب چاپ بیٹھے والے تھے۔ اور سب لوگوں نے طے یہ کر رکھا تھا کہ اگر تقریباً زیادہ
کرتے رہے تو دوسرے کے دل گرما جائیں گے اور کوئی فیصلہ کن بات نہ ہو سکے گی اس لئے میری دھواں دھار تقریر کے
بعد سب لوگ یہ کہہ دیں کہ باتیں دونوں طرف کی سن لی گئیں اور اب فیصلہ ووٹنگ کر کے کر لیا جائے۔ اور ظاہر ہے کہ
چونکہ اس طرف کے لوگوں کی تعداد زیادہ تھی لہٰذا معاملات ہم لوگوں کی خواہش کے مطابق طے ہو جایا کرتے تھے۔ حالات
اس درجہ خراب ہوئے کہ ایک دن وائس چانسلر صاحب نے پرو وائس چانسلر صاحب کو نوٹس دے دیا کہ وہ دو دن
کے اندر اندر یونیورسٹی سے نکل جائیں۔ اور دوسری طرف پرو وائس چانسلر صاحب کے ساتھیوں نے ایگزیکٹو کاؤنسل کے زیادہ تر
ممبران سے دستخط کروا کے یہ نوٹس دے دیا کہ کاؤنسل کی ایک ہنگامی میٹنگ کی جائے جس میں وائس چانسلر صاحب کے
خلاف عدم اعتماد کا فیصلہ لے لیا جائے۔ حالات اس نوعیت کو پہنچ چکے تھے کہ دونوں طرف کے لوگ پریشان تھے
اور دن رات سر جوڑ کر تدابیر اور منصوبے بنانے میں لگے رہتے تھے۔ شاید کوئی ایک آدھ ہی ایسا بچا ہو جس کو پڑھنے
پڑھانے میں دلچسپی رہی ہو۔ اب یوسف حسین خاں صاحب نے مجھے بلایا اور کہا کہ چونکہ ذاکر صاحب تم سے
محبت کرتے ہیں اس لئے تم ان کو یہاں کے متعلق تفصیلی حالات سے آگاہ کر دو۔ اور ان سے درخواست کرو کہ چونکہ
کمیونسٹوں نے بڑا ادھم مچا رکھا ہے اور وائس چانسلر صاحب ان کی سرکردگی کر رہے ہیں تو وہ دخل اندازی کریں۔ میں نے

کوئی دس بارہ صفحوں پر مشتمل بیان کے حالات اور در حقیقت میرے اس وقت کے قیاس سے کیمونسٹوں کے خلاف ہوا ہی کہ
بات جیسا جیسا میں نے لکھا تھا ذاکر صاحب کو لکھ کر ان کی خدمت میں بھیج دیا۔ ذاکر صاحب کی عادت تھی اگر ان کے پاس خط اردو
میں جائے تو اردو میں جواب دیتے تھے اور اگر انگریزی میں جائے تو انگریزی میں۔ ہر چند کہ اردو کے تمام خطوط کو اکثر خود اپنے
ہاتھ سے لکھا کرتے تھے اور اس سے ان کو دوہری پریشانی ہوتی ہوگی چونکہ میرا خط اردو میں لکھا ہوا تھا ان کا جواب بھی خط اردو
میں لکھا ہوا آیا۔ جو کہ بہت مختصر تھا۔ اس میں لکھا تھا "شبیر عزیز دعائیں۔ تمہارا خط ملا۔ حالات سے واقفیت ہوئی
کاش کہ تم اپنی توجہ اپنے شعر کی طرف مبذول کرتے۔ اگر تم اس کو بنا سکو تو تمہارے جیسے ملک میں بہت ہی کم آدمی ہیں گے
فقط مخلص ذاکر حسین" چونکہ میں جانتا تھا کہ ذاکر صاحب بہت مخلص تھے میں ہمیشہ ان کی بات کو صحیح انداز میں سمجھتا
تھا میں ان کا خط دیکھ کر سناٹے میں رہ گیا۔ مجھے کسی قسم کی غلط فہمی نہیں ہوئی۔ اور خیال کیا کہ میں نے بڑی غلطی کی جو سیاست
کی پولیٹکس میں اس قدر انہماک سے حصہ لیا۔

ایک بات مضحکہ خیز سنا دوں، ذاکر صاحب کی میرے اوپر شفقت کا احساس پٹنہ اور لوگوں کے پٹنہ کے
ایک پروفیسر تھے۔ ان کا نام ... تھا جنہوں نے لندن اسکول آف اکنامکس سے پی ایچ ڈی اور ڈی لٹ دونوں ڈگریاں حاصل کی تھیں
آدمی بہت نیک اور مخلص تھے۔ لیکن ان کو پالیٹکس میں داخل ہونے کی اور پٹنہ کی کسی یونیورسٹی میں وائس چانسلر بننے
کی بڑی خواہش تھی۔ وہ مجھے اکثر مختلف کاموں سے پٹنہ بلاتے اور اس بات پر اصرار کرتے تھے کہ میں ذاکر صاحب سے
مل کر ضرور جاؤں۔ اس لئے کہ وہ جانتے تھے کہ اگر میں ذاکر صاحب سے ملوں گا تو وہ مجھے کھانے پر ضرور بلائیں گے اور
اخلاقی طور پر میرے ساتھ میرے میزبان پروفیسر صاحب کو بھی بلائیں گے۔ تو دوسرے دن وہاں کے لوکل اخباروں میں
ان کا نام نکلے گا کہ انہوں نے گورنر کے ساتھ کھانا کھایا اور اس طرح ان کو ذاکر صاحب سے ملنے کا موقع بھی مل جائے گا۔ ان کا
خیال تھا کہ اس طریقے سے وہ اپنے مشن میں کامیاب ہو سکتے ہیں۔ چونکہ وہ شریف آدمی بھی تھے اس لئے مجھے کوئی اعتراض
نہ ہوتا تھا کیونکہ میری وجہ سے ان کی کوئی نیک خواہش پوری ہو جائے۔ ہر چند کہ میں خود ذاتی طور پر اس خیال کا حامی تھا کہ کسی پروفیسر
کو وائس چانسلر بننے کی خواہش کوئی بہت اچھی چیز نہیں ہے۔ میرے خیال میں تو پروفیسر کی ایک شان ہی دوسری ہے
جس کی میں بہت قدر کرتا ہوں۔

ایک مرتبہ پروفیسر صاحب نے مجھے اور اتفاق سے کئی دوسرے پروفیسروں کو بلایا تھا کسی کو پی ایچ ڈی کا امتحان
لینے کے لئے کسی کو سلیکشن کمیٹی میں ایکسپرٹ کی حیثیت سے حصہ لینے کے لئے اور کسی کو بورڈ آف اسٹڈیز میں شامل ہونے
کے لئے۔ تب اتفاق سے اس وقت بھی ذاکر صاحب سے ملنے کے لئے راج بھون میں چلا گیا۔ تو ذاکر صاحب بولے کہ تو

شب کا کھانا بہت سادہ کھاؤ۔ میں نے عرض کیا کہ اب کی مرتبہ تو میرے ساتھ پروفیسروں کا ایک قافلہ ہے۔ اس لئے غالباً
مناسب ہوگا۔ ہم لوگ سب کو ملا دیں گے۔ انہوں نے اپنے سکریٹری کو اشارہ کیا اور ان کو حکم دیا کہ سب کے
نام نوٹ کر لو تاکہ سب لوگوں کو دعوت دے دی جائے۔ سکریٹری نے مجھے علیحدہ لے جاکر ہر شخص کا نام اور اس
کی پوزیشن کے بارے میں پوچھا اور لکھا۔ جب ڈین نے اپنا نام سب سے آخر میں لکھوایا اور کہا یہ پوزیشن سب
سے کم ہے۔ جو فہرست نکلی وہ دلچسپ تھی۔ جس میں سب لوگوں کے نام آگے ان کے چھپے ہوئے نام لگے تھے اور چھپے ہوئے ہو گئے
تھے۔ ڈاکٹر صاحب یہاں کی حیثیت سے میری ایک طرف تھے۔ اور میں سب لوگوں کے آخر میں۔ پروفیسر مرزا کے
یہاں جو لوگ اس بار آئے تھے، میرے علاوہ سب کی کمزوری یہ تھی کہ سب کے سب شراب پیتے تھے۔ اور
پروفیسر مرزا میزبان کی حیثیت سے ان لوگوں کے لئے خاص طور سے اہتمام کرتے تھے۔ اس دن میں نے ان
لوگوں سے خاص طور سے درخواست کی کہ وہ ایسے موقع پر یہ کام نہ کریں۔ اس لئے ان لوگوں نے صاحب کے یہاں کھانے پر
جانے سے پہلے شراب پینا مناسب نہیں لیکن انہوں نے میری ایک بات نہ سنی اور سب کے سب بولے کہ ہمارے
اوپر تو شراب پینے کا کوئی اثر ہی نہیں ہوتا۔ گورنر صاحب کے سامنے ذرا سا پتہ نہ چلے گا کہ ہم لوگ شراب پئے ہوئے
ہیں۔ میرے لئے سوائے درخواست کرنے کے کوئی چارہ نہ تھا اور وہ سب کے سب اپنی عادت سے مجبور تھے کہتے
دنوں کے بعد تو سب لوگ جمع ہوئے ہیں۔ اگر آج بھی نہ بیٹھیں گے تو کب بیٹھیں گے۔ میں سب لوگوں کے سامنے
لاچار ہو گیا۔ اور انجام یہ ہوا کہ جب ہم لوگ راج بھون پہنچے تو ہر شخص شراب کے نشہ میں دھت تھا۔ سب کے
سب زور زور سے قہقہے لگا رہے تھے اور واہی تباہی بک رہے تھے اور میں ڈر رہا تھا کہ ڈاکٹر صاحب کے سامنے دقت
سے سابقہ پڑ رہا تھا۔ کھانے کے بعد ڈاکٹر صاحب لوگوں کو لے کر ڈرائنگ روم میں بیٹھیں گے۔ ظاہر ہے کہ ڈرائنگ روم میں کوئی
پردہ ڈالنے والا نہیں تھا۔ ڈاکٹر صاحب نے مجھے اپنے پاس بٹھا لیا اور کہنے لگے کہ کیا یہ سب تمہارے دوست ہیں۔ میں نے گھبرا کر کہا کہ
جی ہاں تعلقات تو سب ہی سے ہیں۔ پھر فوراً میرے دماغ میں ایک لہر آئی۔ اور میں نے ہمت کر کے کہا کہ ڈاکٹر صاحب
آپ ہی نے فرمایا تھا کہ ہر انسان میں کمزوریاں موجود ہوتی ہیں۔ بس دوست بناتے وقت یہ دیکھنا چاہئے کہ کمزوریاں کم سے
کم ہوں اور اچھائیاں زیادہ سے زیادہ ہوں۔ بہت شفقت سے فرمایا کہ ان کے ہوش آنے کے بعد ان کو سمجھا دینا کہ ایسے موقع
پر ایسی حرکت نہ کیا کریں۔ میں نے کہا ضرور کہوں گا۔ اور سوچا کہ آج تو بس خیریت ہو گئی، ورنہ اس دن ڈاکٹر صاحب ہم سب پر
نہ جانے کتنا ناراض ہو سکتے تھے۔

ایک تو میں اور میری بیوی دونوں پٹنہ گئے۔ پروفیسر مرزا نے جو اس کی کوشش کی کہ ہم لوگوں کو ڈاکٹر صاحب سے

ملنے کا وقت لے جانے۔ لیکن اتفاق دیکھئے کہ جیسے ہی ڈاکٹر صاحب ان دنوں شملہ میں مقیم نہیں۔ وہاں بھی گئے ہوئے تھے۔
پروفیسر میرا ایک بہت اچھا دوست ہے ان کے مزاج کی گرمی ان بات سے ابھی ہو گئے کہ دوسرے دن چونکہ ڈاکٹر صاحب علی گڑھ سے
پہنچ چکے ملاقات والیس آ رہے تھے البتہ اور میری موجودگی کے آگے سے بچ ہو تو وہ بہت ایسی جگہ کھڑا کر دیں گے
جہاں سے ڈاکٹر صاحب ہم لوگوں کو دیکھ لیں۔ ڈاکٹر صاحب بات کرنا چاہیں تو وہ کر لیں گے ... سے ہو سکتا
کے لئے ٹھیک ہے۔ پروفیسر صاحب ہم لوگوں کو ... روک لیا اور دوسرے دن ... کے ساتھ ... کے
کے آگے پیچھے ... پروفیسر صاحب نے وعدہ کے مطابق ہم لوگوں کو ایسی جگہ کھڑا کر دیا جہاں ڈاکٹر صاحب
کا ہوائی جہاز کھڑا تھا جیسے ہی جہاز سے اترے ہم لوگوں کو دیکھ کر بے حد خوش ہوئے۔ بولے یہاں کس طرح ہو بچے
جب سے عرض کیا پروفیسر صاحب کی کار میں آئے ہیں۔ کہنے لگے ان کی کار واپس بھجوا دو اور تم لوگ میرے ساتھ فارم ہاؤس چل کر
میرے مہمان رہو۔ وہاں جا کر تمہارا سامان ابھی یہاں منگوا لیں گے۔ رات بھر ڈاکٹر صاحب نے ہمارے ساتھ ناشتہ کیا۔
پھر دیر تک باتیں کرتے رہے۔ گفتگو ان کی بہت دلچسپ ہوتی تھی۔ بس یہ کہہ لیجئے کہ اگر کوئی دس منٹ ان کے پاس بیٹھ لے
تو ان کا ہی ہو جائے۔ ان کو باغبانی کا خاص طور پر گلابوں کا بہت شوق تھا۔ وہ اپنے باغ کی دیکھ بھال وہ خود کرتے
تھے اور اپنی نگرانی میں مالیوں سے کام کرواتے تھے لے گئے ہم لوگوں کا سامان پروفیسر مجیب صاحب کے یہاں سے
منگوا لیا گیا تھا۔ باغ میں ایک ایک گلاب کے پودے اور ان کے پھولوں کے متعلق باتیں کرتے رہے۔ میں یہ کہنے
میں کبھی تامل نہیں کرتا ہوں کہ میں تو گاؤں میں رہنے والا گنوار ہوں اور میرے گھر کاشتکاری کا کام ہوتا تھا مجھے اتنی اچھی گفتگو
کرنا نہیں آتی ہے۔ لیکن کشور کی پرورش شہر کے اچھے ماحول میں ہوئی اس لئے انہیں باتیں کرنے کا اچھا سلیقہ تھا۔ ایک پھول پر آ کر معلوم
ہوا کہ ڈاکٹر صاحب نے اس کا نام قلوپطرہ رکھا تھا کشور بولیں کہ یہ نام اس پھول پر زیب نہیں دیتا۔ کوئی دوسرا نام اس کے لئے
تجویز کیجئے۔ اب اللہ بہتر جانتا ہے کہ ڈاکٹر صاحب نے ان کا دل رکھنے کے لئے یا ان کی بات سے متاثر ہو کر ان سے اتفاق کیا

اسی دن باتیں کرتے کرتے دوپہر کے کھانے کا وقت آ گیا۔ کھانے کے بعد لعنت سے بچنے آ کر ہم لوگوں کو رخصت
کیا اور ڈرائیور کو ہدایت کی کہ اگر فرنٹیئر میل ایکسپریس جس میں ہم لوگ علی گڑھ واپس آنے والے تھے چھوٹ جائے تو پھر
ان لوگوں کو پہنچ دہلی لے آنا۔ ساتھ ہی ساتھ یہ بھی بتا دینا ضروری ہے کہ وہ ہم لوگوں کے ساتھ۔ باتوں میں اتنے مشغول رہے کہ
دوپہر کے کھانے تک گھر کے اندر بھی نہیں گئے۔

ہم تو اتفاق سے تھے لیکن ڈاکٹر صاحب کی یہ مہربانی تھی کہ گورنر رہے نائب صدر اور اس کے بعد صدر ہوئے لیکن ہم لوگوں
کو کبھی ان سے ملنے کے لئے وقت مانگنے کی ضرورت محسوس نہیں ہوئی جب کچھ دن گذر جاتے تھے تو خود ہی خط لکھتے تھے کہ تم لوگوں سے

لئے ان کے دماغ میں یہ بات بٹھادی ہو اور وہ جس کام کے کرنے کا شوق رکھتے ہیں اس کو وہی کام کرنا چاہیئے۔ کسی پروفیسر کو بھی کوئی کام پہلے
ہی طے نہیں کرنا چاہیئے۔ یہ سن کر مجھے یقین ہوگیا کہ ڈاکٹر صاحب کی تعلیم کتنی اعلیٰ ہیں اور میں کتنا غلط کام کر رہا ہوں۔ میں نے ان سے
معافی مانگی۔ واپسی پر میں کام پر جہاں تو ڈاکٹر گیا وہ جلد از جلد اس کو ختم کیا اس کو ٹائپ وغیرہ کروا یا اور جلد بنوایا!
اس کے فوراً بعد میں کو یونیورسٹی گرانٹ کمیشن کے پاس بھیج دیا۔ اور میں نے ان لوگوں کو لکھا کہ یہ کام میں نے کیا تو ہے
کیونکہ کوئی یہ نہ کہہ سکے کہ میں کام کرنے کا اہل نہیں ہوں لیکن نہ تو میں اس کا کوئی معاوضہ لوں گا اور نہ اس کو چھپوانا چاہتا ہوں اور نہ ہی اس کام کو
میں اپنا کام سمجھوں گا۔

ڈاکٹر صاحب چھوٹی چھوٹی باتیں اتنی خوبصورتی سے سمجھاتے تھے کہ ان کی ہر بات دل میں پیوست ہو جاتی تھی۔ ایک
مرتبہ میں نے ان سے کہا کہ ڈاکٹر صاحب میری طبیعت یہ چاہتی ہے کہ ایک رنگین اور چمکدار شیروانی کچھ جیسی میں اب سے پہلے
بنواؤں اور پہنوں۔ کہنے لگے کیا مضائقہ ہے۔ جیسا تم کام کرنے کی خواہش ہو کرو۔ لباس تو اپنی مرضی کا بنوانا چاہیئے۔ کسی وقت مرضی
سے کپڑے پہنو۔ اگر کسی عمر کو تم پہننے کی وجہ سے پہننے کا حق ہے تو تم کو اس پہنے پسند کرنے کا حق ہے۔ لیکن ایک بات عجیب
جب کوئی شخص اپنی عمر سے خوش نہیں ہوتا۔ بچے جوان ہونا چاہتے ہیں اور کم عمر لگنا چاہتے ہیں۔ جوان بچے لگنا چاہتے ہیں۔ اور بوڑھے
جوان لگنے کی خواہش رکھتے ہیں۔ حالانکہ عمر کے ہر حصے کی اپنی ایک شان ہوتی ہے۔ اور میری سمجھ میں یہ نہیں آتا کہ کوئی انسان اس
شان کے مطابق رہنا کیوں نہیں چاہتا۔ بہر حال اس سلسلے میں ہوا یا کہ اس قسم کا تضاد انسان کے دماغ میں ہمیشہ رہتا ہے۔ مثال کے
طور پر کسی دوسرے دن کو بتانے کا ایک ذریعہ ہوتا ہے۔ اکثر نوجوان ڈائری لکھتے ہیں اور لکھ کر وہ اپنے خیالات کا اظہار
دوسروں سے کرنا چاہتے ہیں۔ ساتھ ہی ساتھ اس ڈائری کو چھپا کر رکھتے ہیں تاکہ اس کو کوئی دیکھ نہ سکے۔ یہ صرف اس وجہ
سے ہوتا ہے کہ اس کے دماغ میں تضاد ہوتا ہے۔ اس قسم کا تضاد قریب قریب ہر شخص کو اس زمانہ میں رہتا ہے۔

ڈاکٹر صاحب ایک مرتبہ ایک صاحب کے متعلق جن کی وہ بہت عزت کرتے تھے، اور دراصل وہ عزت
کرنے کے لائق بھی ہیں اور بعد میں ایک بہت معزز عہدہ پر پہنچے (جن کا نام میں لکھنا نہیں چاہتا) ان کی اپنی محبت کی بنا پر
دوسری شادی کا ذکر کر رہے تھے۔ کہانی تو بڑی لمبی چوڑی ہے اس لئے کہ اس میں ایک داستان سے دوسری اور دوسری سے
تیسری پیدا ہوتی ہے۔ لیکن میں اس وقت یہ عرض صاحب عرض کرنا چاہتا ہوں جو اس سلسلہ میں تنہا ضروری ہے۔ وہ صاحب غیر مسلم
ہیں۔ جن کے یہاں شاید دوسری شادی کی اجازت بھی نہیں ہے۔ ڈاکٹر صاحب نے ان کی اور ان کی محبوبہ دونوں کی بہت اچھی صفات
بیان کیں۔ اتفاق سے میں نے ڈاکٹر صاحب سے پوچھا کہ ڈاکٹر صاحب اکثر یہ دیکھا گیا ہے کہ محبت کی شادیاں عموماً ناکامیاب
ہوتی ہیں۔ کہنے لگے اس کی وجہ تو صاف ہے۔ محبت کرتے وقت لڑکا لڑکی کو دیوی سمجھتا ہے اور لڑکی لڑکے کو دیوتا اور

ہے جو ایک دوسرے سے ملتے ہیں تو ایک دوسرے کے سامنے اپنے کو اسی روپ میں ظاہر کرتے ہیں۔ حالانکہ حقیقت میں لڑکی دیوی کی ہوتی ہے اور نہ لڑکا دیوتا ہوتا ہے دونوں انسان ہوتے ہیں اور دونوں میں کچھ نہ کچھ کمیاں اور کمزوریاں ہوتی ہیں۔ اب یہ دوسری بات ہے کہ کسی میں کم اور کسی میں زیادہ۔ جب شادی ہو جاتی ہے اور ایک دوسرے کے قریب آتے ہیں تو بیوی کو معلوم ہوتا ہے کہ اس کا محبوب تو انسان ہے۔ اور لڑکے کو پتہ چلتا ہے کہ اس کی محبوبہ بھی انسان ہے۔ ایک دوسرے کی کمیاں دونوں کے سامنے آنے لگتی ہیں۔ اور ان کو احساس ہوتا ہے کہ دونوں ایک دوسرے کو دھوکہ دیتے رہے۔ حالانکہ دراصل دھوکہ کوئی کسی کو نہ دیتا تھا۔ بس اس کو غلط طریقے سے سمجھتا تھا۔ جب ان دونوں کی کمیاں اور برائیاں ایک دوسرے پر ظاہر ہوتی ہیں تو دونوں کو ایک دوسرے سے دھوکا لگتا ہے۔ اگر وہ یہ سمجھنے کی کوشش کریں کہ دراصل دونوں انسان ہیں اور دونوں میں خامیاں ہیں تو غلط فہمی بڑھنے کی گنجائش ختم ہو جائے اور ایک دوسرے سے معاملہ کرنے کی کوشش کریں۔ ظلم تو یہی ہے کہ اکثر کہانیاں پکچریں اس جگہ ختم ہو جاتی ہیں جہاں یا تو ہیرو اور ہیروئن کی شادی ہو جاتی ہے۔ یا جہاں ایک دوسرے پر جان دے دیتے ہیں۔ تو اس سے نوجوانوں میں اور بھی زیادہ غلط فہمیاں بڑھتی ہیں۔ اور جب وہ زندگی کو غلط سمجھنے کی کوشش کرتے ہیں۔ کوشش یہ نہیں کرتے بلکہ یہ خیالات اور یہ آئیڈیل ان کے ذہنوں میں اس قدر مستحکم طور سے جم ہو چکے ہوتے ہیں کہ غالباً وہ دوسری باتیں سمجھنے کی اہلیت ہی نہیں رکھتے۔

ڈاکٹر صاحب کے اندر ایک خاص بات یہ تھی کہ وہ برداشت کی بہت عزت کرتے تھے۔ اور کوئی بھی خواہ وہ کسی عزت نہ کرے یا ان کے ساتھ اچھا سلوک نہ کرے اس کو پسند نہ کرتے تھے۔ ایک بار کا ذکر ہے کہ بدرالدین طیب جی جب مسلم یونیورسٹی کے وائس چانسلر ہو کر آئے۔ وہ استادوں سے بہت سختی اور طلباء سے بہت نرمی کا برتاؤ کرتے تھے۔ انہوں نے یونیورسٹی کے کئی معزز اور سینیئر اساتذہ کو ذرا ذرا سی بات پر نکال دیا۔ ایک مرتبہ انہوں نے اطلاع دی کہ وہ شعبہ میں آنا چاہتے ہیں۔ میں نے اپنے ساتھیوں سے کہا کہ وہ اپنی کتابیں یا جو بھی مطبوعات ہوں ان کی کاپیاں رکھیں تاکہ ان کو پیش کر کے وائس چانسلر صاحب کو پیش کیا جا سکے۔ میں نے شعبہ معاشیات کے صدر کی حیثیت سے اپنی اور اپنے ساتھیوں کی مطبوعات ان کے لئے پیش کیں تو انہوں نے بہت تیزی سے جواب دیا کہ ان چیزوں کو ان کو کیوں پیش کیا جا رہا ہے۔ مجھے بات تو عجیب و غریب معلوم ہوئی لیکن میرے اندر قوت برداشت کا مادہ بہت ہے تو میں خاموش رہ گیا۔ یہ بات میں نے خود کبھی ڈاکٹر صاحب سے ذکر نہ کی۔ لیکن کسی نہ کسی طرح ان کو معلوم ہو گئی۔

حسن اتفاق سے بدرالدین طیب جی صاحب نے آتے ہی نوٹس دے دیا تھا کہ کوئی صدر شعبہ بغیر وائس چانسلر سے اجازت لئے ہوئے باہر جا سکتا تھا۔ اور اجازت لیتے وقت اس کو یہ بات بتانے کی ضرورت بھی تھی کہ وہ کس کام

ذاتی طور پر میں سمجھتا ہوں کہ آپ ہر ایک شخص کی عزت کرتے ہیں چاہے وہ چپراسی ہی کیوں نہ ہو۔ کافی ناراضگی کے لہجے میں بولے وہ بات تو اپنی جگہ ہے لیکن وہ شخص جو استادوں کا اور ان کے کام کی عزت نہیں کرتا تو وہ یونیورسٹی کا وائس چانسلر ہونے کے قابل ہے اور نہ ہی قابلِ احترام ہے۔ اس دن انہوں نے مجھ سے پوچھا کیا یہ سچ ہے کہ اس شخص نے تمہاری کتابیں پھینک کر واپس کر دیں اور لینے سے انکار کیا۔ میں خاموش ہو گیا۔ کہنے لگے تمہاری خاموشی میرے سوال کا جواب ہے۔ کیا ایسا شخص جو معاشیات کے ایسے استاد کو جس کی کتابوں پر دنیا کے معتبر رسائل میں اتنی زیادہ تعریف کی گئی ہو اور ماہرینِ معاشیات نے اس کی تعریف کی ہو۔ اس کو تم ایسا وائس چانسلر ماننے کے لئے تیار ہو۔ میں ششدر سا رہ گیا کہ یہ سب باتیں ان کو کیسے معلوم ہو گئیں جب کہ میں نے کبھی ذکر نہیں کیا تھا اور یہ سب سچ تھا اس لئے کہ میں اس حقیقت اور کیفیت سے بخوبی واقف رہا ہوں۔ اس کے بعد کھانے پر بہت خوشگوار باتیں ہوتی رہیں لیکن رخصت ہوتے وقت ڈاکٹر صاحب نے مجھ سے تاکیداً کہہ دیا کہ میرا پیغام اس شخص کو دوں کہ ان کو بھیجا دیا۔ میں نے عمل کیا اور ڈاکٹر صاحب کے حکم کے مطابق ان کی بات بعینہ بدرالدین طیب جی صاحب سے کہہ دی۔ یقیناً وہ دل ہی دل میں بہت غصہ ہوئے ہوں گے۔ لیکن قہرِ درویش بر جانِ درویش۔ مگر کوئی اور ایسی بات کہتا تو شاید وہ بپھر جاتے لیکن ڈاکٹر صاحب کے سمجھائے ہوئے پیغام پر وہ کر ہی کیا سکتے تھے۔

ڈاکٹر صاحب تو میرے جیسے کم مایہ انسانوں کی ہمت افزائی کرتے تھے وہ یقیناً ان کی شرافت کی دلیل ہے۔ اس کی ایک مثال یہ ہے کہ ڈاکٹر صاحب نے ایک مرتبہ مجھ سے ذکر کیا کہ ترقی کے اصول اور غیر ترقی یافتہ ممالک میں بینک کے اوپر کوئی اچھا خاکہ بنا کر کوئی کورس طلبہ کو دیا جائے تو یقیناً بہت مفید ہوگا۔ میں تو ہمیشہ ہی ایک طرح کے لئے نوٹ بناتا ہی تھا جس میں اپنی تقریروں کے خاص نکات لکھتا اور مختلف کتابوں کے جو اسباق یا صفحات اہم سمجھتا ان کا ذکر دیا کرتا تھا۔ تو میں نے ہمت کر کے ایک کورس پچھڑے ہوئے ممالک کے لئے تیار کیا۔ حالانکہ اس کا یقیناً لمبا ہو گیا۔ لیکن ذہن میں یہ تھی کہ وہ کورس اگر محنت سے پڑھایا جائے تو چھ مہینہ میں یقیناً ختم کیا جا سکتا ہے۔ میں نے جو ما حاصل قسم کے کچھ بھی مرتب کیا سکے تھے پہلے ان کے نکات پیش کئے اور رسالہ جات کے اسباق اور صفحات کے نمبر صاف کر کے ایک کاپی ڈاکٹر صاحب کے پاس بھیجی اور ان سے تصحیح اور مشورہ کی درخواست کی۔ انہوں نے جواب میں ایک خط ارسال کیا جس میں لکھا کہ تمہارے بہت سے اہم معلوم ہوتے ہیں۔ میں یقین کے ساتھ کہہ سکتا ہوں کہ ان کے متعلق میں کوئی مشورہ تو نہیں دے سکتا لیکن ضرور کہوں گا کہ مجھے ان طلباء پر حسد آتا ہے جن کو تم یہ کورس پڑھاؤ گے۔ یہ ساتھ ہی لکھا کہ اس بات کی دعا کرتا ہوں ضروری ہے کہ انہوں نے لفظ حسد ہی کو استعمال کیا ہے کہ اس کی جگہ بہت تعریف کرنے کے لئے رشک کا

الفاظ بھی استعمال کر سکتے تھے۔ اب یہ سوچیے کہ ان ذاکر صاحب جیسا جید عالم اور کہاں میسر ہے کہ اہل استعداد ملک کے پروفائل گریجویٹ فرمانے کے لئے بیٹھا تو کب میری تعریف کے لئے ہو سکتے تھے۔ ایسا اچھے واقعات اور خطوط کو احتیاط سے رکھنے کی عادت نہیں ہے جس پر شرمندہ ہوں، لیکن یہ محض اتفاق کی بات ہے کہ ان کا یہ خط اور صرف یہی خط میرے پاس محفوظ رہ گیا۔ جب پروفیسر حبیب صاحب شیخ الجامعہ ذاکر صاحب کے اوپر ایک کتاب تیار کر رہے تھے تو انہوں نے ملک کے تمام لوگوں سے درخواست کی تھی کہ اگر ذاکر صاحب کے خطوط کسی کے پاس محفوظ ہوں تو وہ میرے پاس بذریعہ رجسٹری بھیج دیں۔ ان کے فوٹو اسٹیٹ کروا کے اصل خطوط ہم واپس کر دیں گے اور ان کے لئے ہم احسان مند ہوں گے۔ بات تو بالکل ٹھیک تھی، لیکن میں نے احساس شرمندگی سے یہ خط ان کے پاس نہیں بھیجا۔ اب چونکہ میں نے اس کی پوری تفصیل اس مضمون میں دے کر قارئین کو آگاہ کر دیا ہے تو اس کی ایک فوٹو اسٹیٹ کاپی آپ کے ملاحظہ کے لئے پیش کر رہا ہوں۔

عکس مکتوب

No VP(P)1644

VICE PRESIDENT
INDIA

NEW DELHI
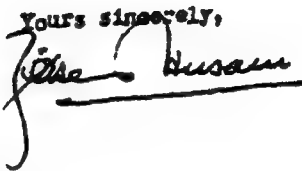
Jul, 25, 1963.

My dear Shabbir Saheb,

Thank you for your letter and for the synopsis of your proposed course on Problems of Economic Growth and Planning. I feel jealous of the students who will have the privilege of hearing you. We had rather poor stuff in our day at Aligarh. I can hardly suggest any improvements.

Your design is very comprehensive and includes much of which I am ignorant. I hope you will write out the lectures for use by a larger public.

With all good wishes for both of you and with love for your child,

Yours sincerely,

Zakir Husain

Mohd. Shabbir Khan Sahab,
Head of the Department of Economics,
Muslim University,
Aligarh.

ڈاکٹر صاحب کو ملک کے عام لوگوں سے عموماً اور مسلمانوں سے خصوصاً محبت تھی۔ جب میں نے ان کو امریکہ کے چند روز کے قیام کی دعوت دی تو وہ عصر کی نماز کے بعد ملک کے سب لوگوں اور خصوصاً مسلمانوں کے لیے اتنی لمبی رو رو کر دعائیں مانگتے تھے۔ ان کا کہنا تھا کہ سارے ہندوستان کے مسلمانوں کی حیثیت آئندہ ویسی ہی ہوگی جیسی کہ وہ خود کوشش کر کے بنائیں گے۔ وہ کسی کے عقائد سے بڑھ کر اس پر اعتماد نہ کرتے تھے جتنا اس کے عملی ہونے پر۔ اور میں نے ان کو علامہ اقبال کا یہ شعر اکثر و بیشتر پڑھتے سنا ہے کہ :

عمل سے زندگی بنتی ہے جنت بھی جہنم بھی
یہ خاکی اپنی فطرت میں نہ نوری ہے نہ ناری ہے

ان کی ہدایت ہمیشہ یہی ہوا کرتی تھی کہ اپنے معیار کا احساس لیے ہوئے اپنی محنت کرتے جاؤ اور اپنی محنت اور کام پر اپنا یقین رکھو کہ اگر کسی موقع پر تم کو کسی معاملہ میں مایوسی ہو تو تمہیں اس کا احساس نہ ہو اور تم نے تمہارے آگے بڑھنے یا محو الفت رکھنا۔ اس کو کہو کہ ایک رات جب دن آئے۔ علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے وائس چانسلر کے عہدے سے سبکدوش ہونے کے بعد جب ان کو یونیورسٹی کے کانووکیشن میں ایڈریس دینے کے لیے بلایا تھا تو مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ جلسے سے پہلے انہوں نے اپنی تقریر میں کہا تھا کہ جاپان سے بڑے بڑے جہاز کہ آگ والے آ جاتے ہیں۔ تم کہاں تک دنیا سے تمہارے کام کی اگر میں صرف اسی تعریف کر دوں تو تم سب کے سب خوش ہو گے اور خوب خوب تالیاں تعریف میں بجاؤ گے۔ میں صاف کہہ سکتا ہوں کہ تمہارے اوپر نہ صرف اس ملک کا بلکہ پوری دنیا کی قسمت کا انحصار ہے۔ لیکن میں کہتا یہ ہوں کہ تم سے جو امید

طالب علم ہوتے جن سے یہی کہا جاسکتا تھا اور یقیناً الفاظ کہتے ہیں لیکن ان کی امیدیں کامیاب نہ ہوئیں۔ یہ تم تو جب ہدایت کرو رہا کہ بخیریت اور مستحکم یقین کرکے تم کہ دنیا میں کوئی بھی شخص ایسا کام نہیں کرسکتا جو قابل تعریف ہو۔ ہو سکتا ہے میرا یہ کہنا تم کو ناگوار معلوم ہو۔ لیکن مجھ کو افسوس ہے کہ میں اس کے علاوہ تم سے اور کچھ نہیں کہہ سکتا۔

جن زمانے میں ڈاکٹر صاحب ملک کے صدر تھے مجھ کو اور میری بیوی کو کھانے پر بلایا کرتے۔ یہ ان کی بڑی قدر دانی تھی اور ان مشغولیتوں کے باوجود وقت نکال سکتے کہ وہ اس قسم کے کاموں میں وقت صرف کر سکیں۔ ایک مرتبہ گفتگو میں انہوں نے یہ بتایا کہ عجیب لوگ ہیں کہ ان کو اس بات کا احساس بھی نہیں ہوتا کہ آج کل میرے پاس وقت کی کمی ہے۔ اس لئے اکثر اوقات ہمارے ملک کے بڑے بڑے لیڈر آتے رہتے ہیں لیکن باوجود اس بات کی کوشش کرتا ہوں، زیادہ سے زیادہ جو لوگ مجھ سے مل سکتے ہیں ان کو ملنے کا موقع دوں، چاہے وہ دو منٹ ہی کیوں نہ ہو۔ پھر بھی بعض لوگ ایسی حرکت کرتے ہیں کہ میرے پروگرام کو کسی طرح معلوم کر لیتے ہیں۔ اور جب میں اپنی بیٹی سے ملنے کے لئے (جو مسز رشید عالم خان صاحب کی بیگم صاحبہ کی طرف اشارہ تھا) جاتا ہوں تو وہاں وہ مجھ سے ملنے کے لئے موجود رہتے ہیں۔ ان کو یہ احساس بھی نہیں ہوتا کہ ایک باپ اپنی بیٹی سے ملنا چاہے تو اس کا موقع تو اس کو دیا جائے۔ لیکن کیا کریں، بعض لوگ اپنی عادت سے مجبور ہوتے ہیں اور ان کو سوائے اپنے کام کے کسی کے متعلق کوئی احساس نہیں ہوتا۔

جیسا کہ میں پہلے عرض کر چکا ہوں، ڈاکٹر صاحب اپنی گفتگو میں بہت خوشگوار باتیں کیا کرتے تھے۔ اور ان سے حدیث کی باتوں ہی سے دل خوش ہو جاتا تھا۔ مگر ایک ملاقات میں ڈاکٹر صاحب نے تھوڑے تھوڑے وقفہ پر داغ کا یہ شعر کئی مرتبہ پڑھا کہ:

ہو گئے ہیں داغ بے مدعا — آپ سے لو لگا کے کیا جاتا

میں نے وہاں سے اٹھتے ہوئے اپنی بیوی سے کہا کہ مجھے ڈر لگتا ہے کہ ڈاکٹر صاحب ہماری بدقسمتی سے زیادہ عرصہ تک زندہ رہ سکیں گے۔ اس لئے کہ ایسا انسان جو ہمیشہ انتہائی خوشگوار باتیں کرتا ہو جب ایسی ناامیدی کی باتیں کرنے لگے تو اس کی زیادہ عرصہ تک زندہ رہنے کی امید کم ہی دکھائی دیتی ہے۔ میری بیوی نے میری اس بدقسمت رائے سے اتفاق کیا اور ہم دونوں ان کی صحت اور اپنے سروں پر ان کا سایہ رہنے کی دعا کرتے رہے۔ لیکن موت کا وقت جیسے آتا ہے وہ دعائیں بھی اثر نہیں کرتیں۔ بہت جلد ہی ڈاکٹر صاحب اس دنیائے فانی سے کوچ کر گئے۔ انا للہ وانا الیہ راجعون۔

ڈاکٹر صاحب کو میں نے اس موقع کے علاوہ دو مرتبہ اور بھی مغموم دیکھا۔ ایک مرتبہ تو سفر کے دوران جب ان کو معلوم ہوا کہ ڈبلیو۔ ڈبلیو لیبیف کو معاشیات میں نوبل پرائز ملا ہے۔ تو وہ

مجھ سے کہنے لگے کہ جب میں جرمنی میں علم معاشیات کی اعلیٰ تعلیم حاصل کر رہا تھا تو یہ صاحب بھی میرے ساتھ پڑھتے تھے۔ مجھ کو بہت اچھا اور ان کو بہت کم اہمیت کا طالب علم سمجھا جاتا تھا اور آج یہ دن ہے کہ دنیائے علم میں میری معاشیات میں کوئی پوزیشن نہیں اور ان صاحب کو معاشیات میں نوبل پرائز ملا۔ تو میں نے عرض کیا کہ ڈاکٹر صاحب آپ نے اپنے کام میں جو ترقی کی ہے اور تعلیم و طلبا کی تربیت میں جو کام کیا ہے وہ بہت نمایاں حیثیت رکھتا ہے۔ کیا وہ پائے کا نہیں! یا اس کو دنیائے علم میں نہیں مانا گیا۔؟ جب آپ نے علم معاشیات میں کام کرنے کی بجائے مشن ہی کو زندگی بنایا تو آپ کا مقابلہ کسی ایسے آدمی سے جس نے صرف معاشیات میں کام کیا ہو کیسے کیا جا سکتا ہے، اس لیے کہ میرے خیال میں آپ کے کام اور ان کے کام میں ایک دوسرے سے تقابل کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ یہ تو ایک دوسرے سے بالکل مختلف علم ہیں۔ اس پر وہ خاموش ہو گئے، پتا نہیں میری بات کا ان کے اوپر وہ اثر ہوا یا نہیں جس کی مجھے خواہش تھی اور جو میں حقیقت میں صحیح سمجھتا تھا۔

دوسرے موقع پر میں نے ان کو مغموم جب پایا جب میں ایک مرتبہ پٹنہ میں راج بھون میں ان سے ملا۔ اس زمانہ میں میری بیوی انگلستان میں تعلیم پا رہی تھیں اور میرے ساتھ نہ تھیں۔ کہنے لگے اگر تم میری اس بات کو ذاتی سمجھتے ہو تو تمہیں جواب دینے کی ضرورت نہیں ورنہ میں تم سے یہ پوچھنا چاہتا ہوں کہ تم نے یہ شادی کی کہ عادتوں میں وہ تم سے بالکل مختلف ہیں۔ میں نے ان سے کہا کہ ڈاکٹر صاحب آپ میرے بزرگ ہیں اور آپ سے میری کوئی بات جو اہمیت رکھتی ہو پوشیدہ نہیں ہے اور نہ ہی رکھنا چاہوں گا۔ بات دراصل یہ ہے کہ وہ معاشیات میں بہت اچھی ہیں۔ اس سے تو شاید آپ بھی اتفاق رائے رکھتے ہوں گے۔ اور دوسری اس سے زیادہ اہم بات یہ کہ میں ان سے محبت کرتا ہوں۔ بہت ہی مغموم انداز میں کہنے لگے۔ مجھ سے تو تم بہت خوش قسمت ہو کہ جس چیز سے تم نے محبت کی تم نے حاصل کر لی اور میں اتنا بدقسمت ہوں کہ جس چیز سے بھی دل لگایا وہ حاصل نہ ہوا۔ تم جانتے ہو میں نے جامعہ ملیہ اور علی گڑھ مسلم یونیورسٹی سے دل لگایا۔ اور دونوں میں کوئی کامیابی حاصل کرنے میں ناکام رہا۔ پھر اسی سانس میں کہا کہ جامعہ ملیہ اور مسلم یونیورسٹی میں صرف فرق اتنا ہے کہ جامعہ ملیہ ایک مردہ ادارہ ہے اور مسلم یونیورسٹی ایک مرتا ہوا اور سسکتا ہوا ادارہ ہے۔ جو کسی وقت مردہ ہو جائے گا۔ میں نے عرض کیا کہ ڈاکٹر صاحب یہ تو دل کی وسعت کا سوال ہے۔ میں نے تو ایک بہت چھوٹی چیز کو چاہا اور اس کو حاصل کر لیا۔ آپ ایک نہیں دس خوبصورت، خوش مزاج اور علمی قابلیت رکھنے والی لڑکیوں سے اپنی جوانی کے عالم میں محبت کرتے تو آپ کو یہ طے کرنا مشکل ہوتا کہ آپ کون سی کو اختیار کریں۔

— لیکن آپ نے تو مجھے جامعہ ملیہ اور مسلم یونیورسٹی دونوں کا تعمیری کام اتنا مشکل ہے کہ اس کی تھوڑی سی کامیابی بھی آپ کی مکمل کامیابی کی دلیل ہے۔ میں سوچ رہا تھا کہ شاید وہ اس جواب سے مطمئن ہو جائیں گے۔ لیکن انہوں نے اس معاملہ میں مجھ سے اتفاق رائے نہ کیا۔ اور کہنے لگے ایسی صورت کو جو بالکل مختلف خیالات اور مختلف خاندانوں کے بچے پال لینا کوئی معمولی کام نہیں ہے۔ تم کو اس بات کا احساس ہی ہے کہ تم نے اس معاملہ میں کتنی شاندار کامیابی حاصل کی ہے۔ پھر انہوں نے اسی بات کو دہرایا جس کو وہ پہلے کہہ چکے تھے کہ مجھے یقین ہے کہ تم دونوں معاشیات کے علم میں بہت اضافہ کرو گے جو میری خوش قسمتی کا باعث ہوگا۔

ہر چند کہ مضمون لمبا ہو گیا ہے۔ لیکن قارئین سے اس کی طوالت کی معافی چاہتے ہوئے یہ کہنا چاہتا ہوں کہ جو بات ذاکر صاحب نے مجھ سے جامعہ ملیہ اور علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے معاملہ میں کہی تھی، وہ غالباً بالکل بے معنی نہیں تھی ہر چند کہ مجھے شبہ ہے کہ جو بات انہوں نے مجھ سے میرے معاملہ میں کی تھی وہ میرے دل بہلانے کی بات تھی۔ میں جامعہ ملیہ کے متعلق تو کچھ کہہ نہیں سکتا اس لئے کہ مجھے اس کے بارے میں معلومات نہ ہونے کے برابر ہیں۔ لیکن مسلم یونیورسٹی علی گڑھ جہاں میں نے ہوش سنبھالنے کے بعد اپنی عمر کا بیشتر حصہ گزارا ہے۔ کی تھوڑی بہت معلومات ہے۔ یہاں کے حالات جب میں غور کرتا ہوں تو مجھے خیال ہوتا ہے کہ آخر ذاکر صاحب جیسے دوررس انسان نے یہ بات کیوں کہی۔ کیا وہ بالکل بے معنی تھی۔ ایسا ہونا تو بہت مشکل ہے کہ وہ ایسی بات کرتے جو حقیقت سے بالکل دور ہوتی۔ یہ خیال میرے ذہن میں بار بار اس لئے آتا ہے کہ ذاکر صاحب جس زمانہ میں علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے وائس چانسلر تھے بار بار اس بات کو دہراتے تھے کہ آپ لوگ عمر اور پروالے لوگوں کی طرف نہ دیکھیں ان کو میں نے پروفیسر اور صدر شعبہ بنایا ہے۔ وہ تو جانے والے لوگ ہیں اور کچھ عرصہ کے بعد ریٹائر ہو جائیں گے۔ آپ تو زیادہ تر نوجوانوں کی طرف توجہ کریں جو آگے چل کر مختلف شعبہ جات کی باگ ڈور سنبھالیں گے۔ وہ نوجوان اشخاص کی زیادہ سے زیادہ ہمت افزائی کرتے تھے۔ ان کو باہر جانے کے لئے وظائف دلواتے تھے۔ ان سے کام کرنے کی تاکید کرتے تھے۔ اور ان سے وعدہ لیتے تھے کہ وہ ———— ———— اپنے اپنے شعبوں کو معیاری شعبہ بنائیں گے۔ اور یقیناً بہت سے لوگوں نے جو اس وقت نوجوان یا جوان تھے ان سے ایسے وعدے ضرور کئے ہوں گے جس طرح کا میں نے کیا تھا اور جس کی وجہ سے میں نے باہر کے بڑے سے بڑے عہدہ کو ٹھکرا دیا تھا مگر ان میں سے زیادہ تعداد ایسے لوگوں کی ہے جو یہاں سے نکل کر چلے گئے اور شہرت اور دولت کما گئے۔ بہت عرصہ تک تو میں یہ سمجھتا رہا کہ میں نے بڑا زبردست کام کیا کہ ذاکر صاحب سے جو وعدہ کیا تھا اس کو ناچیز حیثیت کے مطابق نبھانے کی کوشش کرتا رہا۔ اور دوسرے لوگوں کے متعلق خیال

کرتا تھا کہ انہوں نے ہی سعادین ذاکر صاحب سے وعدہ خلافی کی۔ میرے ذہن میں یہ آیا کرتا تھا کہ شاید انہوں نے اچھا نہیں کیا۔ لیکن اب سوچتا ہوں کہ ذاکر صاحب نے مجھ سے پاکستان سے یہ وعدہ تو نہیں لیا ہوگا کہ تا عمر علی گڑھ میں ہی رہنا اور اپنے شعبہ کی تخریب کا کام کرتے رہنا۔ اب دعا کرتا ہوں کہ کوئی خدا کا بندہ ایسا ہو جو اس بگڑے ہوئے کام کو بنانے کی کوشش کرے تو شاید ذاکر صاحب کی روح کو اس سے آرام ملے۔ حالات کو مد نظر رکھتے ہوئے زیادہ امید تو نظر نہیں آتی لیکن دنیا میں کوئی کام ناممکن بھی نہیں ہوتا۔

میں یقین کے ساتھ تو کچھ نہیں کہہ سکتا ———— لیکن اپنے ریٹائر ہونے سے پہلے میرے علم میں دو واقعات ایسے آئے جن سے سخت تکلیف ہوئی اور خیال پیدا ہوا کہ وہ ذاکر صاحب کے خیالات کی تصدیق کرتے ہیں جو علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے حالات کی بنا پر ان کے دل میں پیدا ہوئے تھے جو ان کی ضعیفی کا باعث تھے۔

پہلی بات تو یہ ہوئی کہ ایک خلفشار کے زمانہ میں جب کہ وائس چانسلر صاحب حالات سے کافی پریشان ہو رہے تھے، پرو وائس چانسلر صاحب کو کچھ مجبوریوں کی بنا پر علی گڑھ سے تھوڑے عرصہ کی چھٹی لے کر جانا پڑا۔ ہر چند کہ میں ہارٹ اٹیک کے بعد ہسپتال سے واپس آیا تھا اور وائس چانسلر صاحب اور میرے درمیان یہ پہلے ہی معاہدہ ہو چکا تھا کہ میں ان تمام کاموں میں مدد دوں گا جو یونیورسٹی کی ترقی کے لئے کئے جائیں گے لیکن میں اب کبھی پرو وائس چانسلر بننے کے لئے تیار نہ ہوں گا۔ لیکن چند ایک مجبوریوں کی بنا پر وائس چانسلر صاحب کو مجھے کوئی دو مہینہ کے لئے پرو وائس چانسلر بنانا پڑا۔ اور میں ان کی مجبوریاں جان کے اس سے انکار نہ کر سکا۔ اسی دوران میں ایک دن سائنس کے شعبہ جات کی فیکلٹی کی اعلیٰ تعلیم اور تحقیقات کی کمیٹی کی صدارت کر رہا تھا، تو اس میں ایک کیس ایسا آیا جس میں ایک شعبہ کے کسی ریسرچ اسکالر کے تحقیقی مقالہ کی ایک ملک کے باہر کے ممتحن نے بہت سخت الفاظ میں تنقید کی تھی۔ رپورٹ بہت لمبی تھی اور اس میں بہت سی غلطیوں کے متعلق بھی نشاندہی کی گئی تھی اور یہ بھی بتایا گیا تھا کہ کس طرح ان تمام چیزوں کی تصحیح کی جا سکتی ہے۔ باہر کے ملک کے پروفیسر نے یہ بھی لکھا تھا کہ میں اس سے قبل مسلم یونیورسٹی کے کئی ریسرچ اسکالرز کے کئی تھیسس دیکھ چکا ہوں جن کا معیار بہت ہی بلند ہوتا تھا اور اب میری سمجھ میں نہیں آتا کہ تحقیق کا معیار اتنا کیسے گر گیا۔ میری رائے یہ ہے کہ یونیورسٹی کے ارباب حل و عقد کو خاص طور پر تحقیق کرنا چاہئے کہ تحقیق کے معیار کے اتنا گرنے کی کیا وجہ ہو سکتی ہے۔ مزید یہ لکھا تھا کہ میں یہ سفارش کرتا ہوں کہ اس تھیسس کے بارے میں میں نے جو بہت سی باتیں لکھی ہیں، ان کی روشنی میں دوبارہ درست کیا جائے۔ اور اس کے بعد چونکہ میں کافی وقت تک بہت مشغول رہوں گا اور اس تھیسس کو دوبارہ جانچنے کے لئے کسی دوسرے ممتحن کو بھیجنے میری رائے یہ ہے کہ اس مقالہ کو درست کرنے کے بعد ہندوستان سے ہی

بھی اپنے مضمون سے متاثر نہیں ہوتا۔ یہاں یونیورسٹی نے جب یونیورسٹی بنائی تھی تو کیا کیا حوصلے ہو رہے تھے۔ کیونکہ کیا کیا حوصلے تھے۔ ہم تو کچھ نہیں کر سکتے لیکن اگر ہم ان کی تقلید کریں تو تھوڑی بہت ملک اور قوم کی خدمت کرتے۔ یہ تو جو ہمارا حاصلِ زندگی ہے۔

میں جانتا ہوں کہ سائنسی تحقیقات میں دو ایک مثالیں دینے سے کوئی بات ثابت نہیں ہوتی۔ اور یہ انسان کی کمزوری ہے کہ وہ صرف دو ایک باتیں دیکھ کر جلدی سے کسی نتیجے پر پہنچنے کی کوشش کرتا ہے۔ لیکن ریٹائر ہونے کے بعد بھی چونکہ ______________ یونیورسٹی کے اندر رہتا ہوں اور کبھی کبھی تھوڑی بہت معلومات ہوتی ہیں تو پتا چلا کہ موجودہ وائس چانسلر صاحب نے Academic Programme Commission بنایا ہے جس کا کام منجملہ اور کاموں کے یہ ہے کہ وہ تحقیقات کرے اور جگہ جگہ جا کر معائنہ کرے اور یہ دیکھے کہ ہر شعبہ کے اساتذہ کام کر رہے ہیں یا نہیں۔ حالانکہ اتنے عرصے تک یونیورسٹی میں کام کرنے کے بعد مجھے کم از کم یہ بات معلوم ہے کہ یہ بات تو یونیورسٹی کے قواعد میں پہلے ہی سے موجود ہے۔ وائس چانسلر پوری یونیورسٹی کے کام کا ذمہ دار ہے۔ ہر ڈین اپنی فیکلٹی کا ذمہ دار ہے۔ ہر صدر شعبہ اپنے شعبہ کا ذمہ دار ہے اور ہر استاد اپنے کام اور اپنے طلباء اور تحقیق کے کام کا ذمہ دار ہے۔ تو موجودہ وائس چانسلر کو اب کمیشن بنانے کی کیا ضرورت پڑی۔ اس کا جواب صرف ایک ہی ہو سکتا ہے۔ وہ یہ کہ ان کو اس بات کا احساس ہے کہ لوگ ان اونچی جگہوں پر کام نہیں کر رہے ہیں۔ اور یہی ڈاکٹر منظور صاحب کا حد سے زیادہ حسن کو رنجیدہ ہو کر انہوں نے مجھ سے سوال کیا تھا۔

تو میں ہرگز نہیں کہتا کہ یونیورسٹی میں قابل استاد نہیں ہیں۔ در اصل بہت سے لوگ تو بہت ہی اچھے ہیں اور مزید لوگ تیار ہو رہے ہیں جیسے کہ میں جانتا۔ بہت سے لوگوں نے اچھے کام کا سکہ بیرونی ممالک اور بین الاقوامی سطح کے ماہرین میں جمایا ہے۔ ہندوستان میں بھی مگر یہاں پر جتنا زیادہ جھگڑے کا چانس ہے، اس کو دیکھ کر افسوس ہوتا ہے۔ جو جو وائس چانسلر کہ کچھ علمی ذوق بھی رکھتے تھے یہاں آئے سب تھوڑے تھوڑے عرصے کے لئے آئے۔ لیکن تھوڑے ہی عرصے میں ہر ایک کی مخالفت کی گئی، اسلئے کہ اس طرح طریقے سے کام کروائے جا سکیں۔ آخر استاد کو استاد بننے سے زیادہ کس چیز کی ضرورت ہوتی ہے۔ اور میری سمجھ میں آج تک یہ نہ آسکا کہ کیوں یہاں کے لوگ وائس چانسلر سے اس بات کے امیدوار ہوتے ہیں کہ ان کو استاد کے علاوہ کوئی اور عہدہ یا کوئی منصب دیا جائے۔

مجھے یقین ہے کہ میرے اس مضمون سے علی گڑھ اور علی گڑھ سے جو لوگ باہر جا چکے ہیں ناراض ہو سکتے ہیں۔

لیکن میں یہ سمجھتا ہوں کہ ہر شخص کا فرض ہے کہ جس بات کو وہ صحیح سمجھے صفائی سے کہے۔ اور اس کو اپنے خیالات کے علاوہ کسی اور چیز کا غلام نہیں ہو جانا چاہیئے۔ یہ خیالات وقت کے ساتھ تبدیل بھی ہو سکتے ہیں۔ اس کا بھی امکان ہے کہ میرے خیالات آئندہ چل کر کچھ اور ہو جائیں۔ لیکن جب دوسرے ہوں گے تو میں اپنی غلطی کو تسلیم کرنے میں کسی وقت بھی کسی قسم کا تامل نہ کروں گا۔ انشاء اللہ

••

کی (جو کہ عام طور سے احمد تولک کہے جاتے تھے) تو جس کی مدح میں یہ شعر اڑا دیا ہے

احمد آتون گہی شیعی گہی سنی بود   چون میلِ او بہ کیشِ مرادیش نہ درست

پھر فرمایا کہ احمد آتون بڑے وقت شناس انسان تھے کبھی سنی بنتے تھے اور کبھی شیعہ۔ یہ کہہ کر ڈاکٹر صاحب ہنسے اور کہا کہ آپ کے شہر میں بھی ایسے لوگ موجود ہیں جو اپنے کو کبھی شیعہ اور کبھی سنی ضرورت کے مطابق کہتے ہیں یا تھے۔ میرے ملنے والوں میں ایک صاحب کی طرف اشارہ تھا جو اپنے کو کبھی سنی اور کبھی شیعہ کہتے تھے۔ شاہ مرزا کے بارے میں کہا کہ وہ قید میں تھا تو اس نے وصیت کی تھی کہ جب وہ مر جائے تو دفن کرنے کے بعد اس کے لوحِ قبر پر یہ رباعی کندہ کر دی جائے۔

ساقی غمِ زمانہ نمی ...   با مستِ ... دوستِ ہمدم می باش

چون وجہِ شادیِ حقیقی مرگ است   گر مرگ رسد تو شاد و خرم می باش

میں نے اپنی تحقیق اس رباعی کی "تحفۂ سامی" کے دوسرے ایڈیشن کے دیباچہ میں درج کر دیا ہے۔

○

۱۹۲۸ء میں میری کتاب "[illegible] Persian Poets of India" کو مسلم یونیورسٹی نے شائع کیا میں نے پہلی کاپی ڈاکٹر صاحب کی خدمت میں بذریعہ ڈاک روانہ کی۔ جب کتاب پہنچی تو ڈاکٹر صاحب بیمار تھے اور شہر سے باہر گئے ہوئے تھے۔ وقت پر رسید نہ بھیجنے کی معذرت چاہی اور اپنے خط میں میری کتاب کی تعریف کرتے ہوئے مجھے تحقیق کو جاری رکھنے کا مشورہ دیا۔ اس خط کو میں نے ۴۴ سال سے بطور یادگار اپنے پاس محفوظ رکھا ہے۔ ایک سال بعد ڈاکٹر صاحب نے مجھ سے اس کتاب کی تین کاپیاں طلب کیں اور جب میں دہلی سرکاری کام سے گیا تو ان تین کاپیوں کو ڈاکٹر صاحب کی خدمت میں پیش کیا۔ بہت خوش ہوئے اور کہنے لگے کہ میں محمود شیرانی سے اس بات پر اتفاق کرتا ہوں کہ کچھ عرصہ تک اس طرح کی کتاب نہیں لکھی جائے گی۔ ڈاکٹر صاحب مرحوم کا مقابلہ نئی کتابوں کے پڑھنے میں کوئی نہیں کر سکتا تھا۔ جب بھی کوئی نئی کتاب کا تذکرہ کیجیے خواہ اردو کی ہو یا انگریزی کی وہ کتاب ڈاکٹر صاحب کی نظر سے گذر چکی ہوگی اور اس پر وہ اپنا عالمانہ تبصرہ فرماتے تھے۔ کہنے لگے کہ میں شیرانی صاحب کا تبصرہ پڑھ چکا ہوں۔ لاؤ تمہارے سامنے کتاب کو پڑھوں۔ چونکہ میری کتاب Sir Denison Ross ڈاکٹر عظیم الدین احمد اور ڈاکٹر ہادی حسن کے مشوروں سے مرتب کی گئی تھی کچھ دیر تک ان بزرگوں کا تذکرہ رہا۔ ڈاکٹر صاحب Sir Denison Ross سے خوب خوب واقف تھے اور اکثر ان کی خدمات کی تعریف کیا کرتے تھے۔ میں نے ابوالفرج رونی کے بارے میں جو کچھ لکھا تھا اس کو بہت پسند کیا اور فیضی کے ایک قصیدہ کے چند اشعار پڑھے جس میں اس نے ابوالفرج رونی کا تتبع کیا تھا۔ رونی کی رباعیوں کو بھی بہت پسند کیا۔ حمید الدین کے اشعار کو بھی

شوق سے پڑھا۔ خصوصاً اس نظم کو جس میں شراب اور بھنگ کے درمیان مناظرہ درج ہے۔ حمید الدین کے تعقید کو جگہ نہیں ہے۔

دارم جعل نو بہ نوز ہیپ حرف ناخوش منابی — کوری کبودی گہ زردی عاقل کشی دوپ بدی

نہایت شوق سے شروع سے آخر تک پڑھا۔ در صحبہ ذیل شعر کو کئی بار پڑھا۔

بر چیز بعزم اسعد ریز جادی، خوش دیدہ — کاندر تو بیشتر گر قیمت ندارد جوہری

ڈاکٹر صاحب سے یہ ملاقات مجھے ہمیشہ یاد رہے گی۔ انھوں نے اپنے چند ضروری کاموں کو چھوڑ کر مجھے وقت دیا کہ میں ان سے کچھ استفادہ کر سکوں۔ میں بغیر اطلاع کیے ان سے ملنے گیا تھا اور انھوں نے نہایت خندہ پیشانی سے میرے ساتھ اپنا قیمتی وقت صرف کیا۔

○

ڈاکٹر عبدالحفیظ فاروقی اپنے مراد پور کے بنگلہ میں مقیم تھے۔ یہاں اب جلہ مارکیٹ بن گیا ہے۔ ان کا لڑکا جامعہ ملیہ میں پڑھتا تھا۔ کسی کام سے ڈاکٹر ذاکر حسین سنہ ۱۹۴۰ء میں جب پٹنہ تشریف لائے تو ڈاکٹر صاحب نے ان کو اپنے یہاں جائے [illegible] ہو گیا اور مجھے بھی بلایا۔ میں مسٹر امتیاز محمد خان ایم اے علیگ اور ولدہ کے ساتھ جو اس زمانہ میں انا پور ٹمپل ریلوے اسکول کے ہیڈ ماسٹر تھے اس وقت وہاں پہنچ گئے۔ ہم لوگ کچھ دیر بیٹھے ہی تھے تو مسٹر امتیاز محمد خان نے ڈاکٹر ذاکر حسین کی بیسک تعلیم کی اسکیم پر اعتراض کرنا شروع کیا۔ میں نے ان کو روکا اور کہا کہ یہ وقت ان سب باتوں کا نہیں ہے۔ ڈاکٹر صاحب کا قیام پٹنہ میں تین دن اور رہے گا آپ ان سے مل کر اپنی شکایتوں کو دور کریں۔ اسی اثنا میں ڈاکٹر صاحب کمرے میں داخل ہوئے اور ہم مختلف موضوع پر خصوصاً مسلمانوں کی تعلیم کے بارے میں ان سے باتیں کرتے رہے۔ بیٹھنے کی میز بڑی لمبی تھی اور ہر قسم کے کھانوں اور پھلوں سے لدی ہوئی تھی۔ جب کھانا شروع کرنے میں دیر ہوئی تو ڈاکٹر صاحب نے اپنے مخصوص انداز میں کہا کہ یہ تو صحت کا نظارہ معلوم ہوتا ہے۔ کل اچھی اچھی چیزیں سامنے رکھی ہوئی ہوں مگر کوئی ان چیزوں کی طرف توجہ نہیں کرنے والا ہے۔ میرے دوستوں میں سے ایک نے اپنے علیگڑھ کے انداز میں کہا کہ حضرت جبرئیل کا انتظار ہے۔ وہ یہ کہہ ہی رہے تھے کہ مولانا سید سلیمان ندوی کمرے میں داخل ہوئے اور چند لوگوں نے کہا کہ آج سے آپ کا خطاب جبرئیل ہو گیا۔ سلیمان ندوی صاحب نے بھی ہنسی میں شرکت کی اور قریب ایک گھنٹہ تک ڈاکٹر صاحب نے اپنی باتوں سے ہم لوگوں پر جادو کا اثر ڈالا اور ہم لوگ دم بخود ان کی باتوں کو سنتے رہے۔ کیونکہ گفتگو کا موضوع اسلامیات تھا۔ مولانا سلیمان ندوی جب اسلامیات کی باتیں ہوں تو کب چپ رہنے والے تھے۔ کبھی تو ڈاکٹر صاحب کا ساتھ دیتے تھے اور کبھی نہایت شدت کا اختلاف کرتے تھے۔ جی تو چاہتا تھا کہ ڈاکٹر صاحب کچھ دیر اور بیٹھیں کیونکہ ان کی باتیں ہم لوگوں کے لیے نہایت سود مند اور دلچسپ تھیں۔ مگر مراد پور کی مسجد سے مغرب کی اذان ہوئی اور جلسہ ختم ہو گیا۔

○

راج بھون تاریخی بھی ایک خاص نوعیت اور اہمیت رکھتا ہے۔ یہ ریاست کی ثقافتی اور نیم سیاسی زندگی کا مرکز ہوتا ہے۔ سرکار کا فرض ہے کہ اس کے واجب اخراجات کو فراخ دلی سے برداشت کرے۔ آج کل تو اکثر کہا جاتا ہے کہ گورنر کا عہدہ بیکار ہو چکا ہے اور یہ عہدہ اگر قائم ہی رکھا جائے تو راج پال جی کو کسی چھوٹے مکان میں منتقل کر دیا جائے کوئی کہتا ہے کہ راج بھون کی عمارت میں گوشالہ کا صدر دفتر قائم کر لیا جائے یا اس میں دھرم شاستر کی کتابوں کا عجائب گھر کھول دیا جائے۔ جیسی عقل ویسی باتیں۔

ڈاکٹر صاحب کے آنے سے پہلے راج بھون کی رونق میں کمی آ چکی تھی۔ جب ڈاکٹر صاحب تشریف لائے تو نقشہ ہی بدل گیا۔ فراش، چپراسی، جمعدار، چوبدار وغیرہ صاف سفید کپڑوں میں ملبوس نظر آنے لگے۔ راج بھون کی برساتی کے دوسری جانب جو کہ عرصۂ دراز سے گورنر سے ملنے والوں کے لیے مخصوص تھا فرنیچر سے آراستہ کیا گیا اور نامور قومی لیڈروں کی تصویروں سے مزین ہوا۔ اس انتظام سے گورنر کے ملنے والوں کو بہت سہولت ہو گئی اور ان کو ADC کے کمرہ میں بیٹھنے کی حاجت باقی نہ رہی۔ اکثر لوگ ADC کے کمرہ میں بیٹھ کر انتظار کرنا پسند نہیں کرتے تھے ڈاکٹر صاحب کی آمد نے راج بھون کو ایک نئی زندگی بخشی۔ اس زمانہ میں کرنل بھٹناگر گورنر کے ملٹری سکریٹری تھے اور ایک نہایت تجربہ کار افسر تھے۔ ڈاکٹر صاحب کی ہمت افزائی کی بدولت راج بھون کے ہر دفتر اور شعبہ میں انھوں نے ایسی درستگی لائی جس کو لوگ اب تک یاد کرتے ہیں۔ دعوتوں کا سلسلہ شروع ہو گیا۔ ڈاکٹر صاحب نے ہدایت کر دی کہ اخراجات اگر اس رقم سے جو گورنر کے مصارف کیلئے دی جاتی ہے (Governor's sumptuary allowance) سے زیادہ ہو جائے تو اس کمی کو میری تنخواہ سے پورا کر دیا جائے۔

ڈاکٹر صاحب کے گورنر ہونے کے بعد جو پہلی گارڈن پارٹی ۲۶ جنوری کو دی گئی وہ نہایت شاندار تھی۔ لان کی سرسبزی دیدہ زیب تھی اور موسمی پھول اپنی کیاریوں میں بہار دکھا رہے تھے۔ کل عمائدین شہر پارٹی میں موجود تھے اور ریاست کے اکثر اضلاع سے بھی مہمان آئے تھے۔ ایک نئی بات یہ ہوئی کہ ریاست کے بہت سے سینئر پروفیسر و دیگر بلائے گئے اس سے پہلے اکثریت سرکاری ملازمین اور ممبران اسمبلی اور کونسل کی ہوا کرتی تھی۔ جن لوگوں نے کچھ عرصہ سے راج بھون کی پارٹیوں میں آنا ترک کر دیا تھا وہ بھی شوق سے آئے۔ گورنر کا عہدہ نہایت عزت و قدر کا عہدہ ہوتا ہے۔ ڈاکٹر صاحب کے ایسا شریف انسان جب گورنر بہار ہو کر آیا تو ان سے ملنے کی تمنا ہر مہمان کے دل میں تھی۔ وقت معین پر ڈاکٹر صاحب پارٹی میں تشریف لائے وہ چوڑی دار پائجامہ سیاہ رنگ کی شیروانی اور اسی رنگ کی ٹوپی پہنے ہوئے تھے۔ ان کے آتے ہی جھنڈ

نے جن ٹن گن کی دھن بجائی اور اس کے بعد مہمان ناشتہ کی میزوں کی طرف گئے۔ ناشتہ نہایت پُرتکلف تھا۔ انگریزی اور ہندوستانی مٹھائیاں اور پھل موجود تھے۔ مہمانوں نے گاجر کا حلوہ جس کو ڈاکٹر صاحب نے شوق سے منوایا تھا خوب کھایا اور پسند کیا۔ اعلیٰ قسم کا سگریٹ اور سگار سے مہمانوں کی تواضع کی گئی۔ ناشتہ کے بعد ڈاکٹر صاحب مہمانوں سے ملنے گئے۔ ان میں اکثر بہت سے لوگوں سے واقف تھے۔ ڈاکٹر صاحب سے ملنا شروع کیا۔ اس وقت مسٹر الکھ رائے سنہا، سابق انسپکٹر جنرل پولیس، پرنسپل معین الحق، پنڈت امرناتھ ٹھاکر، مسٹر وشنو کانت جھا، فادر... اور ایسے ہی چند اشخاص کو ڈاکٹر صاحب نے بلایا۔ جب میں ڈاکٹر صاحب سے ملا تو انھوں نے مجھ سے میری اہلیہ کی خیریت دریافت کی جو ان دنوں سخت علیل تھیں۔ آج کل گورنر کے ملٹری سکریٹری بہت کم لوگوں سے واقف ہوتے ہیں اور مہمانوں کو گورنر سے ملانے میں ان کو دشواری ہوتی ہے۔ پہلے کا دستور اچھا تھا کہ دعوت نامہ کے کارڈ کے ساتھ ایک چھوٹا سا تعارفی کارڈ جس پر مہمان کا نام اور پتہ درج ہوتا بھیجا جاتا تھا گورنر کے سامنے ملٹری سکریٹری اس چھوٹے کارڈ کو پڑھ دیتا تھا اور نہایت آسانی سے تعارف ہو جاتا تھا۔ اب تو مہمان کو خود ہی اپنا نام اور پتہ بتا کر تعارف کرانا ہوتا ہے۔ آج کل ان جلسوں میں لباس کی کوئی پابندی باقی نہیں رہی۔ پہلے تو سب لوگ سیاہ رنگ کی شیروانی یا سیاہ کوٹ پہن کر آتے تھے۔ گرمیوں میں لباس کا رنگ سفید یا بادامی ہوتا تھا۔ یہ رسمی دربار کے ختم ہونے پر میں مرحوم بھائی عبدالجلیل صاحب ... کو ساتھ لے کر گھر واپس آیا۔ راستہ بھر بھائی جلیل ڈاکٹر صاحب کی جامعہ ملیہ کی قدیم باتوں کو یاد دلاتے آئے اور ان کی شفقت اور رعایت کا تذکرہ بہت شوق سے کیا۔ یہ بھی یاد دلایا کہ ڈاکٹر ذاکر صاحب شروع میں کس جفاکشی کی زندگی گذارتے تھے اور جامعہ ملیہ سے جامع مسجد پیادہ جایا کرتے تھے۔ لباس بھی نہایت موٹے اور معمولی کپڑوں کا ہوا کرتا تھا اور موٹے کپڑے کی اونچی ٹوپی جواب گاندھی ٹوپی میں بدل گئی ہے۔

○

اپنے عقیدے کی بنا پر مجھے ایک مرتبہ ڈاکٹر صاحب کی دعوت میں شریک ہونے سے انکار کرنا پڑا۔ بات یوں ہوئی کہ نیپال کے کوئی رانا پٹنہ آئے تھے اور ڈاکٹر صاحب نے ان کو رات کے کھانے پر مدعو کیا تھا۔ مسلمانوں میں لیڈی امام، نواب زادہ سید محمد مہدی، ڈاکٹر عبدالحئی اور میں بلایا گیا تھا۔ ڈاکٹر عبدالحئی دعوت میں شریک ہوئے۔ لیڈی امام، نواب زادہ سید محمد مہدی اور میں نے کھانے میں شرکت نہ کی۔ دعوت کی رات شب عاشورہ تھی اس لیے ہم لوگوں کا دعوت میں جانا ناممکن تھا۔ لیڈی امام نے خط لکھ کر دعوت میں شریک ہونے سے انکار کیا اور یہ بھی لکھا ہے کہ شب عاشورہ میں مسلمانوں کو دعوت پر بلانا ان کے عقائد کو مجروح کرنا ہے۔ بیگم نواب زادہ صاحب نے دریافت کیا کہ کیا جواب دیا جائے؟ نواب زادہ نے جو لیڈی امام کے جواب سے باخبر تھے مجھ سے کہا کہ لکھ دیا جائے کہ دوران عشرہ محرم میں کسی دعوت میں

شریک نہیں ہوتا ہوں۔ اس لیے میری عدم حاضری معاف کی جائے۔ نواب رضا نے خود بھی اسی طرح کا جواب روانہ کیا اور بات ختم ہو گئی۔

کچھ عرصہ پہلے تک یہ دستور تھا کہ جو لوگ گورنر سے ملتے یا ان کے یہاں دعوتوں میں شریک ہوتے ان کے نام "راج بھون" کی طرف سے پٹنہ کے اخباروں میں شائع کر دیے جاتے تھے۔ اس خبر کو دیکھ کر کہ ڈاکٹر عبدالحق بھی شریک تھے، کچھ لوگوں نے اعتراض کیا اور مختلف طرح کے تبصرے ہوئے۔ میں تو اس واقعہ کو بھلا چکا تھا اور اس میں میری کوئی دلچسپی باقی نہ رہی تھی۔ کچھ عرصہ تک میری ملاقات ڈاکٹر صاحب سے نہ ہو سکی۔ ایک دن ڈاکٹر صاحب کا خط آیا کہ میں "راج بھون" آکر ان کتابوں کو دیکھوں جن کو مسٹر ایس۔ وی۔ سوہنی آئی۔ سی۔ ایس موقع کو ضلع شاہ آباد سے لائے تھے۔ یہ کتابیں میرے دوست الحاج خان محمد بلگرامی کی ملکیت تھیں اور ان سب کتابوں کو وہ خدا بخش لائبریری میں فروخت کرنا چاہتے تھے۔ ہر قسم کی کتابیں تھیں جن میں کچھ اچھی کتابیں بھی مجھے نظر آئیں۔ میں نے ان کتابوں کو قریب تین گھنٹے دیکھ کر اچھی قیمت لگا دی جو اس قیمت سے کچھ زیادہ تھی۔ جو ایک صاحب پہلے لگا چکے تھے۔ جب یہ کام ختم ہو گیا تو ڈاکٹر صاحب مجھے اپنے کمرے میں لے گئے اور دوران شب عاشورہ کی دعوت کا تذکرہ آ ہی گیا۔ ایسا معلوم ہوا کہ ڈاکٹر صاحب کو ہم لوگوں کی غیر حاضری پر افسوس تھا۔ وہ بتانے لگے کہ شب عاشورہ ایک برکت والی رات ہے۔ ہم اس رات کو مبارک رات تصور کیا کرتے ہیں۔ اور لوگ شوق سے دعوتوں میں شریک ہوتے ہیں۔ میں ڈاکٹر صاحب کے سامنے کیا بولتا؟ تھوڑی دیر چپ رہنے کے بعد نہایت ادب کے ساتھ میں نے عرض کیا کہ شب عاشورہ تو میرے لیے غم کی رات ہے میں کیسے دعوت میں شریک ہو سکتا تھا۔ کھانا تو بہت دور کی بات ہے میں تو غم امام مظلوم میں شب عاشورہ میں پانی تک نہیں پیتا ہوں۔ ڈاکٹر صاحب کچھ بولنا چاہتے تھے معلوم نہیں کیوں خاموش ہو گئے اور دوسری دوسری باتیں کرنے لگے۔ مغرب کا وقت نزدیک تھا میں اجازت لے کر گھر کے لیے روانہ ہو گیا۔ ڈاکٹر صاحب اپنے عقیدوں کا اظہار خواہ وہ مذہبی ہوں یا سیاسی نہایت دلیری سے کیا کرتے تھے۔

○

۱۹۶۲ء تک بحیثیت پرنسپل پٹنہ کالج میں رسل میموریل ٹرسٹ کا سکریٹری تھا۔ مسٹر چارلس رسل ۱۹۰۳ء سے ۱۹۱۱ء تک پٹنہ کالج کے پروفیسر اور پرنسپل رہے۔ دوران پہلی جنگ عظیم مسٹر چارلس رسل وطن کی خاطر انگریزی فوج میں جو جنرل الن بی کی کمان میں تھی داخل ہو گئے۔ اور دوران جنگ نہایت گراں بہا خدمات انجام دیے ہیں۔ ۲۲ نومبر ۱۹۱۷ء کو جب انگریزی فوج حملہ آور ہو کر یروشلم کی فصیل تک پہنچ چکی تھی اور فتح رسل کی نظروں کے سامنے تھی تو دشمن کی ایک گولی نے ان کی زندگی کا خاتمہ کر دیا۔ ایسے بہادر دانشور کی یاد میں اس کے چند دوستوں نے یہ ٹرسٹ قائم کیا ہے۔ اس ٹرسٹ کی آمدنی سے کسی موضوع پر جس کا تعلق ادب یا فلسفہ یا سائنس سے ہو لکچر کرایا جاتا ہے۔ اور یہ لکچر "رسل لکچر" کے نام سے موسوم ہیں۔ یہ لکچرس آکسفورڈ

یونیورسٹی پر یہ بات ثابت ہو گئی ہے کہ منصب وائس چانسلر کے لیے کسی نہایت قابل و ناموَر شخص کا انتخاب ہوتا ہے۔ ۱۹۶۱ء میں
مقرر کا انتخاب کرنے کے لئے ڈاکٹر صاحب کی مرضی پر چھوڑ دیا گیا۔ وہ پٹنہ یونیورسٹی کے چانسلر تھے۔ ڈاکٹر صاحب نے اس کام
کے لیے پروفیسر ہمایوں کبیر کو منتخب کیا جو کہ مرکزی حکومت میں منسٹر تھے اور اپنی علمی قابلیت کے لیے مشہور تھے۔ اس
انتخاب سے مجھے بہت خوشی ہوئی کیونکہ پروفیسر موصوف میرے دیرینہ دوست تھے اور مرتے دم تک ان کی اور
میری دوستی برقرار رہی۔ پروفیسر ہمایوں کبیر کے لیے لکچر کا موضوع مرزا ابو طالب خان تھا۔ جو اپنے زمانے کے بلند دانشور
سیاح اور مورخ تھے۔ اپریل ۱۹۶۱ء کو یہ جلسہ پٹنہ کالج میں ہوا۔ چونکہ دو بڑے دانشور یعنی ڈاکٹر ذاکر حسین اور پروفیسر
ہمایوں کبیر کی شرکت ہونے والی تھی تو عقیدت مندوں کا بڑا مجمع ہوا اور جلسہ کا انتظام جگہ کی کمی کے باعث بس گارڈن کے
کھلے میدان میں کرنا پڑا۔ پہلے ڈاکٹر ذاکر حسین مرحوم نے اپنا خطبہ صدارت پڑھا جو کہ نہایت عالمانہ تھا اور حاضرین نے
نہایت شوق سے سنا اور خوب داد دی۔ ڈاکٹر صاحب نے اپنے خطبہ میں افلاطون سے لے کر ٹیگور اور مولانا آزاد تک کا
تذکرہ کیا اور بتایا کہ کس طور سے ان بزرگوں نے عوام کی خدمت کی ہے۔ اور باوجود اپنی برتری کے کبھی بھی عوام الناس سے
الگ نہیں رہے۔ ڈاکٹر صاحب نے فرمایا

These giants of the spirit had not been able to persuade themselves into an attitude of indifference towards the society of common man in which they lived and had their being. Man and affairs have claimed their attention and political thinking as well as political actions have been enriched by their participation

پھر پروفیسر ہمایوں کبیر نے اپنا خطبہ پڑھا اور اس کے ختم ہونے پر ہم لوگ چائے کی دعوت میں شریک ہوئے
جس کا اہتمام پٹنہ یونیورسٹی نے کیا تھا۔ اس دعوت میں حاضرین سے ڈاکٹر صاحب انیسویں صدی کے مورخوں اور دانشوروں
کا تذکرہ کرتے رہے۔ ان کی گفتگو کو لوگوں نے خوب جی لگا کر سنا۔ کل کام ختم ہو جانے کے بعد میں پروفیسر ہمایوں کبیر
کے ساتھ راج بھون گیا جہاں ڈاکٹر صاحب نے چند مہمانوں کو رات کے کھانے پر مدعو کیا تھا۔ اور مجھے بھی اس
دعوت میں شریک ہونا تھا۔ اس رات ڈاکٹر صاحب کے ٹیبل ٹاکس کا طرز گفتگو بالکل بدلا ہوا تھا۔ جو باتیں ہوئیں وہ سب
کی سب نہایت عالمانہ تھیں۔ ڈاکٹر صاحب نے مرزا ابو طالب کے دیوان کا تذکرہ کیا جس کا انگریزی ترجمہ ۱۸۰۷ء میں لندن
میں شائع ہوا تھا۔ اور ابو طالب کے کچھ اشعار بھی سنائے اس کے بعد فرمایا کہ مرزا ابو طالب خاں کی چند تصنیفوں کے

لیے جیا میں مہاراجہ ٹیکاری کے کتب خانہ میں موجود ہیں۔ مہاراجہ ٹیکاری کا کسی زمانے وقت میں ایک مشہور کتب خانہ تھا جہاں بہت کم یاب نادر کتابیں مل جاتی تھیں۔ جب ٹیکاری کے کتب خانہ کا تذکرہ آیا تو میں نے عرض کیا کہ بہار میں زمینداری کے خاتمے سے بہت سی اچھی چیزیں بھی ختم ہوگئیں، اور ہوسکتا ہے کہ ٹیکاری راج کے خاتمے کے بعد اس کتب خانہ کا بھی خاتمہ ہوگیا ہو۔ ڈاکٹر صاحب نے کتب خانہ کے بارے میں دریافت کرنے کو کہا تھا۔ شاید بھول گئے، اور کوئی بات معلوم نہ ہوسکی۔ مہاراجہ کے کتب خانے میں میری ذاتی دلچسپی تھی کیونکہ تقریباً سوا سو سال پہلے میرے خاندان کے ایک بزرگ سید نجم الدین صاحب مہاراجہ کے دیوان تھے۔ اور نہایت ہی علم دوست انسان تھے۔ انھوں نے کتب خانہ میں بہت کچھ توسیع کی تھی، اور ان کے زمانہ میں یہ کتب خانہ اپنی نوادرات کے لیے مشہور ہوگیا تھا۔ سید نجم الدین صاحب کا تذکرہ کرنل سلیمن نے اپنی کتاب Rambles & Recollections میں کیا ہے۔ ڈاکٹر صاحب کی عالمانہ باتیں جب اس مدراتی کے دور میں یاد آتی ہیں تو نہایت دکھ ہوتا ہے۔ اب ایسے لوگوں کا ملنا ناممکن ہے۔

○

دسمبر ۱۹۶۱ء میں خان بہادر عبید الرحمن شروانی علی گڑھ سے ڈاکٹر صاحب کے اصرار پر پٹنہ تشریف لائے اور مہمان خصوصی کی حیثیت سے "راج بھون" میں ٹھہرے۔ ڈاکٹر صاحب نے مجھے ٹیلیفون کرکے کہا کہ میں خان بہادر کو پٹنہ کالج اور پٹنہ یونیورسٹی کے دوسرے تعلیمی اداروں کو دکھا دوں۔ خان بہادر عرصہ دراز سے علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے خازن تھے اور ان کو پٹنہ یونیورسٹی کی درسگاہوں میں خاص دلچسپی تھی۔ میں خان بہادر کو سید اکبر حسین کے ہمراہ حوالہ جوں پٹنہ یونیورسٹی کے خازن تھے اکثر درسگاہوں کو دکھا کر "راج بھون" واپس لایا۔ ڈاکٹر صاحب نے ہم لوگوں کا شکریہ ادا کیا۔ اور پھر پٹنہ کالج کے متعلق باتیں ہونے لگیں۔ ڈاکٹر صاحب نے پٹنہ کالج کی صد سالہ خدمتوں کا تذکرہ کیا اور کالج کے چند نامی استادوں کو بھی یاد کیا۔ خصوصاً استاد محترم ڈاکٹر عظیم الدین احمد کا تذکرہ دیر تک ہوتا رہا۔

۱۳ دسمبر کی رات کو خان بہادر عبید الرحمن کے اعزاز میں ایک دعوت ہوئی جس میں دس مہمانوں نے شرکت کی کھانے کی میز کا نقشہ میرے پاس بطور یادگار محفوظ ہے۔ کمشنا اگر صاحب نے مہمانوں کا استقبال کیا۔ اور ہم لوگوں کو کھانے کے کمرہ میں لے گئے۔ بہت جلد ڈاکٹر صاحب بھی تشریف لائے اور کل مہمانوں سے مل کر ان کی مزاج پرسی کی۔ ایک دو مہمانوں سے کچھ عرصہ پر ملاقات ہوئی تھی اس لیے ان سے دیر تک باتیں کیں۔ یہ ڈاکٹر صاحب کا پرانا دستور تھا۔ اس طرح کی وضع داریوں کو ڈاکٹر صاحب نے آخر دم تک قائم رکھا۔ ڈاکٹر صاحب ایک خوش گفتار آدمی تھے اور نہایت ہی دلچسپ انداز سے باتیں کرتے تھے۔ اس رات بھی ڈاکٹر صاحب نے کھانے کی میز پر اپنے ٹیبل ٹاکس سے سب لوگوں کو بےحد خوش کیا۔ کھانے کے

دوران مہمانوں کو طرح طرح کے قصے سنا کر ہنساتے رہے۔ ایک نواب صاحب کا قصہ سنایا جن کو ایک ہنرمند باورچی کی ضرورت
تھی۔ نواب صاحب نے لکھنؤ جا کر چند اچھے باورچیوں میں سے ایک کا انتخاب کیا اور اس کو اپنے گھر لے گئے۔ گھر آ کر نواب
صاحب نے باورچی کو حکم دیا کہ وہ جو سب سے اچھا کھانا پکا سکتا ہے اسے پکا کر دسترخوان پر لائے۔ نواب صاحب نے یہ بھی
فرمایا کہ کھانا پکانے کے متعلق اسے کوئی ہدایت نہیں دی جائے گی۔ اور جو سب سے اچھا کھانا پکا کر دسترخوان پر حاضر کرنا ہوگا۔ حسبِ
ہدایت باورچی نے نہایت اچھی چپاتیاں اور نہایت خوش مزہ اور خوش رنگ قورمہ پکا کر دسترخوان پر لایا۔ نواب صاحب نے
ان کو شوق سے نوش جان فرما کر باورچی کی تعریفیں کیں۔ دوسرے دن باورچی نے پھر وہی چپاتیاں اور قورمہ نواب صاحب کے
دسترخوان پر حاضر کیا۔ نواب صاحب نے نہایت برہم ہو کر فرمایا کہ میں تم کو ایک ہنرمند باورچی تصور کرتا تھا مگر اب معلوم ہوا کہ
تم چپاتی اور قورمہ کے سوا کچھ نہیں پکا سکتے ہو۔ باورچی نے ہاتھ جوڑ کر عرض کیا کہ قورمہ اور چپاتی شریفوں کا کھانا ہے اور باقی
چیزیں نوابوں کے چونچلے ہیں۔ ڈاکٹر صاحب نے ایک دوسرا قصہ حبش کی عورتوں کا سنایا۔ حبش کی عورتوں میں کھانے کے بعد
ہر مہمان کو ایک چورن کی شیشی دی جاتی تھی۔ خدانخواستہ اگر کسی مہمان کو کھانے کے بعد بدہضمی ہو جائے تو چورن کھا کر
اپنی تکلیف کو دور کرے۔ اس قصہ پر خوب ہنسی ہوئی اور کسی نے کہا کہ آپ کی باتوں نے ہم لوگوں کو ہنسا کر دسترخوان
پر ہی کھانا ہضم کر دیا۔ ان سب قصوں کے بعد ڈاکٹر حسین صاحب میری طرف متوجہ ہوئے۔ میں پندرہ سال تک خدا بخش
لائبریری کی مجلس انتظامیہ کا ممبر رہ چکا تھا اور کتابوں کی خریداری میں مجھ سے بھی مشورہ طلب کیا جاتا تھا اور میرے
کہنے پر مسٹر الیسا وی سوہتی آئی۔سی۔ایس اکثر کتابیں خریدا کرتے تھے۔ ڈاکٹر صاحب کہنے لگے کہ ایک شاہ صاحب کے
پاس کلام مجید کا نہایت عمدہ قلمی نسخہ ہے جس کی قیمت پانچ ہزار روپے مانگتے ہیں۔ میں نے عرض کیا کہ قیمت زیادہ معلوم ہوتی
ہے۔ ڈاکٹر صاحب نے فرمایا کہ سب باتوں کو سن کر اس کی قیمت لگایئے۔ میں خاموش ہو گیا۔ اور ڈاکٹر صاحب کی باتوں کو
سننے لگا۔ ڈاکٹر صاحب نے سلسلۂ گفتگو جاری رکھتے ہوئے کہا کہ شاہ صاحب فرماتے ہیں کہ حضرت امام حسین جس کپڑے میں
شہید ہوئے تھے۔ اسی کپڑے سے اس کلام مجید کا جزدان بنایا گیا ہے چونکہ جزدان اتنے متبرک کپڑے سے بنایا گیا ہے لہٰذا
دو سو جنات اس نسخہ کے لیے ہمیشہ پہرہ داری کرتے رہتے ہیں۔ میں نے عرض کیا کہ یہ نسخہ خدا بخش لائبریری کے لیے ضرور خرید لیا
جائے کیونکہ لائبریری کو دو سو پہرے دار بلا تنخواہ کے مل جائیں گے۔ اس پر خوب ہنسی ہوئی۔ ڈاکٹر صاحب نے پھر فرمایا کہ
ایک خانقاہی شاہ صاحب کے پاس اور بھی اسی طرح کی ٹوپی ہے اور عیدین کے موقع پر اس کو پہن کر نماز کے لیے جایا کرتے
ہیں۔ اگر رکوع اور سجود میں ان کے سر سے ٹوپی گرنے لگتی ہے تو دو جنات جو ان کے ساتھ ہمیشہ موجود رہتے ہیں ٹوپی کو گرنے
سے بچا لیتے ہیں۔ نہایت ہنسی خوشی سے کھانا ختم ہوا اور ہم لوگ ڈاکٹر صاحب کا شکریہ ادا کرتے ہوئے گھر روانہ ہوئے۔ ڈاکٹر

صاحب کی خوش مذاقی اور خوش گفتاری اکثر یاد آتی ہے۔ ان کے پاس سے ہٹنے کا جی نہیں چاہتا تھا۔

O

بہار میں پانچ سال گورنر رہنے کے بعد ڈاکٹر صاحب جمہوریۂ ہند کے نائب صدر بنائے گئے۔ اس تقرری سے سارے ملک میں لوگوں کو خوشی ہوئی خصوصاً بہار میں تو بڑے اطمینان کا اظہار کیا گیا۔ سارے صوبے سے ہر طبقہ کے لوگ ڈاکٹر صاحب کو مبارکباد دینے کے لیے "راج بھون" جانے لگے۔ اور ڈاکٹر صاحب بھی ان لوگوں سے نہایت خندہ پیشانی سے ملتے اور شکریہ ادا کرتے۔ میرے لیے تو "دلی دور است" والا مضمون پیدا ہو گیا۔ اور مجھے پانچ سال سے جو قربت نصیب تھی وہ اب جلد ہی ختم ہونے والی نظر آنے لگی۔ اس کا مجھے افسوس تھا سرکاری اعلان کے دس روز بعد جب میں ڈاکٹر صاحب کو اپنی مبارکباد پیش کرنے گیا تو تقریباً تیس طلبا قدیم و جدید جامعہ ملیہ اور علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے ڈاکٹر صاحب کو مبارکباد دینے گئے تھے۔ جامعہ ملیہ کے طلبا تو ڈاکٹر صاحب سے ہمیشہ والہانہ محبت کرتے تھے۔ اور مسلم یونیورسٹی کے طلبا بھی باوجود چند اختلافات کے ان کا نہایت احترام کرتے تھے۔ ان لوگوں کے ہاتھوں میں خوشبودار پھولوں کے گلدستے تھے جن کو ڈاکٹر صاحب کی خدمت میں پیش کیا۔ سارا کمرہ معطر تھا۔ اور ڈاکٹر صاحب ان لوگوں سے نہایت شفقت سے باتیں کر رہے تھے۔ اور ہر کا حال دریافت کر رہے تھے۔ جب ملاقات ختم ہوئی تو ڈاکٹر صاحب نے طلبا کے ساتھ برساتی تک آکر ان لوگوں کو رخصت کیا۔ تھوڑی دیر بعد میں بھی ڈاکٹر صاحب سے اجازت لے کر واپس ہو گیا۔ میں نے بہار میں گورنروں اور کالوں کی حکومت کا دور خوب دیکھا ہے۔ تیس سال کے سن سے "گورنمنٹ ہاؤس" جاتا رہا ہوں اور پچاس سال سے ہر گورنر سے ملاقات کا شرف حاصل ہوا ہے۔ مگر ڈاکٹر صاحب کے مقابلہ کا کوئی گورنر مجھے نہیں ملا۔ میرا اپنا خیال ہے کہ "راج بھون" کو ڈاکٹر صاحب جیسا گورنر نہ ملا ہے اور نہ ملے گا۔ میں بے ساختہ زبان سے نکلتا ہے کہ "بسیار خوبان دیدہ ام اما تو چیزے دیگری" میں اس صاف گوئی کے لیے معافی چاہتا ہوں۔ ڈاکٹر صاحب کی طبیعت کی منکساری کا یہ حال تھا کہ جو بھی ان سے ملا ان کو اپنا سمجھنے لگتا تھا۔ اس سلسلہ میں ایک واقعہ یاد آ گیا ایک مرتبہ Wheeler Senate Hall میں جرمن کتابوں کی نمائش ہوئی۔ ڈاکٹر صاحب کو ایک جرمن نوجوان دکھا رہا تھا۔ اور ڈاکٹر صاحب اس سے جرمن زبان میں باتیں کر رہے تھے۔ جب ڈاکٹر صاحب چلے گئے تو میں نے اس نوجوان سے انگریزی زبان میں پوچھا: " How do you like our Governor " اس نے فوراً جواب دیا کہ: " Excellent. He is one of us.! " ڈاکٹر صاحب کی روانگی کے قبل ہمارا اسٹیٹ گیسٹ ہاؤس کے میدان میں ایک نہایت شاندار الوداعی جلسہ منعقد ہوا جس میں ہر پیشے اور ہر طبقے کے لوگوں نے کثیر تعداد میں شرکت کی جلسہ

کی صدارت وزیر اعلیٰ نے کی۔ وزیر ڈاکٹر صاحب کی خوبیوں کا تذکرہ کرتے ہوئے انھوں نے پرزور الفاظ میں کہا کہ ڈاکٹر صاحب نے
اپنی ذات سے کسی کسی کو تکلیف نہیں پہنچائی ہے اور اس معاملے میں ہر شخص ان کا مداح رہا ہے۔ ان کی وسعت نظری، علمی لیاقت
اور خاکساری سے ہر شخص بہت جلد ان کا گرویدہ ہو جاتا ہے۔ صوبہ بہار سے ان کا دیرینہ سروکار رہا ہے اور گزشتہ پانچ سالوں
میں ڈاکٹر صاحب نے بہار کے لوگوں کے لیے بہت کچھ کیا ہے۔ اس جلسہ میں اتنی کثیر تعداد میں لوگوں کی شرکت ڈاکٹر صاحب
کی ہر دلعزیزی کا ایک بین ثبوت ہے۔ ایسا خیال ظاہر کرتے ہوئے وزیر اعلیٰ نے نہایت جذباتی انداز میں کہا کہ ڈاکٹر صاحب
جیسے لوگ اب بہت کم ملتے ہیں۔ آخر میں ڈاکٹر صاحب کی صحت اور کامیابی کی دعا کی اور امید ظاہر کی کہ ڈاکٹر صاحب
بہار اور بہار کے لوگوں کو کبھی فراموش نہیں کریں گے۔ ڈاکٹر صاحب نے اپنی جوابی تقریر میں بہار اور بہار کے لوگوں سے
اپنی محبت کا اظہار کیا اور فرمایا کہ گزشتہ پانچ سالوں میں بہار کے ہر چھوٹے بڑے لوگوں نے کل کاموں میں ان سے پورا تعاون
کیا ہے جس کے لیے وہ نہایت مشکور ہیں۔ بہار کا تذکرہ کرتے ہوئے انھوں نے فرمایا کہ زمانہ قدیم سے اس صوبہ کا بلند مقام
رہا ہے۔ اور ہمیشہ سے یہ تہذیب اور تمدن کا گہوارہ رہا ہے۔ قدرت نے اس صوبہ کو معدنیات کے ذخیرے سے مالامال
کر رکھا ہے۔ اور وہ دن دور نہیں جبکہ ان خزانوں کی بدولت بہار جدید دور میں بھی سر بلند رہے گا۔ اپنی تقریر کو بہار اور بہار
کے لوگوں کے لیے فلاح اور بہبود کی دعا پر ختم کیا۔ جلسہ کے اختتام پر ہر شخص ڈاکٹر صاحب سے مصافحہ کرنے کے لیے بیتاب
نظر آرہا تھا اور قریب آدھ گھنٹے تک وہ عام جلسے میں ملتے رہے۔ میں نے ایسا شاندار الوداعی جلسہ کسی گورنر کے اعزاز میں نہیں دیکھا تھا۔
پبلک جلسہ کے چند دنوں بعد ڈاکٹر صاحب نے "راج بھون" میں اپنی طرف سے ایک الوداعی دعوت دی تقریباً
ڈیڑھ سو مہمان رات کے کھانے پر بلائے گئے تھے۔ کھانا ضیافت کے کمرہ (Banquet Hall) میں ہوا یہ کمرہ
"راج بھون" میں نہایت خوبصورت کمرہ ہے جس کی دیواریں کاٹھ کے پینل سے مڑی ہیں۔ میری دانست میں شاید ہی
کسی گورنر نے اس کمرے میں دعوت دی ہو۔ ڈاکٹر صاحب مہمانوں کے خیر مقدم میں مصروف تھے اور کھانا ختم ہونے
پر انھوں نے مہمانوں سے ہاتھ ملا کر الوداع کہا۔ ڈاکٹر صاحب کی یہ آخری دعوت تھی جو "راج بھون" میں ہوئی۔ جب میں اور مسز
سو ہی گھر جانے کے لیے روانہ ہوئے تو ہم دونوں کی آنکھیں نم تھیں کیونکہ ڈاکٹر صاحب ہم لوگوں سے بہت دور
جا رہے تھے۔

ہزاروں سال نرگس اپنی بے نوری پہ روتی ہے
بڑی مشکل سے ہوتا ہے چمن میں دیدہ ور پیدا

قاضی معزالدین احمد
(سابق ہیڈ ماسٹر [illegible])
مصنف [illegible]

انیسویں صدی میں ہندوستان میں جدید علوم کی تعلیم کا سلسلہ شروع ہوا تو ملکی حالات کے تحت مسلمانوں
نے بھی جدید علوم حاصل کرنے کی طرف قدم اٹھایا لیکن جدید تعلیم مسلمانوں میں مقبول ہوئی اور اسکول و کالج کے
ساتھ ساتھ دارالعلوم بھی قائم رہے۔ مسلمانوں کے نظام تعلیم کی بنیاد دینی علوم پر ہے۔ ایسی تعلیم جس کا انگریزی معاشرت کی
بنیادوں سے کوئی تعلق نہ ہو وہ کیسے خوش دلی سے قبول کر لیتے؟ لیکن وقت کی ضرورت کو کب تک نظر انداز کیا
جا سکتا تھا؟ چنانچہ "بہت جلد" ہندوستانیوں نے بھی جدید تعلیم حاصل کرنے کی تحریک [illegible] شروع ہوئی تو جدید
و قدیم نظام تعلیم کو ملا کر ایک نیا نظام تعلیم تیار کیا گیا اور ایک نئی درسگاہ جامعہ ملیہ اسلامیہ کے نام سے
قائم کی [illegible] میں راقم کو [illegible] بھی درسگاہ میں داخل کرنے کا سلسلہ [illegible] جامعہ ملیہ کے قیام کی ہر حالات میں
دیکھ کر اس درسگاہ کو راقم کے لئے منتخب کیا گیا۔

جامعہ ملیہ کے ابتدائی درجات میں چند ہی طالب علم تعلیم حاصل کرتے تھے۔ ان میں سے ایک محمود حسین خاں تھے
ان سے راقم کی [illegible] دوستی ہو گئی۔ دن کا کچھ حصہ انہی کے ساتھ گزرتا۔ ان دنوں ملک کی [illegible] جامعہ ملیہ اسلامیہ کی فضا
پر تحریک آزادی کا جوش و خروش غالب تھا۔ جامعہ کا ہر شخص اس سے متاثر تھا اور ہر وقت سیاسی حالات پر اپنی فہم
کے اعتبار سے تبصرہ کرتا رہتا تھا۔ اس زمانہ میں مسلمانوں پر مذہب کا شدید غلبہ ہوا۔ جو داڑھی منڈھاتے تھے انھوں
نے داڑھی رکھ لی۔ جو انگریزی لباس استعمال کرتے تھے، انھوں نے کوٹ پتلون، ہیٹ اور شوز کا استعمال ترک کر دیا۔ انگریزی
بال بھی ترشوا دیئے گئے۔ کرتا پاجامہ، اچکن یا صدری جو بعد میں جواہر کٹ کہلانے لگی اور پیروں میں چپل ان کے جسم
پر نظر آنے لگا۔ جامعہ ملیہ کے اساتذہ اور دیگر کارکن سب ہی ایک سی وضع قطع کے ہو گئے۔ سیاہ گھنی داڑھی سفید
کھدر کا لباس اور سر پر گاندھی ٹوپی۔ بڑے با اخلاق، بے حد مخلص، اسلام اور ہندوستان کی محبت میں سرشار، انگریزوں کے

دشمن، آزاد وطن کے شیدا۔ بس کیا کہا جائے، فرشتے اگر انسان کی صورت میں نمودار ہوتے تو انھیں جیسے ہوتے۔ ان سب حضرات میں ایک صاحب کو خصوصیت حاصل تھی۔ وہ آتے تو ان کی طرف سب ہی متوجہ ہو جاتے۔ ایسا محسوس ہوتا جیسے سب ہی ان کے انتظار میں ہوں۔ ہر شخص ان کا گرویدہ نظر آتا۔ راقم تو اسکول کا طالب علم تھا اور جامعہ میں نو وارد تھا اس کو ان بزرگ سے کیا دلچسپی ہوتی، بس اتنا معلوم ہو گیا کہ ان کا نام ذاکر حسین ہے اور پھر یہ بھی معلوم ہوا کہ میرے دوست محمود خاں کے یہ بڑے بھائی ہیں۔ مختصر یہ کہ محمود صاحب کی وجہ سے راقم کا ذاکر صاحب اور یوسف حسین خاں سے تعارف ہو گیا، اور یہ تعلق برابر قائم رہا، اور بڑھتا ہی گیا۔

ذاکر صاحب جامعہ میں اعلیٰ تعلیم کی کسی جماعت کو پڑھاتے تھے اسکول کے بچوں کی یہ خواہش ہوتی تھی کہ ان کو بھی وہ پڑھائیں یہ آرزو ایک بار پوری ہو گئی۔ اس دور میں جیسا کہ لکھ چکا ہوں کہ اساتذہ کو سیاست سے دلچسپی زیادہ اور تعلیم کی طرف توجہ کم تھی، اساتذہ سیاسی کاموں کے سلسلے میں کہیں جاتے تو جامعہ سے آسانی سے چھٹی مل جاتی، اور ٹائم ٹیبل بدل جاتا۔ جانے والے صاحب کی جگہ کوئی اور آجاتا۔ ایک بار نظام اوقات بدلا تو دیکھا کہ کلاس پیسے والوں میں ذاکر صاحب کا نام ہے ان کا نام دیکھ کر بہت خوشی ہوئی، لیکن ذاکر صاحب نے چند بار کلاس لی اور پھر ٹائم ٹیبل بدل گیا۔ کوئی اور صاحب پڑھانے آگئے۔

جامعہ کے طلبا اور اساتذہ علی گڑھ کی مختلف کوٹھیوں میں رہتے تھے۔ ذاکر صاحب کا قیام سگالی کوٹھی میں تھا یہ کوٹھی اب بھی ہے، لیکن کا نام بدل گئی ہے جامعہ کا دفتر جس کوٹھی میں تھا اور کلاسیں جہاں ہوتی تھیں، اس کا نام نشاط تھا۔ اسی کوٹھی کے میدان میں ایک ہال کچی مٹی کا جس پر معمولی چھپر ڈالا گیا تھا، تعمیر کر لیا گیا تھا جو ڈائننگ ہال کا بھی کام دیتا تھا، اور اسی میں جلسے بھی ہوتے تھے۔ اس ہال کا محمد علی ہال نام رکھا گیا تھا۔ جامعہ ملیہ کا پہلا کانوکیشن Convocation اسی ہال میں منعقد ہوا۔ حکیم اجمل خاں نے خطبہ دیا۔ ذاکر صاحب نے ایک تقریر کی۔ ذاکر صاحب اور حکیم صاحب نے کیا کہا یہ تو یاد نہیں بس اتنا یاد ہے کہ ذاکر صاحب کی تقریر کی بہت تعریف ہوئی اور حاضرین اس سے بہت متاثر ہوئے۔ ذاکر صاحب کی یہی خصوصیت تھی ہر موقع پر وہ لوگوں کو اپنی تحریر، تقریر اور گفتگو سے متاثر کرتے تھے۔ معمولی بات بھی خاص انداز سے کرتے۔ ان کا ہر لفظ دل کو گرما تا۔ سننے والوں کی خواہش ہوتی کہ وہ بولے جائیں اور ہم سنے جائیں۔

محمد علی ہال میں ہر کھانے اور ناشتہ پر سب طلبا جمع ہو جاتے۔ زمین پر دسترخوان بچھ جاتا اور سب بیٹھ کر کھانا کھاتے ذاکر صاحب اکثر صبح کے ناشتہ میں شرکت کرتے، اور حسب معمول دلچسپ باتیں ہوتیں۔ ایک دن خیال ہوا کہ جامعہ میں ڈیبیٹنگ سوسائٹی نہیں ہے، وہ ہونی چاہیئے۔ اس خیال کا اظہار سعید انصاری صاحب ندوی سے کیا۔ انھوں نے بڑی سرگرمی سے

اس خیال کی تائید کی۔ جامعہ میں چند روز اس کا چرچہ رہا۔ ایک روز جلسہ کا نوٹس آگیا، اور ایک ڈبیٹنگ سوسائٹی قائم ہو گئی۔ اسکول کے طلبا نے سب سے پہلے تقریریں کیں، پھر کالج کے طلبا بولے۔ ڈاکٹر کنور محمد اشرف نے جو تحریک آزادی کے آخری دور میں کانگریس سوشلسٹ پارٹی کے رکن تھے اور بعد میں کمیونسٹ پارٹی میں شریک ہو گئے تھے بڑی جوشیلی تقریر کی۔ ڈاکٹر صاحب کی آخر میں تقریر ہوئی۔ ان کی بڑی ٹھنڈی تقریر تھی۔ انھوں نے حاضرین کو ہر مسئلہ کو سمجھانے کی کوشش کی۔ دونوں تقریریں حاضرین کو پسند آئیں، لیکن ڈاکٹر صاحب کی تقریر کی حلاوت نے سب کو مسحور کیا۔

ڈاکٹر صاحب بہت صاف ستھرے کپڑے پہنتے۔ ان کے کپڑوں پر شکن کبھی نہیں دیکھی گئی۔ گرمی ہو یا سردی اچکن کے سب ہی بٹن لگانے کا اہتمام رکھتے، کوئی دوسرا لباس جسم پر کبھی نہیں دیکھا گیا۔ ان کے جسم پر صدری گھر کے باہر کبھی نہیں دیکھی۔ جرمنی میں قیام کے دوران انھوں نے سوٹ تو پہنا لیکن داڑھی کبھی نہیں منڈوائی۔ ان کے دوستوں سے سنا ہے کہ جرمنی میں ان سے شیو کرنے کا مطالبہ کیا گیا۔ ان کا جواب تھا: "داڑھی سے مجھے انسیت نہیں شیو بھی کر سکتا ہوں، لیکن روز صبح یہ ورزش کرنا بار معلوم ہوتا ہے۔" ڈاکٹر صاحب اچکن کے بٹن لگانا تہذیب کی علامت خیال کرتے تھے۔ اور فرمایا کرتے تھے کہ اچکن پہنو تو بٹن ضرور لگاؤ۔ ڈاکٹر صاحب نصیحت کم کرتے تھے۔ دوسروں کی اصلاح اپنے عمل سے کرتے لیکن جب محسوس کرتے کہ بغیر کہے کام نہ چلے گا تو بڑے طنزیہ انداز میں ٹوکتے ان کے طنز میں بھی ایک لطف ہوتا اور نصیحت کی تلخی قابل برداشت ہو جاتی۔ راقم کو دو بار بڑی ندامت کا سامنا کرنا پڑا۔ میری اچکن کے چند بٹن کھلے ہوئے تھے۔ ڈاکٹر صاحب نے دیکھا تو تیزی سے قدم اٹھاتے ہوئے تشریف لائے اور بٹن لگا دیے۔ میں نے ندامت سے سر جھکا لیا۔ دوسری مرتبہ بھی یہی ہوا۔ ڈاکٹر صاحب نے بٹن لگا کر فرمایا کہ یہ بٹن لگانے کے لیے ہوتے ہیں، ان کو لگا لینا چاہئے۔ ڈاکٹر صاحب اپنے پیار مندوں کو یاد رکھتے تھے۔ راقم کو ان سے ملنے کا کافی وقفہ کے بعد موقع ملتا تھا۔ وہ جب بھی ملتے بڑے خلوص سے ملتے دور کہیں دیکھ لیتے تھے تو بھی متوجہ ہو جاتے ہاتھ ملاتے، حال دریافت فرماتے، اور وہ سب سوال کرتے جو کسی صاحب تعلق کو کرنے چاہئیں۔ ایک بار اپنے دوست مشہور سائنسداں سلیم الزماں صاحب لکھنوی اور کراچوی سے ملنے ان کی قیام گاہ واقع ترکمان روڈ نئی دہلی تشریف لائے۔ یہ آزادی وطن سے پہلے کا واقعہ ہے۔ گرمی کا موسم تھا خوب دھوپ پڑ رہی تھی۔ راقم کناٹ پلیس سے اپنے گھر کی طرف جا رہا تھا اور ترکمان روڈ کے موڑ کے سرے پر تھا۔ دور سے دو سفید پوش حضرات کو دیکھا۔ تھوڑا آگے بڑھا تو پہچانا کہ ایک ان میں سے ڈاکٹر صاحب ہیں۔ ڈاکٹر صاحب کے رفیق تو مکان میں داخل ہو گئے، لیکن ڈاکٹر صاحب سڑک پر ہی کھڑے رہے۔ راقم قریب پہنچا تو سائیکل سے اترا۔ ڈاکٹر صاحب کو سلام کیا۔ حسب معمول وہ ملے

اور چند سوالات کیے۔ راقم کی معروضات کے بارے میں معلوم کر کے فرمایا: "عزیز جو کچھ کرو محنت سے کرو۔ کامیابی محنت سے ہی کام کرنے میں ہوتی ہے۔"

۱۹۴۷ء میں دہلی اور پنجاب میں فرقہ وارانہ فسادات ہو رہے تھے۔ شمالی ہند کے دوسرے شہروں میں بھی اقلیت محفوظ نہ تھی۔ مسلمان ترک وطن کر رہے تھے۔ صبح کا وقت تھا۔ راقم صفدر جنگ ہوائی اڈے پر ایک دوست کے انتظار میں کھڑا تھا۔ یکایک دیکھا کہ ذاکر صاحب تشریف لا رہے ہیں۔ راقم نے سلام کیا۔ ذاکر صاحب مسکراتے ہوئے راقم کی طرف بڑھے اور بڑی ہمدردی اور شفقت سے فرمایا: "کیسے آئے ہو، کہاں جا رہے ہو؟" میں نے عرض کیا "نہیں دہلی نہ چھوڑوں گا۔ ترک وطن کا کوئی ارادہ نہیں۔" پھر فرمایا "انشاء اللہ یا گھر جائیں گے اور پہلے سے اچھا پائیں گے۔" میں اپنے وطن ہی میں ارغیوں ہی تھا۔ گھر لٹ چکا تھا۔ خاندان کے لوگ پاکستان جا چکے تھے۔ ذاکر صاحب کے ہمدردی کے الفاظ سے تو آنکھیں بھر آئیں۔

آزادیٔ ہند سے پہلے ذاکر صاحب جہادِ آزادی کے ایک سپاہی تھے۔ گو محترم سپاہی تھے لیکن تھے سپاہی۔ نہ گورنر نہ صدر مملکت۔ ملنے جلنے کے تکلفات سے بالاتر۔ اپنے دوستوں اور نیازمندوں سے بے تکلفی سے ملتے اور باتیں کرتے تھے۔ ذکر ۲۳-۱۹۲۲ء کا ہے وہ اکثر علی گڑھ آتے تھے اور جب بھی آتے اپنے دوست رشید احمد صدیقی کے مکان پر قیام کرتے۔ رشید صاحب اس زمانہ میں مسلم یونیورسٹی میں اردو زبان کے لکچرار تھے نہ ریڈر نہ پروفیسر اور یونیورسٹی کے ایک معمولی کوارٹر میں رہتے تھے۔ ذاکر صاحب آتے تو ان سے ملنے ان کے ہم مسلک چند طلبا اور اساتذہ ہی آتے۔ نہ کوئی خانبہادر آتا تھا نہ شمس العلما آتا، اور نہ کوئی کوٹھی نشین صاحب کار ان کا دوست آتا۔ آنے والوں میں قابل ذکر مولانا ابوبکر شیث، ناظم دینیات، عظمت الٰہی، سبزواری جو اس وقت نائب رجسٹرار تھے اور اسی دور میں رجسٹرار ہو گئے تھے، حمید الدین خان استاد فارسی تھے۔ ذاکر صاحب کے کوٹھی نشین دوست اگر کبھی ان سے ملنے رشید صاحب کے یہاں آ جاتے تو ہم سب کو تعجب ہوتا۔ یہ سب حضرات پیوند خاک ہو گئے آج ان میں سے کوئی نہیں، نہ جامعہ والے نہ مسلم یونیورسٹی والے۔ اللہ مغفرت فرمائے۔

مقدور ہو تو خاک سے پوچھوں کہ اے لئیم   تو نے وہ گنجہائے گراں مایہ کیا کیے

رشید صاحب کے یہاں شام کو محفل جمتی گپ شپ کا سلسلہ دیر تک جاری رہتا۔ راقم کبھی تنہا اور کبھی دوستوں کے ساتھ ذاکر صاحب سے ملنے جاتا اور اکثر سب سے پہلے پہنچتا۔ ذاکر صاحب کو دالان میں لیٹا ہوا پاتا۔ وہ ہمیں دیکھ کر اٹھ بیٹھتے پھر ہم سب مونڈھے اٹھا کر باہر چبوترے پر آ بیٹھتے۔ ذاکر صاحب کی جامعہ کے سلسلہ میں کوششوں کا اور ملک کے سیاسی حالات کا ذکر ہوتا اور ذاکر صاحب اپنے تاثرات بیان فرماتے

اور جامعہ کے چندے کے سلسلے میں اپنی جدوجہد کا ذکر کرتے۔ یہ وقت بہت دلچسپی سے گزرتا۔ اس کی یاد اب تک تازہ ہے۔ ایک بار ڈاکٹر صاحب کی طبیعت جولانی پر تھی کہنے لگے "آپ میں سے کوئی صاحب فلاں مولانا کے معتقد تو نہیں؟ بہر حال اس کا انتظار کئے بغیر فرمایا "مولانا کی دلیلیں خوب ہوتی ہیں۔ ہوائی جہاز اگر اڑ گیا تو خدا کی فتح ہو گئی اور اگر نہ اڑا تو سائنسدانوں کی فتح ہو جاتی اور شکست کیا ہوتی معاذاللہ خدا کی ہوتی۔" پھر فرمایا کہ "مولانا ایک مرتبہ ہمسفر تھے۔ کسی کانفرنس میں شرکت کیلئے ہم لوگ گئے تھے۔ مولانا جانماز ایسی جگہ بچھاتے جہاں چار آدمی بیٹھے ہوں۔ مولانا نے نماز سے قبل ایک کھول کر اوپری پاٹ کر رکھی تھی۔ تھوڑی تھوڑی دیر بعد اس کی پاٹ بیٹھ جاتی تو پھر اٹھاتے تھے۔ مولانا کی اس کوشش کی طرف لوگ متوجہ ہو گئے اور سب نے مسکرانا شروع کر دیا۔"

۱۹۳۳ء یا ۱۹۳۴ء میں مسلم یونیورسٹی کے وائس چانسلر کا انتخاب ہو رہا تھا۔ انتخاب دینے کا حق یونیورسٹی کورٹ کو تھا۔ ڈاکٹر ضیاء الدین اور نواب اسمٰعیل خاں میں مقابلہ تھا۔ ڈاکٹر ضیاء الدین کی حمایت حکومت کر رہی تھی خود وائسرائے ہند انتخاب میں دلچسپی لے رہا تھا سرکاری ملازمین کو ہدایت دی گئی تھی کہ وہ ڈاکٹر ضیاء الدین کو ووٹ دیں۔ نواب اسمٰعیل خاں کی حمایت نیشنلسٹ کر رہے تھے۔ ڈاکٹر صاحب انتخاب میں سرگرمی سے حصہ لے رہے تھے، اور الکشن میں بڑی ہماہمی پیدا ہو گئی تھی۔ کورٹ کے ممبروں میں حکومت کے آدمی زیادہ تو نہ تھے لیکن ڈر یہ تھا کہ ڈاکٹر ضیاء الدین کے مخالف بھی ان کو ووٹ دینے پر مجبور کئے جائیں گے چنانچہ ایسا ہی ہوا۔ ڈاکٹر ضیاء الدین جیت گئے نتیجہ کا اعلان ہوا تو ان لوگوں کو بہت افسوس ہوا جنھوں نے حکومت کی ہدایت کے تحت مجبوراً ڈاکٹر ضیاء کو ووٹ دیا تھا۔ نتیجہ نکلا تو ان کی آنکھیں بھر آئیں۔ سجاد حیدر یلدرم بھی انہی میں سے تھے ڈاکٹر صاحب نواب اسمٰعیل خاں کی ناکامی پر بہت افسردہ تھے نتیجہ کے اعلان کے بعد راقم رشید صاحب کے یہاں گیا۔ رشید صاحب، ڈاکٹر صاحب اور دو ایک اور حضرات کمرہ میں بیٹھے تھے۔ خاموشی چھائی ہوئی تھی میں نے خاموشی توڑی۔ الکشن کے بارے میں ایک سوال کیا۔ ڈاکٹر صاحب جو گردن جھکائے بیٹھے تھے بولے وائس چانسلر کے تقرر کا حق کورٹ کو نہیں ایکزیکیوٹیو کانسل کو ہونا چاہئے۔ کورٹ میں ہر قسم کے لوگ ہوتے ہیں انھیں کیا معلوم کہ یونیورسٹی کے کیا مسائل ہیں۔ ہندوستان کی آزادی کے بعد حالات کے مطالبہ کے تحت مسلم یونیورسٹی کا ۱۹۵۱ء کا ایکٹ بدلا تو وائس چانسلر کے انتخاب کا حق ایکزیکیوٹیو کانسل کو دیا گیا۔ دوران گفتگو ڈاکٹر صاحب نے یہ بھی فرمایا کہ ملک میں ایک ایسا ادارہ ہونا چاہئے جو ملک کی سب یونیورسٹیوں کو ایک سلسلہ میں منسلک کرے نیز تعلیم سب کا ایک ہو اور وہ ادارہ یونیورسٹیوں کے تعلیمی اور مالی مسائل بھی حل کرے۔ یو جی سی کا قیام ممکن ہے ڈاکٹر صاحب کے مولانا آزاد کو مشورہ کا نتیجہ ہو

ڈاکٹر ذاکر حسین مرحوم جب علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے وائس چانسلر کے عہدے سے مستعفی ہو کر دہلی واپس تشریف لائے تو وہ جامعہ ملیہ میں جس کے وہ بانیوں میں سے تھے واپس نہ آئے تھے بلکہ اپنے گھر واپس آ گئے تھے۔ ان کی اس فرصت کے دور سے ان کے نیاز مندوں نے فائدہ اٹھایا۔ خواہش ہوئی کہ ڈاکٹر صاحب سے درخواست کی جائے کہ راقم کے بڑے لڑکے نواد محمود خرم (خرم نواد محمود کا گھر کا نام ہے) کی بسم اللہ کی رسم وہ ادا فرما دیں۔ ایک بچہ کی بسم اللہ عام طور پر چار سال چار ماہ پر ہوتی ہے۔ لیکن ضروری نہیں کہ ہر بچہ کی اس عمر پر ہی ہو۔ اس سے پہلے یا بعد میں بھی ہو سکتی ہے۔ پھر اس رسم کی ادائگی میں کیوں تاخیر کی جائے۔ ڈاکٹر صاحب جیسا محسن کہاں اور کب ملے گا اور نہ معلوم ڈاکٹر صاحب کی مستقبل کی مصروفیات اس کا موقع دیں گی بھی یا نہیں

خرم سلمہ کی ماں مرحومہ کا قیام اس دور میں جامعہ ہی میں تھا۔ چنانچہ مرحومہ نے ڈاکٹر صاحب سے درخواست کی اور ڈاکٹر صاحب نے بخوشی اس کو قبول فرمایا اور اس رسم کی ادائگی کے وقت کا تعین ہوا ڈاکٹر صاحب نے خرم سلمہ سے پہلے بسم اللہ پڑھوائی۔ پھر سورہ العلق کی پہلی آیت پڑھوائی پھر خرم سلمہ کی انگلیوں میں قلم پکڑوا کر رتن۔ ر۔ ام۔ گاڈ لکھوایا۔ مٹھائی کی ایک ڈلی دی اور پھر جرمن زبان کی ایک کتاب پر یہ دعائیہ تحریر لکھ کر خرم سلمہ کو کتاب عنایت فرمائی:

خرم میاں سلمہ کو ان کے پہلے
سبق کے موقع پر تعلیم کی
کتاب دی گئی۔
خدا اس کی طرف برکت دے
علم اور نیک مسرت کی دولت
سے مالا مال کرے۔

ذاکر

۹/۹-۵۶

عکس تحریر

اس جرمن کتاب کے سرورق کا عکس بھی ملاحظہ ہو جو ڈاکٹر صاحب نے خرم سلمہ کو عنایت فرمائی تھی:

الحمد للہ اللہ نے ڈاکٹر صاحب کی دعا قبول فرمائی۔ محترم سلمہ ایک ہونہار بیٹے کے علاوہ ایک عہدہ پر فائز ہیں اور اپنی وجاہت اور شرافت کے لیے اپنے حلقہ میں متعارف ہیں۔

جامعہ ملیہ کے نصاب میں عربی زبان کی بڑی اہمیت تھی اور ابتدائی درجات ہی سے عربی پڑھانا شروع کر دیا
جاتا تھا۔ ذاکر صاحب سے ایک بار اس کا ذکر آیا۔ ذاکر صاحب نے فرمایا عربی بہت مشکل زبان ہے۔ طالب علم عربی
پڑھتا ہے تو دوسرے مضامین کے مطالعہ کے لیے وقت نہیں نکال سکتا۔ جامعہ میں عربی اب بھی پڑھائی جاتی ہے
لیکن اب نصاب میں تبدیلی کر دی گئی ہے۔

ایک نشست میں مسلمانوں کی تعلیم کا ذکر ہو رہا تھا۔ علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کی مالی حالت کا بھی ذکر آیا۔
انگریزوں کے دور میں مسلم یونیورسٹی کے اخراجات کے لیے چندہ جمع کیا جاتا تھا۔ ملک کو آزادی ملی تو یونیورسٹی کے
تمام اخراجات کی ذمہ داری حکومت نے لے لی۔ راقم نے کہا "اچھا ہوا کہ اب یہ بار حکومت اٹھائے گی اور
یونیورسٹی ترقی کرے گی۔" ذاکر صاحب نے فرمایا "یونیورسٹی کو چندہ اب بھی جمع کرنا چاہیے۔ ایسا کرنے سے
مسلمانوں کا تعلق یونیورسٹی سے قائم رہے گا جس کی ضرورت ہے۔"

ذاکر صاحب کی زندگی کے سلسلہ میں ایک دلچسپ بات یہ ہے کہ ذاکر صاحب بہت بدپرہیز اور
خوش خوراک تھے۔ راقم کو اس کا تجربہ پہلی بار رشید صاحب کے یہاں ہوا۔ ایک روز صبح ہی رشید صاحب
کے یہاں چلا گیا تھا۔ دیکھا تو رشید صاحب زمین پر بیٹھے کچھ ڈھونڈ رہے تھے۔ تخت پر دسترخوان بچھا تھا کباب،
قیمہ، انڈے، مکھن، ملائی وغیرہ وغیرہ سب کھانوں کی طشتریاں جمی ہوئی تھیں۔ رشید صاحب نے راقم کو دیکھا تو فرمایا
آؤ بیٹھو ذاکر صاحب تو غائب ہیں ناشتہ ٹھنڈا ہو رہا ہے۔ میں نے عرض کیا "کہاں گئے؟" رشید صاحب بولے
"کہاں جاتے اپنے دوست کے یہاں گئے ہوں گے۔" اتنے میں ذاکر صاحب قدم بڑھاتے ہوئے مکان میں داخل
ہوئے۔ راقم نے کہا "لیجیے آ گئے ہیں"۔ رشید صاحب بولے "ان سے اب پوچھیے کہ کہاں گئے تھے"۔ ذاکر صاحب
ہنسنے لگے۔ راقم ایک طرف کو بیٹھنے لگا تو ذاکر صاحب نے ناشتہ میں شرکت کی دعوت دی۔ رشید صاحب بولے
"ذاکر صاحب کا یہ بدپرہیزی ناشتہ ہے۔ آپ بھی شریک ہو جائیے۔"

ذاکر صاحب کی بدپرہیزی کے دلچسپ قصے ہیں۔ مسعود احمد عباسی صاحب میرے ایک عزیز دہلی
میں رہتے تھے، ۱۹۴۷ء کے قتل و غارت گری کے زمانہ میں مظلوموں کی امداد کے کاموں میں دلچسپی لے
رہے تھے۔ ایک روز راقم کے مکان پر تشریف لائے اور اپنی کارگزاریوں کی داستان سنائی۔ اسی زمانہ میں
جامعہ ملیہ کا ایک رفیوجی کیمپ ہمایوں کے مقبرہ میں لگا ہوا تھا۔ ذاکر صاحب کا کافی وقت اسی کیمپ میں
صرف ہوتا تھا۔ دوپہر کا کھانا وہ کبھی کبھی عباسی صاحب کے یہاں کھا لیتے تھے۔ عباسی صاحب نے راقم سے

دوران گفتگو فرمایا کہ ذاکر صاحب آج دوپہر کا کھانا میرے ساتھ کھائیں گے۔ تم میرے ساتھ چلو کھانا وہیں کھانا۔ دلچسپ باتیں ہوں گی۔ ذاکر صاحب کی بدپرہیزی کا علم سب کو تھا عباسی صاحب نے بھی اس کا ذکر کیا۔ لیکن یہ بھی کہا کہ کھانا پرہیزی نہ ہوگا۔ اطمینان رکھو۔ ذاکر صاحب کے ملنے والے نہ تو ان کو پرہیزی کھلاتے تھے اور نہ ہی پرہیزی غذا ذاکر صاحب خود رغبت سے کھاتے تھے۔ چنانچہ عباسی صاحب نے بھی بدپرہیزی کرانے کا پورا انتظام کیا ہوا تھا۔ ذاکر صاحب تشریف لائے، دیر تک فسادات کا ذکر رہا اور کھانا خوب پیٹ بھر کے کھایا۔

ذاکر صاحب کی بدپرہیزی کا ذکر شفیق الرحمٰن صاحب قدوائی نے (ذاکر صاحب کے رفیق اور ادارہ تعلیم و ترقی کے سربراہ) سے ہوا تو انھوں نے سنایا کہ جرمنی سے واپسی کے بعد ذاکر صاحب کے ساتھ ان کو دہلی کے مشہور بازار چاندنی چوک جانے کا اتفاق ہوا۔ چاندنی چوک میں ایک بینک کی سیڑھیوں پر ایک 'دہی بڑے' والا بیٹھتا تھا۔ اس کے دہی بڑے بہت مشہور تھے۔ ذاکر صاحب اس دہی بڑے والے کے پاس سے گزرے تو کہنے لگے۔ بھئی دہی بڑے کھانے کو دل چاہتا ہے۔ شفیق صاحب کہتے تھے کہ انھوں نے کہا کہ دہی بڑے لے چلتے ہیں۔ گھر جا کر کھا لیجئے گا۔ ذاکر صاحب کا جواب تھا کہ دہی بڑے کھانے کا تو یہی مزہ ہے چنانچہ بازار کی طرف منہ کر کے وہیں بیٹھ گئے اور دہی بڑے کھائے شفیق صاحب نے بتایا کہ ذاکر صاحب سفر میں اکثر اسٹیشنوں پر چاٹ لے کر کھاتے جاتے ہیں۔

ذاکر صاحب جرمنی سے واپس آئے تو تعلیم و ترقی کی بہت سے تجاویز ذہن میں ساتھ لائے۔ سب سے پہلے جامعہ ملیہ کے ابتدائی مدرسہ کی ترقی کی طرف توجہ کی ایک جرمن خاتون کو بچوں کی تربیت و تعلیم کے لیے بلایا۔ جامعہ کے اس اسکول نے بہت ترقی کی اور دہلی میں مشہور ہو گیا۔ ان مسلمانوں نے بھی اپنے بچوں کو اس اسکول میں داخل کرایا جو ذاکر صاحب سے سیاسی اختلاف رکھتے تھے۔ جامعہ کا یہ قرول باغ کا دور تھا۔ ذاکر صاحب ہمہ وقت بچوں کی تعلیم و تربیت میں مصروف رہتے راقم شام کے وقت جامعہ جاتا تو ذاکر صاحب کو بچوں کے ہوسٹل میں پاتا۔ وہ ایک وقت کی نماز بچوں کے ساتھ جماعت سے ادا کرتے۔ اکثر یہ مغرب کا ہوتا۔

ملک کے سیاسی حالات اس دور میں ایسے تھے کہ مسلمان دو گروہوں میں تقسیم ہو گئے تھے۔ ایک وہ جو تحریک آزادی کے بارے میں کانگریس کے نقطۂ نظر کی حمایت کرتا تھا۔ اور دوسرا وہ جو کانگریس کے لیڈروں کے نقطۂ نظر سے اختلاف رکھتا تھا۔ دہلی میں ذاکر صاحب اس دور میں تقریباً اجنبی تھے مسلمانوں کے اجتماعات میں ذاکر صاحب کی تقاریر ہونا شروع ہوئیں تو وہ بہت مقبول ہو گئے۔ ذاکر صاحب کی تقریروں

اور جامعہ ملیہ کی تحریک کا یہ نتیجہ ہوا کہ چند تعلیم یافتہ نوجوان جامعہ ملیہ کی خدمت کے لیے تیار ہو گئے۔ ان میں سے ایک بچوں کے ادیب و شاعر شفیع الدین نیر تھے جو نئی دہلی کے موڈرن اسکول میں اردو کے ٹیچر تھے اور معقول تنخواہ پاتے تھے۔ جامعہ کے ستر، اسّی روپے ماہانہ انھوں نے قبول کئے اور ایک سو روپے ماہانہ کی ملازمت ترک کر دی۔ دوسرے ایک نوجوان تھے جنھوں نے سینٹ اسٹیفنس کالج دہلی سے ایم۔ اے کیا تھا۔ وہ بھی جامعہ میں پڑھانے کے لیے تیار ہو گئے۔ اور برسوں ذاکر صاحب اور ان کے رفقا کے ساتھ عسرت کی زندگی گزاری۔ یہ نوجوان عبدالغفار صاحب اب بوڑھے ہو گئے ہیں اور جامعہ ملیہ سے سبکدوش ہو کر جامعہ سے متصل ایک لڑکیوں کا اسکول چلا رہے ہیں۔ یہ ذاکر صاحب کے گرویدہ رہے ہیں۔ ان سے باتیں کیجئے تو محسوس ہوگا کہ 'مرشد' (رشید احمد صدیقی ذاکر صاحب کو 'مرشد' کہتے اور لکھتے تھے) کے ایک مخلص عقیدت مند سے گفتگو ہو رہی ہے۔

ذاکر صاحب کی دوسری اہم خدمت تعلیم بالغان کی تحریک کا اجرا تھا۔ ایک روز راقم جامعہ گیا تو معلوم ہوا کہ تعلیم بالغان کا سلسلہ شروع ہوا ہے اور خاصا کامیاب ہے۔ البتہ پولیس حرکت میں آگئی ہے اور تحریک کی نگرانی کر رہی ہے۔ انگریزوں کے دور میں تحریک آزادی کے ہمدرد جو کام بھی کرتے تھے حکومت کو شبہ ہوتا تھا کہ وہ کہیں اسکے خلاف کوئی پروپیگنڈے کا ذریعہ نہ ہو۔ چنانچہ اس تحریک کی بھی ابتدائی دور میں نگرانی ہوئی۔ یہ تو یاد نہیں کہ تعلیم بالغان کا آغاز کس کی نگرانی میں ہوا، لیکن یہ دیکھا کہ اس تحریک نے بہت ترقی کی۔ شفیق الرحمٰن صاحب قدوائی کی نگرانی میں یہ ملک گیر ہوتی جا رہی تھی۔ دلی میں مٹیا محل مسجد پر ذاکر صاحب کی ہدایت پر ایک مرکز قائم ہوا تھا۔ تعلیم بالغان کے سلسلہ میں کتابچے، پوسٹر شائع ہوتے تھے۔ آزاد ہندوستان میں شفیق الرحمٰن صاحب کو امید ہوئی کہ یہ کام اور بڑھے گا۔ اس تحریک کی ایک اسکیم بھی تیار ہو گئی لیکن یکایک معلوم ہوا کہ تحریک بند کر دی گئی۔ شفیق صاحب سے دریافت کیا تو کوئی تشفی بخش جواب نہ ملا۔ ذاکر صاحب سے دریافت کیا تو انھوں نے ٹالنے کیلئے جواب یہ دیا کہ اب ملک آزاد ہے حکومت کی ذمہ داری ہے کہ وہ تعلیم عام کرے۔ کچھ پتہ نہ چلا کہ اتنا اہم اور مفید کام کیوں بند کر دیا گیا۔ عرصہ بعد محسوس ہوا کہ جب علیگڑھ کالج کا نام بدلنا پڑا، مسلم یونیورسٹی کا ۱۹۲۰ء کا ایکٹ تبدیل ہوا، اور کلکتہ کے سرکاری اسلامیہ کالج کا نام باقی نہ رہا تو پھر ادارہ تعلیم و ترقی کیسے اپنا کام جاری رکھتا۔

تقسیم ہند کے نتیجہ میں اکثریت کا مطالبہ تھا کہ جب ملک تقسیم ہو گیا اور پاکستان بن گیا ہے تو پھر مسلمانوں کے علیحدہ تعلیمی اداروں کی کیا ضرورت رہی۔ حکومت اکثریت کو بھی مطمئن کرنا چاہتی تھی اور مسلمانوں کی

درسگاہوں کو بھی محفوظ رکھنا چاہتی تھی اس لیے انھوں نے مسلم اداروں کے سلسلے میں چند اقدامات کیے۔ اس مضمون میں تفصیلات لکھنا غیر موزوں ہوگا بس جو کچھ عرض کیا جا چکا ہے، امید ہے کہ کافی ہوگا۔ انہی حالات میں مسلم درسگاہوں کے ناموں اور نظام میں وہ تبدیلیاں کی گئیں جن کا ذکر کیا گیا ہے۔

جامعہ کے ابتدائی دور میں عید کارڈ شائع کیے گئے تھے ان کے اشعار ذاکر صاحب اور ان کے رفقائے کار کے دل کی دھڑکن ہوتے تھے۔ ایک شعر جو راقم کو یاد ہے، بیش خدمت ہے ؂

اس مرزا عالم کو سینچو تم جد و جہد کی بارش سے   جو بیج عمل کا بوتا ہے، پھل راحت کا وہ پاتا ہے

ذاکر صاحب ملت کے مستقبل کی تعمیر کے خواب دیکھتے تھے انھوں نے وطن کے مستقبل کی تعمیر کے خواب بھی دیکھے۔ وہ نئے ہندوستان کے مستقبل کی تعمیر میں خونِ جگر صرف کر سکتے تھے لیکن ان کی زندگی کا آخری دور ایسی خدمت میں صرف ہوا جہاں نہ جد و جہد کی ضرورت تھی نہ فکر و عمل کی۔ افسوس آزاد ہندوستان کو ان کی زندگی سے کوئی فائدہ نہ پہونچا، اور وہ گوہر تابناک نہ رہا ؂

ہوشیاروں میں تو اِک اِک سے سوا ہیں اکبر
مجھ کو دیوانوں میں لیکن کوئی تجھ سا نہ ملا

●●

جناب شہاب الدین دسنوی

(سابق ڈائرکٹر انجمن اسلام، بمبئی)

۵۵ منزل۔ ٹی ایچ مسٹری روڈ، بمبئی

جامعہ ملیہ اسلامیہ کی سلور جوبلی سنہ ۱۹۴۶ء کے آخر میں منائی جانے والی تھی۔ اس وقت تک اس ادارے کو نہ سرکاری منظوری حاصل تھی نہ مالی اعانت۔ جامعہ کے ارباب حل و عقد نے عوام کو ادارے کے کاموں سے روشناس کرانے اور اس کی مالی حالت استوار کرنے کی خاطر فنڈ کی فراہمی کے لیے بمبئی میں ایک تعلیمی نمائش کا انتظام کیا اور ساتھ ہی عطیات کی اپیل کی۔ نمائش کہاں کی جائے، مجھ سے مشورہ ہوا تو میں نے اپنے انسٹی ٹیوشن (محمد حاجی صابو صدیق ٹکنیکل انسٹی ٹیوشن) کے سنٹرل ہال اور گیلریز کی تجویز پیش کی جو منظور ہو گئی۔ مرحوم شفیق الرحمن قدوائی اس نمائش کے نگراں تھے۔ شفیق صاحب اور ڈاکٹر ذاکر حسین بمبئی پہنچ کر دو ماہ تک شہر کے مختلف باحیثیت شخصیتوں سے ملاقات کر کے عطیات جمع کرنے لگے۔ ان کی رہنمائی زیادہ تر ذاکر صاحب اور جامعہ کے ایک قدیم سابق طالب علم معین الدین حارث (مدیر اجمل) کیا کرتے تھے۔ ان کے علاوہ سید صبا اسٹیم نیویگیشن کمپنی کے ایک افسر عبدالمجید بھی اکثر ساتھ ہوتے۔ مسلم لیگ کی تحریک ان دنوں اپنے عروج پر تھی۔ لیگی حلقوں میں جو لوگ جامعہ کے پس منظر سے واقف تھے یہ ادارہ اور بالخصوص ڈاکٹر ذاکر حسین کچھ زیادہ مقبول نہ تھے بلکہ یہ کہنا زیادہ مناسب ہوگا کہ ان کا رویہ معاندانہ تھا۔ ان کے اس رویے میں بڑا دخل اس وردھا اسکیم کو تھا جو گاندھی جی کے ایما پر ذاکر صاحب کی صدارت پر مشتمل کمیٹی نے بنیادی تعلیم کے لیے تیار کی تھی۔ مسلم لیگ نے اس اسکیم کو مسلمانوں کیلئے مضر قرار دے کر اس کی سخت مخالفت کی تھی۔ ان حالات کے باوجود مسلمانوں کا ایک ایسا حلقہ بھی موجود تھا جو جامعہ ملیہ اسلامیہ کی تاریخ اور اس میں کام کرنے والی مقتدر شخصیتوں کے ایثار اور جذبہ خلوص سے واقف تھا اور جو اس موقع پر ذاکر صاحب اور ان کے رفقا کی دامے درمے سخنے تعاون کرنا چاہتا تھا۔ خود جناح صاحب، ذاکر صاحب کے مداح تھے لیکن اپنے سیاسی مسلک کے تحت چاہتے تھے کہ ذاکر صاحب ان کے ساتھ مسلم لیگ کے تحت رہ کر تعلیمی کام انجام دیں۔

ذاکر صاحب اور ان کے رفقا کو عطیات جمع کرنے میں ایک دقت یوں بھی پیش آئی کہ کچھ ہی عرصہ پہلے علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے مجوزہ میڈیکل کالج کیلئے ڈاکٹر ضیاء الدین احمد (جن کی لیگی ہمدردیاں مشہور تھیں) کو کئی لاکھ روپے کا

چندہ جمع کر چکے تھے اور اب جامعہ کے لیے بھی انھیں معطیان کے یہاں جاتا تھا۔ گرچہ تو عالمی جنگ کا فیض کہیے کہ تاجر پیشہ طبقے پر اُن برسوں رہا تھا۔ بمبئی کی فیاضی کی روایت پرانی ہے۔ اس کی بدولت جامعہ کو بھی خاصی معقول رقم مل گئی۔ عطیات جمع کرنے کی مہم میں ذاکر صاحب اور شفیق صاحب کو کئی دلچسپ تجربے بھی ہوئے ایک کا ذکر کرنا چاہتا ہوں۔

میں صابو صدیق انسٹی ٹیوشن کے آفس میں کام کر رہا تھا کہ گیارہ بجے کے قریب ایک صاحب تشریف لائے۔ ان کے ساتھ ایک دوسرے صاحب آئے (جن کا نام جمال فرض کر لیجیے) میں ان دونوں سے واقف تھا آتے ہی انھوں نے دریافت کیا کہ وہ ذاکر صاحب سے ملنا چاہتے ہیں، کہاں مل سکتے ہیں؟ میں نے کہا "وہ ڈاکٹر خواجہ عبدالمجید صاحب کے ساتھ کف پریڈ میں ٹھہرے ہیں اس وقت کہاں ہونگے، میں نہیں کہہ سکتا، البتہ شفیق الرحمٰن قدوائی صاحب قریب ہی کے مکان میں مقیم ہیں، ان سے معلوم کیا جا سکتا ہے۔ وہ دونوں فوراً اٹھ کر جانے لگے میں نے عجلت کا سبب پوچھا۔ معلوم ہوا کہ صبح ساڑھے دس بجے کے لگ بھگ ذاکر صاحب اپنے رہبر عبدالمجید اسماعیل صاحب کے ساتھ جمال صاحب کے گھر عطیات کے سلسلے میں تشریف لے گئے۔ جمال صاحب بڑے فراخدل واقع ہوئے تھے۔ تعلیمی کاموں کے لئے عموماً دل کھول کر چندہ دینے میں مشہور تھے۔ لنگام کا ایک مسلم ہائی اسکول بڑی حد تک ان کی کفالت سے چل رہا تھا اتفاق سے اس روز جمال صاحب کچھ علیل تھے جب یہ دونوں ان کے مکان پر پہنچے تو جمال صاحب انھیں بیڈ روم ہی میں لے گئے۔ علیک سلیک کے بعد اسماعیل صاحب نے ذاکر صاحب کو یہ کہہ کر ملایا "یہ ذاکر صاحب ہیں دلی کے جامعہ ملیہ اسلامیہ کے بانی۔ اسی کی سلور جوبلی کے موقع پر فنڈ جمع کرنے تشریف لائے ہیں۔" جمال صاحب نے۔ تو جامعہ ملیہ اسلامیہ کا نام سنا تھا اور نہ ذاکر صاحب کا۔ پلنگ پر لیٹے لیٹے انھوں نے طنزاً فرمایا "اسماعیل بھائی" میں پوچھتا ہوں کہ آخر کیا بات ہے کہ سارے انڈیا سے سارے لوگ چندہ مانگنے بمبئی چلے آتے ہیں؟ جسے دیکھو یتیم خانے کی رسید، مدرسے کی رسید کی کتاب لیکر زکاۃ، خیرات جمع کرنے کے لیے یہاں پہنچ جاتا ہے۔ بھائی ہمارے یہاں بھی تو مدرسے، یتیم خانے چلتے ہیں۔"

اب اسماعیل صاحب کا کاٹو تو جسم میں لہو نہیں، چہرے کا رنگ اُڑ گیا، مگر ذاکر صاحب اپنی طبعی ظرافت اور بے پناہ ضبط سے کام لیتے ہوئے جمال صاحب کی تائید میں فرمانے لگے۔ "جی بالکل بجا فرمایا آپ نے۔ ہاں اسماعیل صاحب، یہ تو کوئی بات نہیں ہوئی کہ شمالی ہندوستان کے لوگ ہزار میل کا سفر کر کے چندہ مانگنے بمبئی آ گئی، اور جمال صاحب جیسے لوگوں پر سارا بوجھ ڈال دیں۔" پھر جمال صاحب کی جانب مخاطب ہو کر کہنے لگے، "حضرت، آپ کی طبیعت ناساز ہے، آرام کریں۔ ہم نے بلا وجہ آپ کو تکلیف دی۔ اس کی معافی چاہتے ہیں۔ چلیے اسماعیل صاحب انھیں آرام کرنے دیجیے۔" اتنا کہکر وہ اسماعیل صاحب کا ہاتھ پکڑ کر باہر نکل آئے۔ اسماعیل صاحب شرم سے پانی پانی ہو رہے تھے

اور ذاکر صاحب اس مضحکہ خیز صورت حال سے محظوظ ہو رہے تھے۔ ان دونوں کے چلے جانے کے بعد ایک مسلم اسکول کے ہیڈ ماسٹر نے جو وہاں گفتگو کے درمیان وہاں بیٹھے تھے، کہا، "اجی حضرت، آپ نے یہ کیا غضب کیا! آپ کو کچھ معلوم ہے یہ کون تھے؟" پھر انھوں نے ذاکر صاحب اور جامعہ ملیہ اسلامیہ کا تفصیلی تعارف کرایا۔ جمال صاحب کو ایسی ندامت ہوئی کہ اسی وقت ہیڈ ماسٹر صاحب کا ہاتھ پکڑ کر پلنگ سے اٹھ کھڑے ہوئے اور کہنے لگے، "میں نے یہ کیا کیا! میرا وطیرہ تو یہ رہا ہے کہ معمولی سے معمولی آدمی بھی جو چندہ مانگنے آیا ہو، کبھی خالی ہاتھ نہیں لوٹا! میرے ساتھ چلئے اور مجھے ذاکر صاحب سے ملا دیجئے، میں جب تک ان سے مل کر ان کے قدموں پر سر رکھ کر معافی نہیں مانگ لیتا، نہ گھر واپس آؤں گا۔ نہ کھانا کھاؤں گا۔" دونوں ٹیکسی پر بیٹھ کر ذاکر صاحب کی تلاش میں نکلے تھے اور میرے یہاں پہنچے۔ بعد کو پتہ چلا کہ تقریباً ڈھائی بجے ذاکر صاحب انھیں ملے۔ اپنے عہد کے مطابق جمال صاحب نے ان سے معافی مانگی اور غالباً ڈھائی ہزار روپے کا عطیہ پیش کیا۔

نمائش کئی دنوں تک چلتی رہی جسے لوگوں کی بڑی تعداد نے دیکھا۔ اختتام پر ایک جلسہ ہوا جس میں ذاکر صاحب اور ان کے رفقا نے معطیان اور ہمدردوں کا شکریہ ادا کیا۔ اس موقع پر جن لوگوں نے تقریریں کیں ان میں میرے ماموں جان پروفیسر نجیب اشرف ندوی بھی تھے۔ خود ذاکر صاحب کو اس وقت سے جانتے تھے جبکہ وہ (ندوی صاحب) رفیق دارالمصنفین کی حیثیت سے اعظم گڑھ میں مقیم تھے اور ذاکر صاحب وہاں اکثر جایا کرتے تھے۔ پروفیسر نجیب اشرف ندوی ذاکر صاحب کے خلوص، ایثار اور تعلیمی خدمات کا تذکرہ کرتے ہوئے ایسے جذبات میں ہاتھ اٹھا کر دعا مانگنے لگے "اے اللہ، میری عمر کا بقیہ حصہ اس خادم ملت کو عطا کر دے۔ تاکہ یہ اپنا مشن پورا کر سکے۔" اس وقت حاضرین میں اکثر کی آنکھیں اشکبار ہو گئیں۔

سیاسی فضا خوشگوار نہ ہونے کے باوجود بمبئی سے ذاکر صاحب مطمئن اور خوش گئے اور اس کی ہم سبھوں کو خوشی ہوئی۔

جوبلی نومبر کو منائی جانے والی تھی۔ انجمن اسلام (بمبئی) نے جس سے میں وابستہ تھا، مجھے اور میرے دو ساتھیوں کو اس تقریب میں شریک ہونے کیلئے دلی بھیجا۔ کئی حیثیتوں سے یہ ایک یادگار تقریب تھی۔ جو اس میں شریک ہوا، اس کے دل سے تقریب کی یاد بھلائی نہ جائے گی۔ مختلف لوگوں نے اس کا حال قلمبند کیا ہے۔ ان کا اعادہ یہاں غیر ضروری ہے۔ خدا بخش لائبریری جرنل (شمارہ ۲۱-۲۲) میں ذاکر صاحب کی اس معرکہ آرا اختتامی تقریر کا اقتباس شائع ہو چکا ہے جس نے حاضرین کے دل ہلا دیئے تھے۔ جشن کے اس موقع پر مسلم یونیورسٹی کے طلبا کی ایک بڑی تعداد موجود تھی جس میں اغلب اکثر مسلم لیگیوں کی تھی جو کانگریس اور نیشنلزم کے نام سے چڑتی تھی

ملک میں فرقہ وارانہ فسادات، بالخصوص بہار کے فسادات نے شدید ردِ عمل پیدا کیے تھے۔ عام مسلمان کے نزدیک ہر کانگریسی اور خاص طور سے بشمولیت مسلمان ان کو دشمن نظر آتا تھا۔ ایسی مکدر فضا میں جب ذاکر صاحب نے کپکپاتی ہوئی آواز میں ملک کے سیاسی لیڈروں کو مخاطب کرکے فرمایا: "خدا کے لیے سر جوڑ کر بیٹھیے اور آگ کو بجھائیے یہ وقت اس تحقیق کا نہیں کہ آگ کس نے لگائی؟ کیسے لگی؟ آگ لگی ہوئی ہے اُسے بجھائیے۔ یہ مسئلہ اس قوم کے زندہ رہنے کا نہیں ہے۔ مہذب انسانی زندگی اور وحشیانہ زندگی کے انتخاب کا ہے۔ خدا کے لیے مہذب زندگی کی بنیادوں کو کھودے نہ دیجیے۔" اس آواز میں اتنا درد، سوز و گداز تھا کہ مخالفین تک کی آنکھوں میں آنسو اُمنڈ آئے۔

سلور جوبلی کی تقریب کئی حیثیتوں سے یادگار تقریب تھی۔ ان دنوں آج کی طرح سہولتیں میسر نہ تھیں۔ بے شمار مجبوریاں اور دشواریاں راہ میں حائل تھیں (فسادات کے اندیشے کے تحت مزدوروں کی کمیابی بھی ایک تھی) مگر تقریب شروع سے آخر تک اتنے سلیقے اور خوبصورت انداز سے منعقد ہوئی کہ ہر قدم پر ذاکر صاحب کو داد دینے کو جی چاہتا تھا۔ جشن کا افتتاح کس کے ہاتھوں ہو؟ وزیر اعظم جواہر لال کے ہاتھ یا قائدِ اعظم محمد علی جناح کے ہاتھ؟ فیصلہ نواب صاحب بھوپال کے حق میں ہوا جو کانگریس اور مسلم لیگ دونوں حلقوں میں قدر کی نگاہ سے دیکھے جاتے تھے پنڈال کے اسٹیج پر قطار کی نشستیں اس طرح رکھی گئیں کہ ایک جانب مسلم لیگ اور دوسری جانب کانگریس کے لیڈران بیٹھے اور بیچ میں نواب صاحب بھوپال جن کے ایک طرف ذاکر صاحب دوسری طرف خواجہ عبدالمجید صاحب۔ حسنِ اتفاق سے جواہر لال نہرو اور قائدِ اعظم محمد علی جناح ایک ہی وقت جلسہ گاہ میں تشریف لائے۔ ذاکر صاحب نے کچھ ایسا انتظام کر رکھا تھا کہ داہنی طرف سے جناح صاحب اور دوسری طرف سے جواہر لال نہرو اسٹیج پر پہنچے اور ایک دوسرے کے آمنے سامنے کھڑے ہوئے۔ جواہر لال نہرو نے مسکراتے ہوئے مصافحہ کے لیے ہاتھ بڑھایا، جناح صاحب نے مسکراتے ہوئے ہاتھ ملایا۔ اس غیر متوقع منظر کو دیکھ کر حاضرین بے خود ہو گئے۔ تالیوں کا ایسا شور پنڈال میں بلند ہوا کہ جیسے سارے ہندوستان کے لوگ اس منظر کا خیر مقدم کر رہے ہوں۔ اور جو سچ پوچھیے تو یہی ہندوستان کے عوام کی اصلی آواز تھی جو سیاست اور مصلحت کے ہنگامے میں گھٹ کر رہ گئی۔

جشن کے بعد میں دلی سے لوٹا تو ایک تماشا ساتھ لیکر آیا۔ میرے بچے کی عمر تقریباً ۶ سال تھی۔ میری خواہش تھی کہ اس کی پرائمری درجوں کی تعلیم جامعہ میں اور تربیت وہاں کے ہوسٹل میں ہو۔ چنانچہ میں نے اس کے داخلے کے لیے درخواست بھیجی۔ پتہ چلا کہ داخلہ بہت دقت طلب ہے۔ ہندوستان کے مختلف حصوں سے ان دنوں جامعہ میں بچے آتے تھے۔ اتفاق سے میرے دوست [illegible] (مرحوم) دلی جا رہے تھے تو میں نے ذاکر صاحب تک ان کے

ذریعے سفارش پہنچائی۔ عابد صاحب نے واپس آکر خوشخبری سنائی کہ ذاکر صاحب نے فرمایا "بھئی درخواستیں بہت ہیں۔ داخلے کی گنجائش باقی نہیں ہے، مگر ایک ٹیچر کے بیٹے کے لیے تو کچھ کرنا ہی پڑے گا۔ داخلہ منظور ہو گیا۔ میں نے جامعہ کے قاعدے کے مطابق اپنے بچے کے لیے کپڑے بنوائے، ضروری سامان خریدا اور اسے بھیجنے کی تیاری کرلی، لیکن کچھ ہی دنوں میں دلّی میں ایسا فساد پھوٹ پڑا کہ شہر میں قتل و غارت گری کا بازار گرم ہو گیا۔ میری آرزو ناتمام رہ گئی اور مجھے اس کا ہمیشہ افسوس رہا۔ اس وقت جامعہ ملیہ اسلامیہ ذاکر صاحب کا دوسرا نام تھا! میرا بچہ اس سعادت سے زندگی بھر محروم رہا کہ اس کے استاد ذاکر صاحب ہوتے!

دہلی کے بعد مجھے ایک یارمند کی حیثیت سے بارہا ذاکر صاحب کی خدمت میں حاضر ہونے کے مواقع ملتے رہے۔ مسلم یونیورسٹی کی وائس چانسلری کے زمانے میں وہ انجمن ترقی اردو (ہند) کے صدر بھی تھے جس کا دفتر علی گڑھ منتقل ہو چکا تھا۔ مرکزی کمیٹی کے رکن کی حیثیت سے جب بھی علی گڑھ گیا ان سے ملاقاتیں ہوتی رہیں اور ان کی باوقار شخصیت، انسان دوستی، اعلیٰ کردار اور بلند پایہ معلّم کی حیثیت سے متاثر ہوتا رہا۔ غالب نے کہا ہے ؎

ہزاروں خواہشیں ایسی کہ ہر خواہش پہ دم نکلے
بہت نکلے مرے ارمان لیکن پھر بھی کم نکلے

میری زندگی میں بھی بہت سے ارمان پورے ہونے سے رہ گئے، ان میں سے صرف دو کی حسرتیں آج بھی باقی ہیں۔ ایک اپنے بیٹے کو جامعہ میں تعلیم نہ دلاسکنے کی اور دوسری یہ آرزو کہ میں بھی ذاکر صاحب کے ساتھ ایک معلم کی حیثیت سے کام کرسکتا!

میں بہار انٹرمیڈیٹ سیکنڈری اسکول سرٹیفکیٹ بورڈ کا رکن تھا اور اس کی فارسی، اردو کمیٹی کا کنوینر اس حیثیت سے مجھے بورڈ کے اردو امتحانات کے لیے ایک انتخاب مرتب کرانے کی ذمہ داری سپرد کی گئی۔ میں نے اس کام میں ڈاکٹر عصمت جاوید سے مدد لی۔ عصمت جاوید اسکول میں میرے عزیز شاگردوں میں سے تھے۔ ان سے کام لینا آسان تھا۔ چنانچہ پہلے ہم دونوں نے بہت غور و فکر کے بعد چند بنیادی اصول مرتب کیے۔ کتاب کا ڈھانچہ تیار کیا، عنوانات مقرر کیے۔ پھر انتخاب عمل میں آیا۔ اور میرے ادارے کے ادبی پرنٹنگ پریس کے خوبصورت ٹائپ میں کتاب چھاپی گئی۔ اس میں ڈاکٹر ذاکر حسین کے اُس خطبۂ صدارت کا ایک اقتباس بھی تھا، جو انھوں نے دارالمصنفین (اعظم گڑھ) کی طلائی جوبلی پر ارشاد فرمایا تھا۔ اصول کے مطابق بورڈ نے انتخاب کا ایک نسخہ ذاکر صاحب کو بھی (جو نائب صدر جمہوریہ ہند تھے) بھیجا۔ کچھ دنوں بعد بورڈ کو ایک خط موصول ہوا، جس میں موصوف نے اس انتخاب کے بارے میں اپنی رائے ان الفاظ میں لکھ بھیجی تھی۔ "اردو کا اتنا اچھا اور سلیقے کا انتخاب

کسی بورڈ یا یونیورسٹی کی طرف سے شائع کیا ہو اب تک میری نظر سے نہیں گذرا ہے۔ میں بورڈ کو مبارکباد دیتا ہوں۔"
بورڈ کے چیئرمین کی خوشی کا کیا ٹھکانہ۔ اپنی خوشی میں انھوں نے مجھے بھی شریک کرلیا۔ یہ ذاکر صاحب کی اعلیٰ ظرفی تھی
کہ وہ ہر اچھا کام دیکھ کر، تعریف سے بخل کرنے کے بجائے دل کھول کر ہمت افزائی کیا کرتے تھے۔

ذاکر صاحب گورنر بہار ہو کر پٹنہ آئے تو جی چاہا کہ اپنے وطن دسنہ بلانے کی دعوت دوں۔ دسنہ شہر پٹنہ سے کوئی ستر کلومیٹر کے فاصلے پر تھا تو ایک قریہ لیکن یہاں کا کتب خانہ ایسا تھا کہ جس کی مثال بڑے بڑے شہروں میں بھی نہیں ملتی تھی تقسیم ہند کے بعد اس کے نتیجے میں بڑے پیمانے پر انتقال آبادی کی وجہ سے اس قیمتی سرمایے کا مستقبل بڑے خطرے میں پڑ گیا تھا۔ ڈر تھا کہ یہ متاع گراں جس کی آبیاری اہل دسنہ نے اپنے خون جگر سے کی تھی۔ زمانے کے دست برد سے برباد نہ ہو جائے۔ چنانچہ ذاکر صاحب کو صورت حال بتا کر انھیں دسنہ آنے پر رضامند کرلیا۔ دسمبر ۱۹۵۸ء میں دسنہ کے بچے کچھے باشندے جو بہار میں ادھر اُدھر پھیلے ہوئے تھے۔ اپنے اجڑے ہوئے وطن میں اکٹھے ہوئے۔ میں بھی سے آیا۔ ایک چھوٹے سے گاؤں میں ہم بے مایہ اور بے سروسامان گورنر کے شایانِ شان ذاکر صاحب کے استقبال کے لیے سوائے بے پناہ خلوص و محبت اور کیا پیش کر سکتے تھے۔ ان کے تشریف لاتے ہی مسلم یونیورسٹی کے آٹھ دس دسنوی سابق طلبائے یونیورسٹی کا ترانہ پیش کیا۔ پھر ذاکر صاحب کتب خانے کے نوادر دیکھنے لائبریری کے اندر تشریف لے گئے۔ وہاں ایک لمبی سی میز پر ابنائے دسنہ کی تصنیفات کی اچھی خاصی تعداد رکھی تھی جسے دیکھ کر وہ متعجب ہوئے اور فرمایا "اتنا اچھا سرمایہ تو کسی ایک ریاست کے لیے بھی باعث فخر ہو سکتا ہے۔" کتب خانے کے سامنے شامیانہ لگایا گیا تھا جہاں ان کی خدمت میں سپاس نامہ پیش کیا گیا جس میں کتب خانے کے آئندہ ضرورات کا بھی اشارہ تھا۔

سپاس نامہ کا جواب دیتے ہوئے ذاکر صاحب نے دسنہ کے مایہ ناز فرزند علامہ سید سلیمان ندویؒ سے اپنے خصوصی تعلقات کا ذکر فرمایا "میری زندگی میں ایک وقت ایسا بھی آیا تھا کہ میں نہیں جانتا تھا کہ مجھے کیا کرنا چاہیے اُس وقت جو راہ سید صاحب علیہ رحمۃ نے دکھائی اُسی پر گامزن ہوا۔ میں آج جو کچھ بھی ہوں، اسی کی وجہ سے ہوں۔" یہ کہتے کہتے وہ آبدیدہ ہو گئے، آواز گلوگیر ہو گئی۔ جلسے سے اُٹھے تو سید صاحبؒ کے اُس ناتمام مکان کو دیکھنے گئے جو سید صاحبؒ نے بڑے شوق سے بنوانا شروع کیا تھا۔ بہار کا گورنر ایسے گاؤں کی کچی اور تنگ گلیوں سے گزر رہا تھا "جس کو فلک نے لوٹ کے ویران بنا دیا"

■ جولائی ۱۹۶۰ء کو دسنہ لائبریری کی کتابیں ذاکر صاحب کے حکم سے خدابخش اورینٹل لائبریری پٹنہ پہنچا دی گئیں اور اب یہ سارا ذخیرہ "دسنہ کلکشن" کے نام سے محفوظ ہے اور تشنگان علم اس سے فیض اٹھاتے ہیں۔

یہ ڈاکٹر ذاکر حسین صاحب کا احسان تھا۔

جو لوگ جامعہ ملیہ اسلامیہ کی تاسیس اور تاریخ سے واقف ہیں انھیں علم ہے کہ قیام کے وقت اس کے وسائل کتنے غیر تسلی بخش تھے۔ سرکاری امداد اور سرپرستی تو درکنار اس کا قومی کردار بھی برطانوی عینک سے مشکوک نظر آتا تھا۔ مالی دشواریوں کو کچھ حد تک حل کرنے اور ایثار و اخلاق کی قدروں کو ارفع سطح پر پہنچانے کی غرض سے جامعہ میں "لائف ممبری" کا طریقہ اپنایا گیا۔ ہمارا خیال ہے کہ اس کی ترغیب "گوکھلے ایجوکیشن سوسائٹی"، "دکن ایجوکیشن سوسائٹی" وغیرہ کئی ایسے ادارے قائم تھے جن میں اساتذہ قلیل تنخواہ پر پندرہ بیس سال کی خدمت گزاری کا عہد و پیمان کرتے تھے۔ اسی نمونے پر جامعہ میں بھی ذاکر صاحب، ڈاکٹر سید عابد حسین، پروفیسر مجیب اور کئی دوسرے اساتذہ نے لائف ممبری کا عہد کیا۔ بمبئی میں انجمن اسلام مسلمانوں کا ایک قدیم تعلیمی ادارہ ہے۔ سن ۱۹۴۶ء میں انجمن کا ایک نیا دستور تیار ہوا جس میں "لائف ممبری" کی بھی گنجائش رکھی گئی مگر بعض قانونی مجبوریوں کی وجہ سے مجوزہ لائف ممبروں کو مالیات کے معاملے میں شریک نہ کیا جاسکا۔ انجمن کے صدر سیف طیب جی صاحب نے ذاکر صاحب سے مشورہ کیا جس کے بعد ایک درمیانی صورت نکل آئی۔

تقسیم کے بعد ملک سے مسلمانوں کا بڑے پیمانے پر انخلا شروع ہوا۔ بمبئی سے مسلمان بیوپاری، ملازم پیشہ اور دیگر پیشوں کے لوگ قسمت آزمائی کرنے نئی مملکت کی طرف رُخ کرنے لگے۔ اس کا اثر انجمن اسلام کی درسگاہوں پر بھی پڑنے لگا۔ مدرسین کی قلت ہونے لگی۔ اسکولوں کا کاروبار سنبھالنا دشوار ہوگیا۔ ان حالات میں انجمن کے کارکنوں کا گھبرا جانا قدرتی تھا۔ سب سے زیادہ پریشان سیف طیب جی ہو رہے تھے۔ ایک روز انھوں نے مجھے بلا کر اپنی پریشانی کا اظہار کیا۔ کہنے لگے "اب وقت آگیا ہے کہ جو لوگ انجمن کے مقاصد سے اتفاق اور ہمدردی رکھتے ہیں اور ملک اور ملت کی خدمت کے آرزو مند ہیں، وہ اپنے خلوص اور ہمت کا ثبوت دیں۔ انجمن کی لائف ممبری کھلی ہوئی ہے۔ کیا تم اس کو قبول کروگے؟"

یہ بڑا نازک موقع تھا۔ ایک طرف ایک نئی سرزمین کے دلکش خواب اور بے پایاں مواقع، دوسری طرف کچھ اصول اور اقدار! میں چند لمحے اس کشمکش میں خاموش رہا۔ معاً ذاکر صاحب کا نقش اور ان کے ایثار اور کردار کی تصویر ذہن میں اُبھری۔ ان دنوں خود جامعہ پر جو کچھ گذر رہی تھی اور ذاکر صاحب کا جو حال تھا وہ سب آنکھوں کے سامنے پھرنے لگا۔ مجھے فیصلہ کرنے میں زیادہ دیر نہیں لگی میں نے کہا "سیف صاحب لائیے فارم میں دستخط کر دوں۔" اس طرح میں نے اپنے آپ کو اگلے پندرہ سال کیلئے انجمن کی خدمت کا پابند کر دیا۔ میرے ساتھ دو اور رفیق

بھی خلاف مہر بنے، اور ہم لوگوں نے انجمن کو ایک مشکل وقت میں اپنی بساط کے مطابق سنبھالنے میں حصہ لیا۔ اس وقت سے اب تک جمنا میں بہت کچھ پانی بہہ چکا ہے لیکن ایک لمحے کیلئے بھی مجھے اپنے اس فیصلے پر ملال نہیں ہوا۔

صدر جمہوریہ کے عہدے پر فائز ہونے کے بعد ذاکر صاحب کی شنکر اچاریہ سے ملاقات اور اس تصویر کا بہت چرچا ہوا جو اخباروں میں شائع ہوئی تھی۔ بعض کوتاہ اندیشوں نے ان پر بد عقیدہ اور بظاہر مسلمان ہونے کا الزام تراشا۔ ذاکر صاحب کی طرف سے کوئی صفائی نہیں پیش کی گئی۔ دلوں کا حال جانے والا اللہ ہے۔ کسی انسان کو یہ حق نہیں پہنچتا ہے کہ وہ دوسرے کے عقیدے کے بارے میں فتویٰ صادر کرے۔ ایمان اور عقیدے کی باتیں بڑی نازک ہوتی ہیں۔ ان کا تعلق انسان کی اپنی ذات اور اس کے خالق سے براہ راست ہوتا ہے۔ اس لیے میں بھی اس پر کوئی رائے نہیں دینا چاہتا ہوں۔ ذاکر صاحب پٹھان تھے، لیکن وہ اپنے نام کے ساتھ "خان" نہیں لکھتے تھے۔ انجمن ترقی اردو (ہند) کے سکریٹری قاضی عبدالغفار صاحب نے ایک بار انجمن کی روئداد میں "ذاکر حسین خان" لکھ دیا۔ توثیقی دستخط ثبت کرتے وقت ذاکر صاحب نے اپنا نام پڑھا تو چیں بہ چیں ہو کر بولے "میں تو اپنی پٹھانی چھپاتا ہوں، آپ اس کا اعلان کیوں کرتے ہیں؟" یہی معاملہ ان کا اپنی عبادت کے ساتھ تھا۔ خورشید صاحب نے لکھا ہے کہ جامعہ نگر کے دوران قیام میں ذاکر صاحب نے اپنی بیٹی سے ایک ایسی ٹوپی سی دینے کی فرمائش کی جس سے پیشانی ڈھک جائے۔ جب اس فرمائش کا سبب پوچھا گیا تو کہا "تاکہ نماز میں سجدہ کرتے کرتے پیشانی پر نشان نہ پڑ جائے اور لوگ مجھے بڑا نمازی سمجھنے لگیں۔" (خدابخش جرنل)

میرے مرحوم دوست معین الدین حارث نے بتایا تھا کہ ایک بار جب ذاکر صاحب نائب صدر تھے تو وہ ان کی کوٹھی پر مہمان ٹھہرے۔ دلی میں حارث صاحب کا معمول تھا کہ جمعہ کی نماز جامع مسجد میں ہی ادا کیا کرتے تھے۔ اس روز وہ ملازم سے کہہ گئے کہ رات دیر سے آئیں گے اور کھانا باہر کھائیں گے۔ حارث صاحب جب رات کے ساڑھے دس کے لگ بھگ کوٹھی پہنچے تو ملازم سے دریافت کیا۔ "میاں سو گئے؟" اور جب معلوم ہوا کہ وہ اپنے کمرے میں بیٹھے ہیں تو بے تکلف تعلقات کی بنا پر کمرے میں داخل ہوئے۔ وہاں حارث صاحب نے دیکھا کہ ذاکر صاحب تخت پر مصلیٰ پر بیٹھے تلاوت کلام پاک میں مشغول ہیں۔ حارث صاحب کو دیکھ کر انھوں نے صرف ہاتھ کے اشاروں سے کھانے کے بارے میں پوچھا، اور جب حارث صاحب نے اثبات میں سر ہلا کر جواب دیا تو پھر تلاوت میں لگ گئے۔ حارث صاحب وہیں بیٹھے رہے۔ تلاوت ہو چکی تو ذاکر صاحب نے ان سے دن کی مصروفیت کا حال دریافت کیا۔ حارث صاحب نے جمعہ کی نماز، عصر اور مغرب کی نماز جامع مسجد میں پڑھنے اور دیگر معاملات کا حال سنایا۔ جب وہ کہہ چکے تو ذاکر صاحب نے ٹھنڈی سانس لے کر کہا۔ "حارث صاحب، آپ تو اللہ کے نیک بندوں میں ہیں۔ میں اپنے بارے میں سوچتا

ہیں تو کانپ اٹھتا ہوں کہ وہاں (عاقبت میں) نہ جانے میری کتنی پٹائی ہوگی؟ خوفِ الٰہی سے ایسے لرز اٹھنے والے انسان کو بدعقیدہ بتانا کتنا بڑا ظلم ہے۔

ذاکر صاحب کو حضرت شاہ محمد الیاسؒ اور ان کی تبلیغی جماعت کی تحریک سے جو لگاؤ تھا اس کا ذکر کئی مضامین میں آ چکا ہے۔ اکثر فجر کی نماز کے بعد ذاکر صاحب اوکھلے سے بستی حضرت نظام الدین جا کر شاہ صاحب علیہ رحمۃ کی خدمت میں حاضر ہو کر ان سے فیض اٹھاتے تھے۔

رادھا کرشنن صاحب کی مدت ختم ہونے کو آئی تو سوال اٹھا۔ کیا ڈاکٹر صاحب صدرِ جمہوریہ بنیں گے؟ ڈاکٹر صاحب فیصلہ کر چکے تھے کہ وہ اپنے بارے میں نہ کوئی بات اور نہ کوئی کوشش کریں گے۔ وہ یہ بھی طے کر چکے تھے کہ دوبارہ نائب صدر کے عہدے کی پیشکش قبول نہیں کریں گے، بلکہ کشمیر جا کر ساری ہنگامی زندگی سے دور ہو کر صرف ایک کام میں مشغول ہو جائیں گے، بچوں کیلئے سیرتِ رسولِ پاک پر ایک کتاب لکھنا۔ (یہ روایت حارث صاحب سے مجھ تک پہنچی تھی)۔

دارالمصنفین کی طلائی جوبلی کے موقع پر میری آنکھوں نے وہ منظر بھی دیکھا کہ شبلی منزل کی چھوٹی سی مسجد صرف نماز کے لیے مصلیوں سے کھچا کھچ بھری تھی۔ ذاکر صاحب، جو افتتاحی جلسے کے لیے بطورِ خاص آئے تھے، اپنی قیام گاہ سے جا گئے ہوئے پہنچے اور جہاں مالیوں کی جوتیاں پڑی تھیں وہیں جگہ پا کر نماز ادا کی۔ اس وقت ذاکر صاحب ہندوستان کے نائب صدر تھے اور خدا کے حضور میں ایک بندۂ عاجز۔

ذاکر صاحب کی طبیعت میں نہایت لطیف قسم کی ظرافت تھی، جس میں حقیقت کی تلخی اور زبان کی چاشنی دونوں ہوا کرتی تھی۔ ایک دن میں پروفیسر محمد مجیب کے مکان پر بیٹھا تھا کہ نائب صدرِ جمہوریہ کی بڑی سی کار دروازے پر آ کر رکی اور ذاکر صاحب بے تکلف گھر کے اندر داخل ہوئے۔ علیک سلیک کے بعد ادھر ادھر کی کچھ باتیں ہو رہی تھیں کہ پروفیسر مجیب بیویوں کی ایک پینٹنگ اٹھا لائے اور کمرے کے سرے پر ذاکر صاحب کو دکھاتے ہوئے بولے، "اس پینٹنگ کے بارے میں آپ کا کیا خیال ہے؟" ذاکر صاحب نے گردن دائیں بائیں موڑ کر کہا، "اچھی نہیں ہے۔" مجیب صاحب نے تعجب سے پوچھا، "آپ نے یہ رائے کیوں قائم کی؟" ذاکر صاحب نے بڑی متانت سے فرمایا "چونکہ اسے دیکھ کر مجھے وحشت نہیں ہو رہی ہے۔ آج کل اچھی تصویر کی یہی نشانی ہے۔"

بمبئی کی ایک ملاقات کے دوران مسلمانانِ ہند کے رویّے پر گفتگو ہو رہی تھی، ذاکر صاحب نے آخر میں فرمایا "بمبئی ہم نے تو آج سے تیرہ سو سال قبل ایک سبق پڑھا تھا اور آج تک اسی پر عمل ہے، اور وہ یہ کہ دوسروں

کا ظلم ثابت کر کے اپنی بخشائش کا ساماں پیدا کر لیں۔"

ذاکر صاحب کی تفریحی کارروائی کی ایک اور مثال حارث صاحب کی زبانی سننے میں آئی۔ حافظ محمد ابراہیم صاحب جب گورنر تھے تو ذاکر صاحب کے اعزاز میں انھوں نے ڈنر دیا جس میں عمائدین شہر مدعو تھے۔ کھانا ختم ہوا تو ذاکر صاحب کے ذاتی ملازم ایک طشتری میں ان کے لیے وٹامن اور دوسری دواؤں کی گولیاں لیکر ڈائننگ ہال میں داخل ہونے لگے۔ سیکورٹی والوں نے روکا۔ ملازم نے ہزار سمجھانے کی کوشش کی، مگر وہ نہ مانے۔ بڑی مشکل سے اس پر رضامند ہوئے کہ طشتری اندر بھیجوا دینگے۔ ملازم نے دور ہی سے اشارہ کر کے بتایا کہ وہ جو سامنے شیروانی پہنے چھوٹی سی داڑھی رکھے ہیں، انھیں کو دوائیں بھیجوانی ہے۔ اتفاق کی بات کہ حافظ صاحب اور ذاکر صاحب دونوں کا حلیہ ایک ہی جیسا تھا۔ سیکورٹی والوں نے وہ طشتری حافظ صاحب کے سامنے رکھ دی اور حافظ صاحب سے کہا کہ گولیاں یکے بعد دیگرے کھا کر کھانا شروع کریں۔ ذاکر صاحب غلطی تاڑ گئے، مگر دانستہ اس غلطی کا تماشا دیکھتے اور لطف اٹھاتے رہے۔

ذاکر صاحب سے میری آخری ملاقات ۹ مارچ ۱۹۶۸ء کو راج بھون بمبئی میں ہوئی۔ حارث صاحب نے فون کیا، "آج تم کیا کر رہے ہو؟" میں نے جواب دیا "کوئی خاص کام تو نہیں ہے" "تو پھر چلیے ذاکر صاحب سے مل لیں میں نے ان کے سکریٹری سے معلوم کر لیا ہے۔ ۵ بجے سے ۷ بجے تک وہ خالی ہیں۔"

ہم دونوں راج بھون پہنچے۔ ذاکر صاحب نماز وغیرہ سے فارغ ہو کر اسٹڈی میں لوٹے تھے ہم برآمدے میں انتظار کرتے رہے۔ دس پندرہ منٹ بعد وہ تشریف لائے۔ سلام کلام ہوتے ہی وہ ہمیں اپنے ساتھ لیتے ہوئے اندر لے گئے۔ مختلف موضوع پر گفتگو ہوتی رہی۔ ملت کے مسائل، عربی جمہوریہ کے معاملے، اسلام کی کارگزاریاں وغیرہ۔ زیادہ تر وہ سنتے رہے، ہم تھوڑا تھوڑا عرض کرتے رہے۔ یوں گھنٹے کے بعد ہم اُٹھے تو ذاکر صاحب نے مصافحہ کے لیے ہاتھ بڑھایا۔ بڑی شفقت سے میرا ہاتھ اپنے ہاتھوں میں لے کر فرمایا "دسوقی صاحب، بمبئی میں آپ کی ذات بہت غنیمت ہے۔ بہت غنیمت ہے۔"

میں وہاں سے چلا تو ایقان، حوصلہ اور ولولے کا بے پناہ ہجوم دل میں لیتا چلا۔

ع   خدا رحمت کند ایں عاشقان پاک طینت را

پروفیسر شاہ عطاء الرحمٰن عطا کاکوی
(سابق صدر شعبۂ فارسی پٹنہ یونیورسٹی)
عطا منزل، سلطان گنج، پٹنہ

۱۹۲۵ء میں ڈاکر صاحب سے میری ملاقات مختصر ترین اور بہت طویل ہوئی۔ آپ پوچھیے کیسے؟ مختصر بھی اور طویل بھی۔ مختصر اس لئے کہ بس ایک ملاقات ہوئی۔ طویل اس لحاظ سے کہ فرش سے شروع ہوا اور عرش تک۔ اس کا سلسلہ جاری رہا۔ عرش سماوی بھی ہوگا رہی۔ اگرچہ ہم سے خط و کتابت تھی، مگر آپ غالباً یقین نہ کریں گے کہ جب تک وہ گورنر رہے یہاں ہم ایک دن بھی ان سے ملنے کیلئے راج بھون نہیں گئے۔ ۱۹۲۵ء کا واقعہ سنیے:۔

دلی دیکھنے کے بعد ارادہ ہوا جامعہ ملیہ دیکھ لیں۔ ویسے نہیں جیسے لوگ آگرہ جاکر تاج محل دیکھتے ہیں بلکہ اصل میں یہ تھی کہ ہمارے عزیز قاضی سعید عیاں تعلیم حاصل کر رہے تھے۔ ۱۹۲۵ء کا واقعہ ہے۔ ان سے ملنے کے لئے ہم وہاں گئے۔ قرول باغ۔ معمولی عمارت، چھوٹی چھوٹی کوٹھریاں کمرے وغیرہ۔ یہاں عجیب ہے یہاں لڑکے خود منتظم ہیں اور لڑکے خود فیصلہ کرتے ہیں۔ خیر ایک کوٹھری میں دیکھا کہ فرش کیا ہوا ہے۔ ایک صاحب بیٹھے ہوئے تیز تیز پیتے ہوئے معلوم ہوا کہ یہ شیخ الجامعہ ہیں۔ جانے سے پہلے ہمارے استاد پروفیسر عبدالمنان صاحب سے کہہ چکا تھا کہ دیکھ جا رہے ہو دلی تو کوئی کتاب میرے لئے لیتے آنا۔ تو دیکھا کہ یہاں مکتبہ ہے۔ وہاں کتاب خریدنے چلے گئے۔ یہ ایک نسخہ پر نظر پڑی۔ اچھا تو اقبال کا کلام یہاں چھپا ہے۔ قیمت چار روپیہ۔ وہ کتاب خرید لی۔ اس کے بعد اس کو لے کر ہم یہاں آئے۔ اس ضمن میں ایک لطیفہ ہے۔ مدرسہ میں ہمارے منجھلے بھائی بھی پڑھتے تھے۔ کتاب ہاتھ میں تھی۔ اتفاق سے مختار الدین آرزو صاحب کے والد ماجد ملک العلما مولانا ظفر الدین تھے۔ انھوں نے پوچھا کیا ہے؟ میں نے کہا اقبال کا کلام ہے۔ "دیکھیں۔ اچھا ہم لے جاتے ہیں گھر، کل واپس کر دیں گے۔" دوسرے دن دیکھا کہ معاذ اللہ، تمام حاشیہ پنسل سے بھرے ہوئے ہیں کہ یہ کفر کا کلمہ ہے، یہ ناجائز ہے، اور یہ ہے، وہ

ہے۔ انھوں نے وہیں سے کہا۔ مشورہ لاحاصل کر بیٹھے خیر، مختصر یہ کہ وہ کتاب رہی نہیں۔ ایک صاحب لے گئے۔ پھر لائے نہیں۔ یہ پہلی ملاقات تھی۔ ۱۹۴۷ء میں ڈاکٹر ذاکر صاحب سے ملاقات ہوئی۔ وہ قاضی سید کے یہاں تھے۔ انجمن اسلامیہ میں ایک جلسہ تھا۔ ذاکر صاحب، ان کی شخصیت، ان کا وقار تھا، علم تھا۔ وہ اس لیے آئے تھے کہ جامعہ کے متعلق کچھ لوگوں کو واقف کرائیں۔ چندہ وصول ہو۔ ذاکر صاحب نے نہایت ہی اچھے طریقے سے بیان کیا۔ پھر خود سر علی امام اٹھے اور کہا: ذاکر صاحب! یہ تو بتائیے کہ آپ کا جامعہ ہے کیا؟ نام تو ہے جامعہ، یعنی یونیورسٹی۔ آیا یہ یونیورسٹی ہے؟ کالج ہے؟ اسکول ہے؟ پاٹھ شالا ہے؟ یہ ہے کیا؟ انھوں نے اس طریقے سے پوچھا کہ ایسا معلوم ہوا کہ اعتراض کر رہے ہیں کہ آخر کیا مقصد ہے۔ مگر ذاکر صاحب کے چہرے پر ذرا بھی کوئی تاثر نہیں تھا۔ نہایت اطمینان سے کھڑے ہوئے تھے۔ انھوں نے کہا کہ "ہماری جامعہ یونیورسٹی بھی ہے۔ کالج بھی ہے، اور یہ جو ہے اور وہ بھی ہے۔ ذاکر صاحب اس کے بعد گورنر ہو کر آئے۔ ایک دعوت نامہ آیا۔ Independence Day کا۔ تو وہ ملاقات کیا تھی۔ ہم لوگ گئے تھے۔ اگرچہ وہ شاعر نہ تھے، مگر شعر و شاعری کا ذوق رکھتے تھے۔ شاید آپ لوگوں کو معلوم نہیں کہ جب وہ جرمنی میں تھے تو دیوان غالب کو خود سے کمپوز کر کے انھوں نے چھپوایا تھا۔ ایک مرتبہ انھوں نے مشاعرہ کیا بہت مختصر سا، چار پانچ آدمی، اسعد کے شعرا۔ غالباً بسمل عظیم آبادی بھی موجود تھے۔ یہ خاکسار بھی تھا۔ میں نے کیا پڑھا، یاد نہیں، مگر دو شعر یاد آ گئے جو انھوں نے پڑھے تھے کہ: ؎

نہ بھولو غیروں کے گلزار پر تم اسے بھولو — جہاں کھلے ہو اسی گلستاں کی بات کرو
جہاں ابھی ہو، وہاں تم نے کیا کیا پہلے — زمیں سنوار لو پھر آسماں کی بات کرو

فوراً ڈاکٹر ذاکر صاحب نے کہا:

تو کار زمیں را نکو ساختی — کہ با آسماں نیز پرداختی

میں نے کہا، یہ ان کا مضمون تھا، یہ میرا مضمون ہے۔

ایک مرتبہ ایسا ہوا کہ میرا ایک اسٹوڈنٹ تھا۔ وہ بی۔ اے پاس کر چکا تھا اور ایم۔ اے اردو میں داخلہ لینا چاہتا تھا۔ ادھر ہم تھے فارسی ڈیپارٹمنٹ میں۔ شعر و شاعری کا بھی ذوق تھا۔ اس نے کہا خط لکھ دیجیے، گورنر صاحب کے نام۔ میں نے کہا، مجھ سے کیا واسطہ ہے؟ اس نے کہا نہیں آپ لکھ دیں گے تو ہو جائے گا۔ میں نے کہا، خیر، ہم لکھ دیتے ہیں۔ دیں یا نہ دیں میرا کیا بگڑتا ہے۔ میں نے لکھ دیا اس کو۔ یہ طالب علم ہے۔ یہ پڑھنا چاہتا ہے۔ ذاکر صاحب نے ہمدردانہ جواب دیا اور مالی امداد بھی دی۔

فکر صاحب کے متعلق ہے

مو محبت تو ختم ۔ ہو سکے رکھوں اگر تو خلش رہے
تیرے دونوں گیسوؤں کا بیان میری زندگی سے دلنہ ہے

مجھ سے خط و کتابت تھی، ملاقات کم ہو رہی۔ جب مجھ کو پریسیڈنٹ ایوارڈ ملا تو میں نے کہاں سے مل گیا مجھ کو بھلا؟ فوراً میں نے ان کو خط لکھا، دو لائن کا خط القاب آداب کچھ نہیں، لکھا یہ خط کر غالب کا وہ شعر ہے

کس منہ سے فکر کیجیے ... بے خواستہ
پرسش ہے اور پائے سخن درمیاں نہیں

بس یہی اک شعر اور کچھ نہیں، جواب بھی آیا جو آج تک موجود ہے۔ یہی سب چیزیں ہیں بس!۔

جناب مرزا عزیز اللہ بیگ

ایڈوکیٹ

وردھا

ذاکر صاحب کی سی نمار اور ہمہ گیر اوصاف شخصیت کے بارے میں کچھ لکھ ڈر لگتا ہے کہ قلم کی واماندگی اور
.. گی کو ان کی عظمت اور ہمہ گیری کا احاطہ کر سکیں۔ میرے تاثرات میں ان کی سورج کی طرح روشن اور تابناک شخصیت
کا دھندلا سا عکس بھی مل جائے۔

جامعہ کا ایک مدرس وقت کے تب پلیدار کا دورہ کرنے کے لیے ہمارے علاقہ میں آیا۔ ہمارے علاقہ ہی کے
رہنے والے ایک صاحب محمد علی خواجہ عبدالغنی صاحب آئے تھے آزاد تعلیم کا پیغام لوگوں تک پہنچایا۔ میرے والد مرحوم مرکزی
طالب تھے لیکن وہ جامعہ ملیہ اور مولانا محمد علی کے کاموں سے واقف تھے۔ وہ مجھے جامعہ بھیجنے پر آمادہ ہو گئے اس کا اہم حکمت مقصود تھا۔

جامعہ کے دفتر کے دوران محمد علی صاحب نے مجھے بتایا کہ جامعہ کے ایک شیخ ہیں جو شیخ الجامعہ کہلاتے ہیں
یہ جامعہ کے پرنسپل اور سب ہی کچھ ہیں۔ شیخ الجامعہ کا سن کر میرا تصور کسی شیخ کی طرف گیا جس عرب شیخ کی تصاویر
اخبارات و رسائل میں دیکھ چکا تھا۔ میں نے سمجھا شیخ الجامعہ کے سر پر عمامہ ہوگا عبا پہنے ہوئے ہوں گے عرب شیخ کی
طرح۔ میں نے شیخ الجامعہ کو ایک درخواست لکھی اور درخواست میں۔ یا شیخ۔ لکھ کر انہیں مخاطب کیا۔ میری درخواست
تھی کہ مجھے درجہ خاص (Preliminary) میں داخل کیا جائے۔ یہ درجہ خاص (Prel.-inary)
عربی مدارس اور سرکاری مدارس کے فارغ التحصیل طلباء کے لیے ہوتا تھا کہ انہیں انگریزی اور حرب پڑھائی
جا سکے تاکہ وہ جامعہ کی اگلی کلاسوں میں اپنا کام چلا سکیں۔ شیخ الجامعہ کا بہت محبت بھرا جواب آیا کہ آپ یہاں
آ جائیں تو طے کیا جائے گا کہ کس درجہ میں آپ کو داخلہ دیا جائے۔ سرکاری مدارس میں طالب علموں کے لیے آپ کا جیسر

تم کا لفظ برتا جاتا تھا۔ یہ آپ کا لفظ جواب میں دیکھ کر شیخ الجامعہ کا بہت اچھا تصور قائم ہوا اور ذرا ہی پریشانی کم محسوس ہوئی میں ۱۹۳۵ء میں جامعہ گیا۔ پہلے استادی خواجہ عبدالحی صاحب سے ملا۔ محمد علی صافی بھی ساتھ تھے۔ اب مجھے شیخ الجامعہ کے سامنے جانا تھا۔ دل میں خوف، ڈر اور ہچکچاہٹ پیدا ہو رہی تھی۔ دل دھک دھک کر رہا تھا۔ میں دبے پاؤں شیخ الجامعہ کے دفتر میں داخل ہوا۔ استادی خواجہ عبدالحی صاحب میرے بارے میں پہلے ہی ذاکر صاحب سے ذکر کر چکے تھے۔ شیخ الجامعہ کے کمرہ میں سفید کھدر کا فرش تھا۔ ذاکر صاحب ایک فرشی میز سامنے رکھے بیٹھے تھے۔ Gray رنگ کی کھدر کی شیروانی اور کھدر ہی کی سفید ٹوپی پہنے ہوئے۔ انکی داڑھی بڑی وضعدار تھی۔ میں نے جو شیخ الجامعہ کا تصور اپنے ذہن میں بنا رکھا تھا وہ ایک حرفِ غلط کی طرح مٹ گیا۔ ذاکر صاحب نے مجھے دیکھتے ہی خفیف مسکراہٹ کے ساتھ کہا "آئیے بیٹھیے"۔ اس مسکراہٹ اور آئیے بیٹھیے کے انداز نے میرے دل سے وہ خوف، ڈر اور ہچکچاہٹ بالکل نکال دی۔ پھر محبت اور شفقت کے انداز سے مجھے سمجھایا کہ درجۂ خاص اس سال نہیں کھولا جائیگا اسلئے کہ طالب علم نہیں ہیں۔ درجۂ خاص کامیاب ہونے کے بعد آپ ثانوی چہارم میں جائیں گے اور اگر آپ ثانوی سوم میں داخلہ لیں تب بھی اسکے بعد کا درجہ ثانوی چہارم ہی ہے۔ سمجھانے کا انداز کچھ ایسا تھا کہ بات دل میں اتر گئی پھر میری دلچسپی، کھیل اور hobbies کے بارے میں پوچھا اور کہا آپ کا داخلہ ثانوی سوم میں کیا جائیگا آپ داخلہ فارم لکھ کر دیدیجئے۔ یہ تھا دوسرا تاثر ذاکر صاحب کے بارے میں کہ ایک سچا استاد کس محبت اور پیار سے طالب علموں کے مسئلوں کو حل کرتا ہے۔ رہنے کے لیے مجھے جوہر منزل میں جگہ ملی۔ جوہر منزل کے پاس ہی ایک کوٹھی تھی جس میں ذاکر صاحب اور مجیب صاحب دونوں رہتے تھے۔ ہمارے بورڈنگ ہاؤس جوہر منزل اور اس کوٹھی کے درمیان بس ایک تنگ سی گلی تھی۔ ذاکر صاحب جب صبح جامعہ جانے کے لیے نکلتے تو روز سامنا ہوتا۔ ہمارا کمرہ اس تنگ گلی سے لگا ہوا ہی تھا۔ ذاکر صاحب پوچھتے آپ اچھے تو ہیں اور سلام کا جواب دیتے۔ ہم لوگ ذاکر صاحب کے گھر سے نکلنے سے پہلے ہی برآمدہ میں آجاتے کہ ذاکر صاحب کو سلام کریں اور پھر ان کے پیچھے پیچھے جامعہ جائیں۔

جوہر منزل میں ہمارے ساتھ کچھ ٹرانسوال (جنوبی افریقہ) سے آئے ہوئے طالب علم بھی تھے انہوں نے گاندھی جی کے کہنے پہ ہندوستان آکر جامعہ میں داخلہ لیا تھا۔ گاندھی جی کے خطوط ذاکر صاحب کے نام ان طالب علموں کی خیریت معلوم کرنے آیا کرتے تھے۔ ذاکر صاحب وہ خط لیکر ان کے کمرہ میں آکر ان کو خط سناتے انکے حالات پوچھتے باتیں کرتے۔ یہاں تک کہ ذاکر صاحب اکثر ان لوگوں کے کمرہ میں آتے، پلنگ پر بیٹھ جاتے۔ اس وقت ایسا معلوم ہوتا کہ ایک شفیق باپ اپنے بچوں سے بات کر رہا ہے۔ یہ کوئی سات آٹھ طالب علم تھے ان میں ایک طالب علم بہت

کم عمر تھا۔ اس سے ذاکر صاحب بڑی پیار و محبت کی باتیں کرتے اور اسکے لیے چھوٹی موٹی چیزیں بھی لاتے۔ شفیق الرحمٰن قدوائی صاحب جو ہر منزل کے نگراں تھے وہ بھی ذاکر صاحب کے ساتھ ہوتے۔ کبھی کبھی ذاکر صاحب ہم لوگوں کے کمرہ میں بھی آجاتے ہماری خیریت پوچھتے۔ ہم لوگوں کے بھائی بہنوں کے بارے میں پوچھتے۔ گھروں کے حالات پوچھتے اور اس طرح ہمارا بیک گراؤنڈ معلوم کرتے جو ایک کامیاب استاد کے لیے بہت ضروری ہے۔ ایک سال پورا ہوا۔ دوسرے سال میں ثانوی چہارم میں تھا۔ معاشیات کے استادوں میں ہمارے شفیق صاحب تھے لیکن کبھی کبھی کلاس میں ہمیں معاشیات پر لیکچر دینے ذاکر صاحب بھی آجاتے تھے۔ ان کا لیکچر بڑا دلچسپ اور عام فہم ہوتا تھا۔ ہم لوگ چاہتے تھے کہ ذاکر صاحب ہمیں یوں ہی آکر معاشیات پر لیکچر دیں۔

اسی سال کالج کے طلباء کی انجمن اتحاد کا الیکشن ہوا جس میں بلا مقابلہ انجمن کا سکریٹری چنا گیا۔ صدارت کے لیے صوبہ سرحد کے عبدالکریم خان صاحب جن کے طرفدار خان عبدالغفار صاحب کے بیٹے صاحبزادے عبدالغنی خان صاحب تھے اُن سے اور انجمن کے پرانے سکریٹری عبدالجلیل صاحب ندوی سے کچھ ان بن ہو گیا یہ پارٹی بازی کا جھگڑا تھا۔ عبدالکریم خان صاحب بھی جھگڑے میں کود پڑے الیکشن کے دن بھی کچھ مڈبھیڑ ہوئی۔ بات ذاکر صاحب تک پہنچی۔ دونوں فریق کو لے کر میرا نام لیا کہ تحقیقات پوچھا جائے کہ زیادتی کس فریق کی ہے۔ پہلے تو خیال ہوا کہ میں عبدالکریم خان صاحب کی طرف داری کیا اپنا میل جول اور ان کی طرف داری میں باتیں ذاکر صاحب کو بتاؤں میں لگ گیا۔ میں اپنا یہ خیال لیکر دفتر میں داخل ہوا ذاکر صاحب نے مجھے دیکھتے ہی فرمایا "دیکھیے جناب دونوں فریقوں نے آپ پر اعتماد کا اظہار کیا ہے۔ میں آپ پر اعتماد کرتا ہوں بلا کسی کی بے جا طرف داری کے صاف صاف بتائیے کہ واقعہ کیا ہے اور کس کی طرح ہے آپ کی بات سن کر میں اپنا فیصلہ دونگا۔" ذاکر صاحب نے کچھ اس انداز سے مجھ پر اعتماد کی بات کہی تھی کہ یہ خیال میرے دل سے بالکل نکل گیا کہ میں عبدالکریم خان صاحب کی طرف داری کروں۔ صورت حال میں نے بلا کم و کاست بیان کر دی ذاکر صاحب نے جو فیصلہ دیا اس سے دونوں فریق مطمئن ہو گئے اور اسکے بعد ایک دوسرے سے گلے ملے۔

ذاکر صاحب یورپ سے آنے کے بعد دو ایک سال ہی میں دلی کی سماجی اور علمی بلکہ ایک حد تک سیاسی زندگی میں بھی اپنا مقام بنا چکے تھے۔ ایک تو حکیم صاحب سے ان کا تعلق اور اسکا جامعہ کی خدمت اور ایثار اور قربانی کا جذبہ جس سے جامعہ کا نام بھی اونچا ہوا اور ذاکر صاحب اور ان کے ساتھیوں کی قدر بھی بڑھی۔ دلی والے ذاکر صاحب کی شخصیت سے کافی طور پر متعارف ہو چکے تھے۔ اہل سیاست بھی ان سے رائے اور مشورہ طلب کرنے لگے تھے

ان دونوں مسلمانوں میں Ph.D کی ڈگری پانے والے کم ہی تھے، چند انے گنے نام آتے تھے اور سب اسلئے بھی ذاکر صاحب اور انکے ساتھیوں کی قوم میں بڑی عزت اور منزلت تھی۔ یورپ سے آنے کے بعد انہیں اعلیٰ سرکاری ملازمت مل سکتی تھی لیکن یہ لوگ اتنی قابلیت کے باوجود جامعہ میں اپنی خدمت کا معاوضہ ڈیڑھ سو روپے سے زائد نہ لیتے تھے۔ ملک میں ایثار اور قربانی سے خدمت کا کام کرنے والے یوں بھی کم یاب تھے۔

جامعہ کا یوم تاسیس ہر سال ۲۹ اکتوبر کو منایا جاتا تھا کہ اس روز حضرت شیخ الہند نے ۱۹۲۰ء میں اسکی بنیاد رکھی تھی۔ ذاکر صاحب کی جدت پسند طبیعت نے یوم تاسیس کے موقع پر یہ جدت کی کہ جامعہ کے طالب علم جامعہ کو اس روز اپنی طرف سے کوئی تحفہ پیش کریں۔ گروپ بنا کر یا انفرادی طور پر یہ تحفہ علمی یا حصول علم سے تعلق رکھنے والا ہو۔ پیسا کہ اسے اس دن نمائش میں رکھا جا سکے۔ برادرم عبدالواحد سندھی صاحب میرے ہم جماعت تھے انہوں نے اور میں نے مل کر یہ طے کیا کہ دلی کے اسلامی اور دینی تعلیم کے مدارس کی تاریخ انکے چلانے والے اخراجات اور مامور ہستیوں کے حالات جمع کر کے لکھیں اور جامعہ کو یوم تاسیس کے موقع پر پیش کریں۔ ہم لوگ دلی کی مساجد اور گلی کوچوں میں پھرے اور تقریباً ۳۰-۳۵ مدرسوں کے حالات جمع کئے۔ ہم لوگ جہاں جاتے ہر جگہ وہاں کے لوگ جامعہ اور ڈاکٹر حسین صاحب کے نام سے مرعوب نظر آتے تھے۔ وہ لوگ پوچھتے "حکیم صاحب کی جامعہ"، "مولانا محمد علی کی جامعہ"، "ڈاکٹر ذاکر حسین کی جامعہ" اور ہمیں پورا پورا تعاون دیتے تھے۔

"ڈاکٹر ذاکر صاحب دلی کے علمی اور ادبی حلقوں میں مدعو کیے جاتے۔ خواجہ حسن نظامی کے یہاں بستی نظام الدین میں مجلس ہو یا کوچہ چیلان میں واحدی صاحب کے یہاں یا مولانا محمد علی کے گھر پر یا حکیم اجمل خاں صاحب کے مطب، شفاخانہ میں سب جگہ انکی پوچھ ہوتی۔ اور یہ لوگ اکثر جامعہ آتے تھے۔ حکیم صاحب جو دلی کے مسیحا اور استاد کہلاتے تھے، جامعہ میں کس کس کو نہیں لاتے تھے۔ بیگم بھوپال، پنڈت مالویہ، مسٹر جناح، گاندھی جی، سی ایف اینڈریوز، علامہ اقبال، سید سلیمان ندوی، سری نواس آئنگر، قاضی سلطان ——— افغانستان کے سفیر، پنڈت موتی لال نہرو، ڈاکٹر اینی بیسنٹ، سر فیروز خاں نون وغیرہ وغیرہ۔

جامعہ تو مولانا محمد علی کی تھی ہی آصف علی، عارف ہسوی، لالہ شنکر لال اور ایڈیٹر ملاپ جن کا دلی کی سیاسی زندگی میں اعلیٰ مقام تھا ان سے ذاکر صاحب کے مراسم تھے، یہ لوگ سب آتے اور جامعہ کو خراج عقیدت پیش کرتے۔ یہ سب لوگ ذاکر صاحب کے کام کو سراہتے، ان کے ایثار اور قربانی کی تعریف کرتے اور حکومت سے آزاد تعلیمی اداروں کی ضرورت جتاتے۔ ان کی خراج تحسین میں ذاکر صاحب کا نام سب سے نمایاں ہوتا۔

ہم لوگ اس پر فخر کرتے کہ ہمارے شیخ کی اس قدر عزت افزائی ہوتی ہے۔

جامعہ کی عسرت کا دور تھا مالی حالت اچھی نہیں تھی اس پر بھی ذاکر صاحب اور ان کے ساتھی شانِ قلندرانہ سے رہتے تھے ان لوگوں کا رکھ رکھاؤ ایسا تھا کہ انکے سارے کاموں میں قلندری کا اظہار ہوتا تھا۔ تنخواہوں میں اضافہ کا سوال ہی نہیں! بلکہ استادوں نے خود اپنی تنخواہیں گھٹا لی تھیں جیسے ۲۰۰ ملتے تھے اس نے گھٹا کر ۷۵ روپے کر لئے یہ بھی ان کی شانِ قلندری۔ ذاکر صاحب کی شخصیت تھی جس نے اپنے گرد ایسے با یہ سر لوگ جمع کر لیے تھے جنکی قربانی اور جذبۂ خدمت اس بات کی ضمانت تھی کہ جامعہ کا کام آگے بڑھیگا اور کامیاب ہوگا۔ قرول باغ سے بارہ ہندو راؤ تک یکے چلتے تھے۔ فاصلہ کوئی ڈیڑھ ایک میل سے زائد ہوگا۔ بارہ ہندو راؤ سے فتح پوری پر مدنی چوک اور جامع مسجد تک ٹرام چلتی تھی ایک آنہ یا ڈیڑھ آنہ ٹکٹ ہوتا۔ ذاکر صاحب بارہ ہندو راؤ تک کبھی پیدل اور کبھی یکے میں آتے جاتے تھے۔ کبھی کبھی دو چار طالب علم بھی ٹرام میں ذاکر صاحب کے ساتھ سوار ہو جاتے ذاکر صاحب ان سب کا کرایہ اپنی جیب سے دیتے۔

یہ بہت دنوں بعد کی بات ہے کیرالہ کے ایک طالب علم گنڈاپا (Gundappa) ذاکر صاحب کے پاس ایک تعلیمی کام کے سلسلہ میں آتے تھے ذاکر صاحب کے مکان کے پاس ایک کوٹھی کے آؤٹ ہاؤس میں رہتے تھے (یہ بات اس وقت کی ہے جب جامعہ قرول باغ سے اٹھ کر اوکھلا آگئی تھی۔ جامعہ کی یہ عمارتیں بن رہی تھیں) ذاکر صاحب کے یہاں ۲۰، ۳۰ بکریاں پلی ہوئی تھیں! ایک دن ایک بکری کے گلے کی رسی کہیں گر گئی بیگم ذاکر حسین صاحبہ چرانے والے پر بہت خفا ہوئیں۔ گنڈاپا نے بیگم صاحبہ کی خفگی کا ذکر ذاکر صاحب سے کیا ذاکر صاحب نے انہیں جواب دیا "گنڈاپا میری زندگی بہت مختصر چیزوں پر اور چھوٹی چیزوں پر مشتمل ہے ان میں سے ذرا سی چیز بھی ضائع ہو جائے تو اسکا اثر میری زندگی کی ضروریات پر پڑتا ہے۔ بیگم صاحبہ اس چیز کو سمجھتی ہیں بکری کی رسی کے ضائع ہو جانے سے نقصان ہوا۔ بیگم صاحبہ چھوٹی چھوٹی چیزوں کو بنا اور سنوار کر رکھتی ہیں میں بس میں ان سے جہاں تک ہو سکتا ہے تعاون کرتا ہوں"۔

ذاکر صاحب اپنی آنکھوں کی خرابی کی وجہ سے گرم پانی کرنے کے لیے ایک المونیم کی دیگچی جب سیواگرام آتے اپنے ساتھ لاتے جس میں بورک ایسڈ یا کوئی اور دوا ڈال کر آنکھ کو سینک لیا جاتا تھا۔ ایک مرتبہ سیواگرام سے واپس جاتے ہوئے دیگچی لینا بھول گئے اسٹیشن پر اس کا خیال آیا۔ اسٹیشن سے سیواگرام پانچ میل دور مجھ سے کہا۔ "چھٹی دیگچی بھول آیا میں یہ پانچویں یا چھٹی دیگچی ہے جو میں کھو چکا ہوں۔ کمرہ میں میرے

پلنگ کے پاس ہی پانی گرم کیا گیا تھا دیں رہ گئی ہوگی دیگچی تو معمولی المونیم کی ہے دوسری دیگچی بہر صورت آ ہی جائیگی بیکس بیوی کو جواب دینا پڑیگا۔ میں اپنے بچاؤ کی خاطر یہ بات بنا دونگا، دیگچی آپ کے پاس رہ گئی ہے وہ آ جائیگی بات آئی گئی ہو جائیگی بیکس ذرا سیوا گرام میں پوچھ لیجے اگر مل جائے تو بیکر رکھ لیجئے جب میرا ادھر آنا ہو تو آپ مجھے دیدیں گے چاہے مجھے یاد رہے یا نہ رہے

ایک مرتبہ ڈاکر صاحب کو دکن ہندی پرچار سبھا کے تقسیم اسناد کے جلسے میں مدراس جانا تھا۔ سفر کے لیے کھدر کی جو شیروانی تھی وہ تو تھی ہی دوسری ایک اور بھی کھدر کی وہ بھی سیوا گرام میں میلی سی ہو گئی تھی۔ ڈاکر صاحب شام میں وردھا سے دوسری صبح مدراس جانا تھا کہنے لگے اچھی شیروانی مدراس کے جلسہ میں پہننے کے لیے ایک ہی تھی وہ بھی میلی ہو گئی۔ رات کا وقت ہے۔ دھل سکتی ہے؟ اور استری اس پر ہو جائیگی "چنانچہ رات کو وہ شیروانی دھلوائی گئی رات کو ہی سکھائی گئی، رات بھر میں سوکھ گئی اور صبح ٹرین کے وقت سے پہلے استری کر دی گئی پھر ڈاکر صاحب نے کہا "بھئی اسٹیشن چلتے چلتے منہ دھوتے جاتے اس کی بنا پر رات سیوا گرام آستر کے پیچھے گھٹ گھٹ کر رہے تھے اور میرا صاحب گئے۔ مدراس میں اس کی ضرورت پڑے گی۔" بڑی بے تکلفی سے یہ باتیں کیں۔

ڈاکر صاحب کھانے پینے کے معاملہ میں بے تکلفی برتتے تھے ایک مرتبہ شام کی ٹرین سے وردھا سے پونا کی طرف جا رہے تھے شام کا کھانا وہ ٹرین میں ہی کھاتے اس کے لیے ایک باسکٹ میں کھانے پینے کی چیزیں ساتھ لے لی گئیں تھیں بہت کچھ معلوم ہوا کہ گاڑی سوا گھنٹہ لیٹ ہے شام ہو گئی تھی ڈاکر صاحب نے کہا "ریل میں بیٹھ کر کھانا تو مشکل ہوگا باسکٹ سے خوشبو بھی آ رہی ہے اور یہ خوشبو دعوت طعام بھی دے رہی ہے اس پلیٹ فارم میں اتنی فارغ کو ساتھ بیٹھ کر ریل کے ڈبہ میں جگہ برابر ملے نہ ملے۔ دوسرے کی یہ باسکٹ میں یہیں کیوں نہ چھوڑ دوں۔ مجھے میری بیوی لوٹا اور لنچ کیریر سے میں دیتی ہیں کہ میں بھول جاتا ہوں اس خوبصورت باسکٹ کو بھی کہیں بھول جاؤنگا۔ میرے کام آئیگی نہ آپ کے کسی اور کے کام آئیگی کیا خیال ہے"۔ وہیں پلیٹ فارم پر جو چھوٹا سا باغ لگا تھا وہیں بیٹھ کے ڈاکر صاحب نے کھانا بڑی بے تکلفی سے کھایا۔

ڈاکر صاحب کا قریشی صاحب سے پٹی (Patti) آنیکی دعوت دی تھی کہ وہ اپنے مجوزہ دار العلوم اسکے نصاب اور انتظامی معاملوں کے سلسلہ میں ڈاکر صاحب سے مشورہ لیں، اس کے لیے انہوں نے میٹنگ بھی بلائی تھی۔ ڈاکر صاحب وردھا سے اس جلسہ میں شرکت کرنے کے لیے دلی جا رہے تھے جنگ عظیم کا زمانہ تھا ریلوں میں جگہ مشکل سے ملتی تھی اسٹیشن پہنچے تو کسی ڈبہ میں جگہ نہ تھی فوجی بھرے ہوئے تھے۔ ڈاکر صاحب سے میں نے عرض کیا کہ اس وقت کا جانا ملتوی کر کے کسی دوسری ٹرین سے جائیں انہوں نے جواب دیا کہ "بھئی سوال وقت اور تاریخ کا

ہے قریشی صاحب قوم کی اور سیرت کمیٹی کی اتنی خدمت کر رہے ہیں انہوں نے بڑی محبت سے ملایا ہے میرا جانا فرض ہو جاتا ہے مجھے پھر وقت پر پہنچ جانا چاہیئے میں فرض میں کوتاہی روا نہیں رکھتا نہ پہنچوں تو قریشی صاحب مایوس ہونگے میں انہیں مایوس کرنا نہیں چاہتا"۔ بالآخر ایک فوجی نے مشکل سے کھڑے رہنے کے لیے جگہ نکالدی۔ ذاکر صاحب کو کھڑے کھڑے کس جگہ ملی، ملی یا نہیں یا کھڑے کھڑے سفر کیا پڑا معلوم نہیں

قرول باغ میں جامعہ کرایہ کی عمارتوں میں تھی۔ جامعہ لائبریری پڑھائی کے کمرے اور رہائش کے لیے مرکزی کوٹھی ان کے علاوہ، جوہر منزل، گلشن منزل، پیلی کوٹھی جو جامعہ کے بورڈنگ ہاؤسز تھے یہ سب کرایہ کے تھے قرول باغ میں جامعہ کی اپنی ایک عمارت سنہ ۱۹۲۹ء میں بنی افتخار میموریل ہال۔ اسے جامعہ کے ایک نہایت عزیز طالب علم افتخار حسین مرحوم کی یاد میں بنایا گیا تھا۔ ان کا انتقال جامعہ ہی میں ہوا جامعہ سے انہیں بہت لگاؤ تھا جامعہ کے ہر کام سے انہیں خوشی ہوتی تھی۔ متمول گھرانے سے تعلق رکھتے تھے انہوں نے اپنی جائداد کی آمدنی کے حصّہ کی ایک رقم جامعہ میں جمع کرادی تھی کہ جامعہ اس روپئے کو اپنے مصرف میں لائے اور جامعہ کے پاس جب روپے ہو جائیں تو جامعہ انہیں واپس کر دے۔ ان کے بھائیوں نے انکے بعد بھی جامعہ کو روپیہ دیا جس سے میموریل ہال بنا اور ایک جلسہ گاہ جامعہ کے لیے انتظام ہوگیا۔ افتخار مرحوم ہی نہیں بلکہ اور طالب علم بھی جامعہ کو اپنا گھر سمجھتے تھے اور ایسا ہی لگاؤ انہیں جامعہ کی عمارتوں سے تھا جیسا اپنے گھر سے ہوتا ہے گو عمارتیں کرایہ کی تھیں ذاکر صاحب اور انکے ساتھیوں نے یہی لگن طالب علموں کے دلوں میں پیدا کر دی تھی۔

افتخار میموریل ہال حکیم صاحب کی وفات کے بعد بنوایا گیا تھا۔ حکیم صاحب کا انتقال بھی سن ۲۹ میں ہوا۔ انکے انتقال کے وقت ذاکر صاحب مدراس میں تھے۔ مدراس جامعہ کے کام سے گئے تھے وہاں سے ذاکر صاحب نے جامعہ والوں کو ایک تار دیا 'Keep up your tails'۔ ہم لوگوں کو صورتِ حال کا پورا اندازہ نہیں تھا کہ حکیم صاحب کے جانے سے کیا افتاد جامعہ پر پڑی۔ ذاکر صاحب نے یہ محسوس ہی نہیں ہونے دیا کہ جامعہ کی کشتی گرداب میں ہے اور جامعہ مقروض ہے اور اب جامعہ کو چلانے کا خرچ کہاں سے آئیگا۔ جامعہ کو چلانے کے لیے ذاکر صاحب نے مجلس تعلیم ملی کی بنیاد ڈالی۔ ذاکر صاحب اور انکے ساتھیوں نے عہد کیا [illegible] سال تک جامعہ کی خدمت اسی طرح کریں گے اور کبھی اپنا خدمت کا معاوضہ ڈیڑھ سو روپیہ سے زائد نہ لیں گے۔ جامعہ کو بعض خیر خواہوں کے ذریعہ یہ اطلاع بھی ملی کہ جامعہ چاہے تو حکومت سے امداد بھی مل سکتی ہے۔ حکومت اس کے لیے تیار ہے۔ لیکن سنا یہ ہے کہ ذاکر صاحب نے ان خیر خواہوں کو یہ جواب دیا تھا کہ

جب تک درختوں کا سایہ ہے جامعہ کا کام ان کے سایہ میں چلتا رہے گا اگر عمارتیں نہ ہوئیں. لیکن حکومت سے امداد جامعہ کے کام کے لیے ہرگز نہ لی جائے گی. طالب علموں میں ڈاکٹر صاحب کی یہ بات سن کر بڑا جوش اور جذبہ پیدا ہو گیا تھا. مجلس تعلیم کی ایک قابل فخر کارنامہ بن گیا جس کی مثال ہندوستان کے مسلمانوں میں نہیں ملتی. ڈاکٹر صاحب ہر مرتبہ اپنی تقریر میں کوئی نہ کوئی چونکا دینے والی بات ضرور کہتے. وہ کہا کرتے تھے کہ جامعہ کا کام وہ اور ان کے ساتھی عبادت سمجھ کر کر رہے ہیں. کام اگر خلوص اور نیک نیتی سے کیا جائے تو عبادت بن جاتا ہے. اس سے عبد کا رشتہ معبود سے پیدا ہو جاتا ہے.

جامعہ کے وہ دن یاد آتے ہیں جب ڈاکٹر صاحب بورڈنگ ہاؤس میں یکایک آ جاتے. اگر کہیں کاغذ کے ٹکڑے پڑے ہوتے اور کچھ کوڑا کرکٹ ہوتا تو خود اٹھانے لگتے. ان کو یہ کام کرتا دیکھ کر ہم لوگ بھی اس کام میں لگ جاتے. ڈاکٹر صاحب کی طبیعت میں صفائی اور نفاست رچی بسی تھی. ان کے کپڑے بھی صاف ستھرے عمدہ کے ہوتے تھے. بورڈنگ ہاؤس کے صحن میں ان کی صفائی کے طریقے بتاتے اور بتاتے کہ یہ ضروری نہیں کہ کمروں میں اعلیٰ درجہ کا فرش ہو معمولی ٹاٹ کا فرش بھی صاف ستھرا رکھا جا سکتا ہے. کبھی کبھی کھانا کھاتے وقت ڈاکٹر صاحب آ جاتے ہم لوگ انہیں کھانا کھانے پر اصرار کرتے اور دسترخوان پر بٹھاتے. ڈاکٹر صاحب کبھی ہندوستانی اور مشرقی کھانوں کا ذکر کرتے ان کے انواع و اقسام کے آداب دسترخوان بتاتے. صاف ستھرا دسترخوان ہو کھانے والوں کے صاف ستھرے کپڑے ہوں شیروانی کے بٹن لگے ہوئے ہوں ادب اور تمیز سے کھانا کھاتے. نوالہ چبانے میں آواز نہ نکلے. کبھی مغربی کھانوں کے بہتر سے طور طریقے بتاتے. اور سب ساری دلچسپ باتیں بتاتے. کمرہ میں کتابیں کیسے رکھی جائیں. لکھنے کی میز پر کیسے سجایا جائے. قلم دوات رکھنے کا سلیقہ اور قرینہ کیا ہو جس سے آپ کے ذوق نفاست کا اور طبع نفیس کا پتہ چلے. ڈاکٹر صاحب خوشخطی پر بہت زور دیتے تھے اور کہتے تھے کہ اس سے لکھنے والے کی نفاست اور ذوق کا پتہ چلتا ہے. اور اس کی شخصیت کا اندازہ ہوتا ہے. اور لکھنے کو کسی بھی طرح لکھا جا سکتا ہے. سطریں سیدھی ہوں حروف کے دائرے مناسب اور برابر ہوں قلم صاف ستھرا ہو. انگلیاں سیاہی سے آلودہ نہ ہوں. ڈاکٹر صاحب خود بہت خوشخط تھے. کہتے تھے ان کے پیر نے ان سے خوب مشق کرائی ہے کتابیں نقل کرائی ہیں.

ہم لوگ درجہ میں فرش پر بیٹھا کرتے تھے. فرش کی صفائی اور ستھرائی ڈاکٹر صاحب خود بھی دیکھتے اور دوسرے استاد بھی. کتب خانہ کی کتابیں حفاظت اور سلیقہ سے استعمال کی جائیں کہ ان کتابوں کے پڑھنے والے آپ کے سوا اور بھی ہیں کتابوں پر جا و بیجا نشان نہ لگائیے اس سے دھوکا بھی ہو سکتا ہے. ڈاکٹر صاحب نے منشی علی محمد صاحب سے جو ایسے

عہد کے بہترین اور مشہور خطاط اور خوش نویس تھے جو صوم و صلوٰۃ کے بڑے پابند تھے اور بلا وضو کیے لکھنے نہ بیٹھتے تھے،
ان سے کئی وصلیاں اور قطعات لکھوائے تھے اور انہیں طبع کرایا تھا یہ قطعات خوشخطی کا بہت اعلیٰ نمونہ ہیں اور
آج بھی بہت سے جامعہ والوں کے پاس محفوظ ہیں:

سرمگلا اختصاری باید کرد — یک کار ازیں دو کاری باید کرد
یاتن بہ رضائے دوست می باید داد — یا قطع نظر زیار می باید کرد

اور حالی کا یہ قطعہ ۔

دنیائے دنی کو نقش فانی سمجھو — ہر چیز یہاں کی آنی جانی سمجھو
پر جب کرو آغاز کوئی کام بڑا — ہر سانس کو عمر جاودانی سمجھو

یہ قطعات ذاکر صاحب نے منشی علی محمد صاحب سے لکھوا کر اپنے آفس کے کمرہ میں آویزاں کیے تھے جس سے
ذاکر صاحب کے حوصلہ عزم اور کام کی نوعیت کا اندازہ ہوتا ہے۔ ان کی زندگی اور عظمت کی نشاندہی ہوتی ہے۔
بڑے کام کا انہوں نے آغاز کیا تھا اور اپنی جان و تن اس کام میں لگا دینے کی آرزو انہیں تھی۔

ذاکر صاحب جب جرمنی تعلیم کے لیے گئے تو وہاں انہوں نے دیوان غالب خط نسخ میں اپنے اہتمام
سے چھپوایا تھا انہوں نے اس کی Composing بھی کی تھی۔ دیوان غالب کا یہ ایڈیشن ذاکر صاحب کے ذوق
نفاست اور غالب سے انکے لگاؤ کا مظہر ہے۔ اس ایڈیشن میں غالب کی ایک تصویر بھی انہوں نے شائع کرائی
ہے جو اصلی نہیں ایک مصور کی بنائی ہوئی ہے جو ذاکر صاحب نے حلیہ، لباس اور ان کی وضع قطع کا Idea
دیکر بنوائی تھی اور اسکے ساتھ دو قطعات خط نسخ میں مع تصویر چھپوائے تھے بہت ہی خوبصورت اور دیدہ زیب۔
غالب کا پہلا قطعہ تھا ۔

اے تازہ واردانِ بساطِ ہوائے دل — زنہار گر تمہیں ہوسِ نائے و نوش ہے
داغِ فراقِ صحبتِ شب کی جلی ہوئی — اِک شمع رہ گئی تھی سو وہ بھی خموش ہے

یہ قطعات ابھی تک بعض جامعہ والوں کے پاس محفوظ ہیں اور ذاکر صاحب کی یاد دلاتے رہتے ہیں۔
عیدین کے موقع پر بھی بہت خوشخط قطعات منشی علی محمد صاحب سے لکھوا کر ہم لوگوں کو ہر سال دیتے تھے بڑے
خوبصورت کارڈوں پر چھپوا کر عید کی صبح ہی۔ اقبال کا قطعہ ہے

اے کہ از خمخانۂ فطرت بہ جامم ریختی — آتشِ صہبائے من بگداز مینائے مرا

یا اکبر کا یہ قطعہ ط سینے میں دل آگاہ جو ہے کچھ غم نہ کرو ناشاد سہی

ط ہر چند بگولہ مضطر ہے اک رقص تو اسکے اندر ہے
اک مقصد بیکراں طلب ہے اس دنیا میں جو آیا ہے محروم عمل تو رہتا ہے وہ جیتے جی مر جاتا ہے

اور ایسے ہی دوسرے قطعات، بڑے خوشخط اور خوشنما۔

ذاکر صاحب کی باتوں میں بڑی کشش، خلوص اور لطف ہوتا۔ ایک مرتبہ مولانا مسعود علی ندوی جامعہ تشریف لائے ہم لوگوں کی کلاس گرگری کوٹھی سے بیچ تک کے پاس ہی تھی جب مسعود صاحب اور انکے ساتھی تانگہ میں سوار ہونے لگے تو مولانا نے ذاکر صاحب کو مخاطب کر کے کہا، ذاکر صاحب آپ مقناطیس تو نہیں کھاتے؟ آپ کے پاس سے جانیکو جی نہیں چاہتا۔ ذاکر صاحب مسکرا کر رہ گئے۔

ایک مرتبہ جواہر لال جی جامعہ آئے ذاکر صاحب انہیں جامعہ دکھانے لے گئے دکھاتے دکھاتے اسٹوڈنٹ کوآپریٹو اسٹور کے پاس پہنچے۔ جواہر لال جی اندر گئے وہاں کھدر کے کچھ تھان رکھے تھے۔ سن لائٹ سوپ اور دوسرے صابن غالباً لکس سوپ، سودیشی اور بدیشی بہت سی چیزیں رکھی تھیں۔ وہ زمانہ ایسا تھا کہ سودیشی پر بہت زور دیا جاتا تھا جواہر لال جی جب دکان سے باہر نکلے تو ذاکر صاحب نے پوچھا "دیکھی دکان؟" جواہر لال جی نے کہا "ہاں" پوچھا کیا کیا دیکھا؟ تو جواہر لال جی نے بڑے مزاحیہ انداز سے کہا "یہی سن لائٹ سوپ اور دوسرے صابن وغیرہ"۔ ذاکر صاحب کچھ شرمندہ ہو کر رہ گئے۔ طلبا کو خیال ہوا کہ بدیشی چیزیں اتنی دکان میں نہیں رکھنی چاہئیں ورنہ ذاکر صاحب کو شرمندگی اٹھانی پڑتی ہے۔ یہ تھا ذاکر صاحب کا احترام اور محبت طالب علموں کے دلوں میں۔

جامعہ کا یوم تاسیس تھا حکیم اجمل خاں صاحب جلسہ کی صدارت کر رہے تھے۔ پنڈت مالویہ نے گرگری عمارت پر قومی جھنڈا لہرایا تھا۔ (اس وقت تک جامعہ کا اپنا جھنڈا نہیں تھا) ڈاکٹر اینی بیسنٹ بھی جلسہ میں موجود تھیں۔ Legislative اسمبلی کے بہت سے اراکین اور عمائدین دہلی تھے۔ ذاکر صاحب نے مہمانوں کو خوش آمدید کہتے ہوئے جامعہ کے کاموں کا ذکر کیا تھا، بڑے مؤثر پیرایہ میں۔ ذاکر صاحب نے کہا تھا کہ جامعہ والے کام کو اس طرح کرنا چاہتے ہیں کہ لوگ انکے کاموں کو پسند کریں اگر لوگوں کی پسند کا یہ کام نہ ہوا تو جامعہ بند ہو جائے گی۔ عوام ہم کو ٹھکرا دینگے۔ جامعہ کا کام اگر معقول ہوا اور لوگ اسے پسند کریں تو ہم عوام سے چندہ نہیں بطور ٹیکس روپیہ لینگے۔ اور اس طرح کر دینے والا یہ سمجھے کہ ہم نے ان سے روپیہ قبول کر کے

ان پر احسان کیا ہے۔ دولت کو دراصل علم کا خادم ہونا چاہیئے علم کو دولت کے سامنے جھکنا یہ اسکا منصب نہیں۔
اگر جامعہ کا کام اس انداز سے ہو تو چلتا رہے گا ورنہ جامعہ سد ہو جائیگی" بڑے ہی موثر انداز میں ذاکر صاحب
نے یہ باتیں کہی تھیں، باتیں دل سے کہی تھیں اور دلوں پر انکا اثر ہو رہا تھا۔ ذاکر صاحب کہا کرتے تھے "جامعہ
کا طالب علم کہیں بھی ہو وہ ہر جگہ یہ سمجھے کہ وہ جامعہ کا کام کر رہا ہے۔ ایمان اور یقین کے ساتھ۔ اس سے اسکے دل
کی صفائی ہوگی اور کام بھی نیکی کا اور اچھا ہوگا اور جامعہ کے نام سے وہ ہر جگہ پہچانا جائیگا۔ جامعہ ملک اور قوم کی
زندگی میں اس طرح بس جاتے تو ہر کام جو جامعہ کا طالب علم کرے جامعہ ہی کا کام معلوم ہوگا۔ یونیورسٹی کی تعلیم کا
مقصد بھی یہی ہوتا ہے کہ ملک اور قوم کی زندگی میں تعلیمی درسگاہ ایک واسطہ بنا اور ربط قائم کرے۔ جامعہ کے اسناد
کو حکومت تسلیم نہیں کرتی اس کا طالب علم اپنی ڈگری سے نہیں اپنے علم اور کاموں سے پہچانا جاتا ہے۔ اس میں قدر فی الذات
ہو اور معیاری وہ ایسا سکہ نہ بنے جس پر ٹھپا لگ جاتا ہے تو سونا کہ کاس جاتا ہے حالانکہ اسکی قدر و قیمت چار آنہ
بھی نہیں۔ آپ کو سرکاری نوکری نو ملیگی نہیں، ممکن ہے آپ اخبار نویسی کا پیشہ اختیار کرنا چاہتے ہوں آپ کا علم تاریخ
سیاسیات اور معاشیات اسکے کام آئیگا۔ آپ کاروبار کرنا چاہتے ہوں تو اقتصادیات کا علم آپ کے کام کا ہوگا، کسی اچھے
تاجر کے پاس رہ کر آپ علم تجارت بھی سیکھ سکتے ہیں چاہے آپ تصنیف و تالیف کا کام کرنا چاہتے ہوں یا دوکانداری
آپ کا علم اور آپ کی استعداد کام آئیگی۔ یہ بیکار جانے والی چیز نہیں"۔ اس زمانہ میں Business
management & Commerce کا ایسا چرچا اور زور نہیں تھا جیسا آج ہے پھر بھی جامعہ میں کبلاٹ
صاحب حالات حاضرہ پر Leaderette لکھواتے تھے۔ یہ جرنلزم کی کوئی باقاعدہ تعلیم تو تھی نہیں لیکن کچھ نہ کچھ تھی ضرور۔
ذاکر صاحب کہتے تھے "آپ کے کاموں پر سلامت اور جامعہ کی چھاپ ضرور ہو کہ آپ مسلمان ہیں اور جامعہ کے فارغ التحصیل"۔
جامعہ میں حرفہ کی تعلیم بھی ہوتی تھی لیکن اسکے ذریعہ روزی کمانا مقصد نہیں تھا بلکہ یہ اصول کارفرما تھا کہ طالب علم
ذہن و دماغ کے ساتھ اپنے ہاتھ سے کام کرنے کو عیب نہ سمجھے۔ ہاتھ اور دماغ دونوں برابر کام کریں۔ نجاری کی
تعلیم تھی، جلدسازی بھی سکھائی جاتی تھی۔

ہندوستانی یونیورسٹیاں جامعہ کی سند کو تسلیم نہیں کرتی تھیں لیکن باہر کے ممالک جرمنی، فرانس اور مصر وغیرہ
سند کو مانتے تھے۔ جامعہ کے کچھ طالب علم B A (Hors) کرنے کے بعد اور علم حاصل کرنے کے لیے زیادہ تر جرمنی، فرانس،
اور مصر جاتے۔ ایک دو بیرسٹری کی تعلیم کے لیے لندن بھی جاتے وہاں Littlego کا امتحان پاس کرنے کے بعد بیرسٹری
کے لیے داخلہ لیتے۔ غلام سرور صاحب (جامعہ کے ایک طالب علم) مصر کی فواد یونیورسٹی میں داخلہ لینے کے لیے جانیوالے

تھے۔ دستور کے مطابق Students' Union کی طرف سے ان کو خدا حافظ کہنے کے لیے ایک جلسہ ہوا۔ ذاکر صاحب بھی آئے۔ باہر جانے والے کو کچھ نہ کچھ تحفہ بھی دیا جاتا تھا۔ دستور کے مطابق ذاکر صاحب نے سرور صاحب کو ایک قرآن مجید بطور تحفہ دیا۔ تحفہ دیتے وقت تقریب کی الفاظ تو دماغ میں رہے نہیں پوری طرح، مفہوم تقریباً یہ تھا: "سرور صاحب آپ جانتے ہیں اس کتاب کی آیات ہمارے آخری پیغمبر حضرت محمد صلعم پر نازل ہوئی ہیں۔ عربی زبان کی فصاحت و بلاغت آپ جانتے ہیں کہ یہ جانی اور مانی ہوئی چیز ہے۔ لیکن اس کتاب، قرآن کی فصاحت و بلاغت ایک معجزہ ہے۔ یہ خدا کا کلام ہے ہمارے رسول جو امی تھے ان پر نازل ہوا تھا۔ اس کتاب نے ایک انقلاب دنیا میں لایا۔ اسکو پڑھ کر بر دن کیا لاکھوں نے اپنی زندگیاں سنواریں، کیا ادھ کیا قومیں اور وہ بام عروج پر پہنچیں۔ اس کتاب کو اپنے لیے شمع ہدایت بنا کے، آپ بھی اس کو اپنی زندگی کی شمع ہدایت بنائیے۔ خدا آپ کی زندگی بامراد اور کامیاب کرے۔ تحصیل علم سے فارغ ہو کر خدا اور رسول پر ایمان کے ساتھ خدا آپ کو واپس لائے"۔

انصاری میموریل ہال میں ایک مشاعرہ کا انعقاد ہوا تھا۔ مولانا حسرت موہانی بھی شریک مشاعرہ تھے۔ مولانا کے شعر پڑھنے کا انداز ایسا تھا کہ عوام کے من کو بھاتا نہیں تھا۔ مولانا نے اپنی غزل کے دو ایک ہی شعر پڑھے ہونگے کہ ان کی آواز کی وجہ سے اشعار کی قدر و وقعت کم ہو گئی اور مشاعرہ میں کچھ بے چینی کے آثار پیدا ہوئے۔ ذاکر صاحب مولانا کے پاس ہی بیٹھے ہوئے تھے۔ ساتھ اٹھے اور مولانا سے انکی غزل کا پرچہ لیکر غزل پڑھنی شروع کی۔ مشاعرہ میں رنگ آگیا اور حسرت کی غزل کی خوب داد دی گئی۔ ذاکر صاحب کا ایک بیک اٹھنا اور حسرت کی غزل لیکر سنانا بھی مشاعرہ پر اثر انداز ہوا۔ ذاکر صاحب ان لوگوں میں سے تھے جو اچھے لوگوں اور اپنے بزرگ ہستیوں کی بات کو کسی طرح گرتے ہوئے نہیں دیکھ سکتے تھے۔ بزرگوں کی عزت اور قدر کس طرح کی جاتی ہے جانتے تھے۔ شہنشاہِ تغزل کا کلام اور ذاکر صاحب کی زبانی، عجب رنگ بندھا۔

باہر کے مسلمان مشاہیر خصوصاً ترکی کے، ان کو بلا کر توسیعی لکچرس (Extension Lectures) کا سلسلہ جامعہ نے شروع کیا تھا۔ حکیم اجمل خاں صاحب کے بعد ڈاکٹر انصاری جامعہ کے امیر تھے۔ جنگِ بلقان میں یہ میڈیکل مشن لیکر ترکی گئے تھے۔ ترکی کے مشاہیر سے ان کے مراسم اور جان پہچان تھی۔ پہلے رؤف پاشا آئے۔ یہ وہ بحری جنرل تھے جو دردانیال سے جنگ کے زمانہ میں اپنا جہاز بڑی خوبی سے دشمن سے بچا کر نکال لائے تھے۔ بہت پسند کئے گئے۔ پھر خالدہ ادیب خانم۔ خالدہ ادیب خانم کے چھ لکچرس دو ماہ میں وقفہ وقفہ سے انصاری میموریل ہال میں ہوئے۔ یہ سلسلہ تین چار سال تک جاری رہا۔ خالدہ خانم کے لکچروں کی صدارت ڈاکٹر بھگوان داس اور علامہ اقبال نے کی تھی۔ یہ لکچرس بہت کامیاب ہوئے۔ بعض گوشوں میں اس پر اعتراض بھی ہوئے کہ یکے بعد دیگرے

ترکی کے لوگوں کو کیوں بلایا جا رہا ہے۔ یہ شاید پان اسلازم (Pan Islamism) کو پھر سے زندہ کرنے کی تمہید نہ ہو۔ لیکن ذاکر صاحب کے سے مردِ حق ہیں اور حق آگاہ نے اسکی کوئی پرواہ نہ کی اور نہ جواب دیا۔ یہ تھی ذاکر حسین کی مومنانہ شان۔ خالدہ خانم گاندھی جی سے ملنے وردھا بھی آئی تھیں ذاکر صاحب انکے ساتھ تھے۔

خالدہ خانم کی انگریزی تقریر جو انہوں نے وردھا کے پبلک جلسہ میں کی تھی کا ترجمہ ذاکر صاحب نے اس خوبی سے کیا تھا کہ اس میں خالدہ خانم کی جوش اور شانِ خطابت سب کچھ آگیا تھا اور لوگ سناتے ہیں کہ ترجمہ حرف بہ حرف پورا تھا ذاکر صاحب نے اسٹار میموریل ہال کے افتتاح کے وقت کمرہ میں اردو کے شعرا اور نثر نگاروں کی تصاویر آویزاں کرائی تھیں۔ ایک جدت یہ تھی کہ افتتاح کے جلسہ میں ہر تصویر کے پیچھے ایک ایک لڑکے کو کھڑا کر دیا گیا تھا جس نے ہر شاعر اور نثر نگار کی خصوصیات کلام اور نثر کے نمونے پڑھ کر سنائے تھے جو اسے لکھ کر ذاکر صاحب نے دیئے تھے۔ یہ چیز بہت پسند کی گئی تھی۔ اسی میموریل ہال میں حفیظ جالندھری نے مولانا محمد علی کا مرثیہ ترنم سے پڑھ کر سنایا تھا۔ حفیظ جالندھری کا ترنم اور مولانا محمد علی کا مرثیہ عجیب کیفیت تھی لوگوں کی ذاکر صاحب بھی موجود تھے ان کی آنکھیں اور اوروں کی بھی پرنم تھیں اور مجمع پر سخت اثر ہو رہا تھا۔ معلوم نہیں کیوں یہ خیال دل میں آ رہا تھا کہ ذاکر حسین میں ہمیں مولانا کا نعم البدل مل گیا ہے۔ یہ تھی ذاکر صاحب کی علمی قدر و منزلت اپنے شاگردوں کے دلوں میں۔

میں ثانوی چہارم (انٹرمیڈیٹ) کا پہلا سال میں تھا کہ میرے والد کا انتقال ہو گیا میں تعطیلات کلاں میں گھر آیا ہوا تھا میں نے یہاں سے ذاکر صاحب کو خط لکھا کہ مجھے اب کیا کرنا چاہیئے۔ ذاکر صاحب کا فوراً جواب آیا ان کا خط میرے پاس بہت دن محفوظ رہا لیکن کہیں ضائع ہو گیا۔ خط کا مضمون مجھے ابتک حرف بہ حرف یاد ہے خط میں لکھا تھا آپ کے والد صاحب کا انتقال ہو گیا۔ ان کا سایہ آپ کے سر سے اٹھ گیا۔ اس موقعہ پر صبر کی تلقین غم کو دوبالا کر دیتی ہے آپ کو خوب رونا اور آنسو بہانا چاہیئے۔ رونے سے دل کی صفائی ہوتی ہے اور دل کی بہت سی سیاہیاں دھل جاتی ہیں۔ میں آپ کو صبر کرنے کے لیے نہیں کہونگا آپ خوب رو لیجئے صبر اور سکون آ جائے گا۔ آپ اپنی تعلیم جامعہ میں جاری رکھئے اور یہاں سے فارغ التحصیل ہو جایئے۔ گھر کے انتظامات اپنے چچا کے سپرد کر دیجیے۔" ذاکر صاحب کے خط نے مجھے ہمت دلائی اور میں اپنی تعلیم جاری رکھ سکا۔

ثانوی پنجم (انٹرمیڈیٹ) پاس کرنے کے بعد میں جامعہ کے بی۔ اے میں داخل ہوا۔ دوران تعلیم مجھے گھر آنا پڑا اور کئی مہینہ یہاں رہنا پڑا۔ استادوں کی مدد مجھے خاطر خواہ نہ مل سکی مجھے تو یہ ڈر تھا کہ میرے پرچے اچھے نہ ہو سکیں گے لیکن خدا کی مدد شامل حال رہی اور میں نے پرچے اچھے کیے۔ یہ پرچے اچھے کرنے کی بات میں نہیں کہہ رہا ہوں بلکہ میرے ایک کرم فرما اور دوست حفیظ الدین صاحب سے میرے پرچوں کی اب ذاکر حسین صاحب

نے کہا تھا کہ استاد کی مدد نہ ملے۔ سیاہ و چہرے پہ چھا گئے کہ اور یہ کہ وہ چاہتے ہیں کہ میں ایک مدرسہ کھولوں چاہے ابتدائی ہی ہو اور اس میں جامعہ کی طرز کی تعلیم دی جائے۔ جب سے حفیظ صاحب نے یہ لکھا تھا اس وقت سے ایک مدرسہ کا خیال میرے ذہن میں جاگزیں تھا لیکن میں رفیقانِ کار کہاں سے لاتا جن میں ایثار اور قربانی کے جذبات ہوتے ہیں۔ خود بھی ایثار اور قربانی کے معیار پر پورا نہ اتر سکتا۔ ذاکر صاحب کی طرح اپنے ساتھ کام کرنے والوں میں جوش اور جذبہ کہاں سے پیدا کرتا۔ بس یہ خیال لیے ہوئے دو تین سال بیٹھا رہا کہ ایک سبیل نکل آئی۔

مسلم Mass Contact کی تحریک جو ۱۹۳۷ء میں جواہر لال جی نے شروع کی تھی اپنے عروج پر تھی۔ وردھا کے سیٹھ جمنا لال بجاز جامعہ کے خزانچی بھی تھے اور کانگریس کے ایک بہت بڑے لیڈر۔ ان کا شکشا منڈل جو مارواڑیوں کی ایک ایجوکیشن سوسائٹی تھی ایک ہائی اسکول وردھا میں چلاتی تھی اس اسکول کے دو سکشن تھے ایک مراٹھی کا اور دوسرا ہندی کا۔ سیٹھ جمنا لال جی اپنے ہائی اسکول میں ایک اردو سکشن بھی کھولنا چاہتے تھے۔ مسلم Mass Contact کے زیر اثر۔ ڈاکٹر صاحب اس دوران میں گاندھی جی سے ملنے وردھا آئے ہوئے تھے۔ ان سے جمنا لال جی نے ذکر کیا کہ جامعہ سے کوئی شخص ہمیں دیجیے جو ہمارے اردو سکشن کو چلائے۔ اتفاق کی بات کہ ذاکر صاحب کے ذہن میں میرا خیال آیا۔ میں اسی نواح کا رہنے والا تھا۔ ذاکر صاحب نے مجھے ایک خط لکھا کہ آپ وردھا آجائیے اور سیٹھ جمنا لال جی کے اردو سکشن میں کام کیجئے۔ سیٹھ جمنا لال جی یہ چاہتے ہیں۔ آپ جامعہ میں رہ چکے ہیں اگر ہو سکے تو اردو سکشن میں جامعہ کی کچھ باتیں بھی لائیے۔ میں وردھا آگیا اردو سکشن کا انچارج بنکر۔ اسی سال مارواڑی شکشا منڈل (مارواڑی ایجوکیشن سوسائٹی وردھا) نے اپنی سلور جبلی منائی۔ اور اس کے ساتھ ہی ایک تعلیمی کانفرنس بھی کیا جانا طے کیا۔ صوبوں میں کانگریسی وزارتیں آچکی تھیں۔ شراب بندی کی تحریک ان صوبوں میں چل رہی تھی۔ لیکن اس تحریک پر یہ اعتراض ہو رہا تھا کہ شراب کے ٹیکس سے جو آمدنی ہے وہ کم ہو جائیگی ہم تعلیم کو مفت اور عام کرنا چاہتے ہیں تو یہ کیسے ہو سکے گا؟ گاندھی جی نے اپنے اخبار ہریجن میں تعلیم اور شراب بندی پر اپنے خیالات کا اظہار کیا اور کہا کہ تعلیم خود کفیل ہو۔ کسی حرفہ کو مدرسہ میں جاری کیا جائے اور بچے کام کر کے مدرسہ کا خرچ پورا کریں۔ شکشا منڈل کی جوبلی کے موقع پر اسکے لیے گاندھی جی کے ایما پر ایک تعلیمی کانفرنس بھی بلائی گئی۔

اس کانفرنس میں کانگریسی صوبوں کے وزرائے تعلیم کے علاوہ ذاکر صاحب، مجیب صاحب، عابد صاحب بھی مدعو تھے۔ مدراس کے یعقوب حسن صاحب اور حیدر آباد سے مولوی عبدالحق اور ان کے دو ایک ساتھی۔ بہار کے ڈاکٹر سید محمود بھی کانفرنس میں شریک تھے۔ گاندھی جی اس کانفرنس کے صدر تھے۔ اپنی ابتدائی

تقریر میں گاندھی جی نے اپنے اس خیال کو کہ تعلیم خود کفیل ہو کانفرنس کے سامنے پیش کیا۔ گاندھیائی اصحاب کہا کہ چرخہ
اور تکلی چلا کر تعلیم دینے کا خیال گاندھی جی کا بہت Original خیال ہے۔ کچھ کانگریسی وزراء نے بھی یہی کہا۔ ڈاکٹر
صاحب سنتے رہے ادھر ادھر دیکھا اور پھر یکایک کھڑے ہوئے اور اپنی تقریر شروع کی الفاظ تو سارے یاد نہیں
لیکن مفہوم یہ تھا "آپ لوگ یہ سمجھ رہے ہیں کہ تکلی اور چرخہ سے تعلیم دینے کا گاندھی جی کا خیال Original ہے
اس سے تعلیم کا خرچ پورا ہوگا استادوں کی تنخواہیں دی جا سکیں گی اور مدرسے کیلئے تعلیم کا اور سامان کا انتظام کیا جا سکے گا؟
لیکن ہم لوگ جو تعلیم کا کام کر رہے ہیں جانتے ہیں کہ تعلیم کو کسی حرفہ سے ربط دینا Corelate کرنا کوئی نیا نہیں،
ترکی میں ربط کے ذریعہ تعلیم دینے کو مقصدی طریقہ Project Method کہا جاتا ہے تاریخ کے مضمون کو
ایک بنیادی چیز بنا کر دوسرے مضامین سے Corelate کرنے کا طریقہ ایک عرصہ اور دوسرے ملکوں میں بھی ربط کا
طریقہ رائج ہے کاغذ کاٹ کر مختلف ڈیزائن بنانا اور ان ڈیزائنوں سے تعلیم کو ربط دینا یہ طریقہ جاری ہے۔ چرخہ
اور تکلی اس حرفہ کے ذریعہ بھی تعلیم دی جا سکتی ہے لیکن مدرسہ خود کفیل ہو جائے گا ایسا شاید نہ ہو سکے۔ خود جامعہ ملیہ
میں ہم نے حرفہ کی تعلیم کا تجربہ کیا ہے۔ حرفہ کمائی کا ذریعہ نہیں کہ اس سے تعلیم کا خرچ پورا ہو اور ماہر کاریگر بنتا۔
اس کے لیے کاریگری کے مدرسے الگ قائم کرنے ہونگے۔ لیکن ہمارے ان مدرسوں میں جو ہم کھولنا اور چلانا چاہتے ہیں عام
اور جنرل تعلیم ہو گی جس میں بچے ہاتھ کا کام کرنے کو باعزت کام سمجھیں گے "مزدوروں کا کام نہیں۔ یہ ضروری نہیں کہ ہم خود کفیل
ہو اور یہ اسے مقصد سمجھا جائے اور اس خیال سے تعلیم دی جائے" یہ سن کر سب سے لوگوں کی حسین شکلیں لٹک گئیں
کہ یہ تو گاندھی جی کی مخالفت کرنا ہو گیا گاندھی جی کے خیال کو Or-gina. نہیں مانتے لیکن آخر میں جب مدعی ق
کے اس خیال کو ٹھیک ٹھیک طور پر یہ سمجھے اور جانچنے کے لیے کمیٹی بن گئی تو خود گاندھی جی نے ڈاکٹر صاحب کا نام اس کی
صدارت کے لیے تجویز کیا انکے ساتھ اور لوگ بھی تھے عابد صاحب، ونوبا جی، جاجو جی اور کے۔ ٹی۔ شاہ، آریہ
نائکم پر یہ کمیٹی مشتمل تھی۔ اس کمیٹی کے ابتدائی جلسے کانفرنس کے بعد وردھا ہی میں ہوتے۔ اور بعد میں نصاب تعلیم بنانے
کے لیے جو کمیٹی بنی اس میں کاکا کالیلکر اور خواجہ غلام السیدین کو بھی شامل کر لیا گیا۔ وردھا ہی میں کمیٹی نے اپنی رپورٹ اور
نصاب تعلیم تیار کیا اور بنیادی تعلیم کی یہ رپورٹ "وردھا اسکیم" اور "ذاکر حسین کمیٹی" کے نام سے پورے ہندوستان میں مشہور
ہوئی یہ رپورٹ تو تمام تر ذاکر صاحب ہی نے لکھی تھی وہ پرزے لکھ لکھ کر Typist کو دیتے جاتے تھے اور اس طرح
رپورٹ تیار ہوتی رہی۔ پھر ہری پورہ کانگریس میں بھی بنیادی تعلیم کے لیے تجویز ذاکر صاحب نے پیش کی

۔ شکتا منڈل کی جوبلی کے موقع پر اسکول کے طلباء نے اردو، ہندی، مراٹھی اور انگریزی کے ڈرامے، چار ڈرامے

اسٹیج کیے تھے۔ اردو کا ڈرامہ میں نے تیار کرایا تھا۔ یہ جامعہ کے طلبا مدہولی کے ڈرامے قوم پرست طالب علم سے ماخوذ تھا۔ ڈرامہ کا اول نصف حصہ میں نے تبدیل کر دیا تھا۔ یہ ڈرامہ بہت کامیاب رہا۔ دوسرے ڈراموں میں کچھ ایسے پارٹس تھے جو وقت اور موقع کی ضرورت سے مطابقت نہیں رکھتے تھے اس لیے اسٹیج کرنے والوں کو وہ حصے چھوڑ دینے پڑے۔ اس وجہ سے تینوں ڈرامے کچھ بگڑ گئے۔ اردو ڈرامہ کی سب نے تعریف کی ساتھ ہی ساتھ جامعہ کی بھی کہ ایک جامعہ والے نے ایسا ڈرامہ کرایا جس سے ہم لوگوں کو قوم پرستی کی تعلیم ملتی ہے۔ ذاکر صاحب کی تھا ایسی قوم پرستی کی تعلیم دیتی ہے۔ ذاکر صاحب بھی اس تعریف سے خوش تھے۔ اس وقت ذاکر صاحب کے پاس مطبوعات جامعہ کا ایک سٹ اتفاق سے تھا جس میں پچاس کتابیں تھیں انہوں نے وہ کتابیں ڈرامہ سے خوش ہو کر اردو سکشن کو دیں اور اس طرح اردو لائبریری کی مدرسہ میں بنیاد پڑی۔ جامعہ کا نام اونچا ہوا اور بچوں کی بھی ہمت افزائی ہوئی۔ ذاکر صاحب ہندوستانی تعلیمی سنگھ کے صدر تھے۔ انہیں بنیادی تعلیم کے سلسلہ میں سال میں کم از کم دو مرتبہ اور کبھی کبھی تین بار بھی سیواگرام جانا پڑتا تھا۔ وہ سیواگرام آشرم میں ٹھہرتے تھے۔ حامد صاحب بھی لبیب صاحب اور کبھی شفیق قدوائی صاحب ساتھ ہوتے۔ وہ بڑی شان فلسفہ سے آشرم کے مطبخ کا روکھا پھیکا کھانا کھاتے۔ لوگوں کی طالب سر میں جا کر ان سے گھل مل کر باتیں کرتے۔ ملک کے ہر حصے کے بچے تعلیمی سنگھ کے مدرسہ میں تھے۔ بہار، اڑیسہ اور آسام کے بچے زیادہ تھے۔ کتائی اور صفائی کے درجوں میں زیادہ وقت صرف کرتے۔ آشرم کے سارے پروگراموں میں شریک ہوتے اور تعلیمی سنگھ کے جلسوں میں شرکت کرتے ہر اعتبار سے آشرم واسی کی طرح۔

دو تین دن تعلیمی سنگھ کے آشرم سیواگرام میں گذارنے کے بعد جب انہیں دلی جانا ہوتا یا اور کہیں تو ایک رات پہلے میرے غریب خانہ پر قیام کا شرف مجھے بخشتے۔ اور اس قیام کے دوران ایسی ایسی باتیں اور گفتگو مجھ سے کرتے جس کا میں اہل نہ ہوتا۔

گاندھی جناح ملاقات کے بعد ذاکر صاحب سیواگرام تعلیمی سنگھ کے جلسہ کے سلسلہ میں آئے تھے۔ گاندھی جی نے اس وقت ان سے اس ملاقات کے بارے میں کی رائے معلوم کرنی چاہی۔ ذاکر صاحب نے کہا میں بھی اس ملاقات کے بارے میں پر امید تھا کہ کوئی نہ کوئی سیاسی سمجھوتا اس ملاقات میں ہو جائیگا لیکن افسوس کہ یہ نہ ہو سکا۔ گاندھی جی نے پوچھا اب کیا کیا جائے؟ خواجہ عبدالحمید صاحب میرے پاس تجاویز لیکر آئے تھے کہ ان تجاویز پر Nationalist مسلمانوں سے سمجھوتا کر لیا جائے۔ میں نے ان سے پوچھا کہ ایسے کتنے مسلمان آپ کی جماعت کے ساتھ ہیں؟" ذاکر صاحب نے گاندھی جی سے کہا کہ ہندو مسلم سمجھوتے کا جہاں تک تعلق ہے تو یہ آپ اور جناح صاحب ہی کے درمیان ہو سکے گا۔

صاحب صاحب کے سوا اور کسی سے نہیں۔ گاندھی جی نے کہا "ڈاکٹر صاحب آپ کیا کہتے ہیں" ہم اس شام گاندھی جی کا منڈپ پہلے سے تیار ہو گیا تھا۔

۱۹۴۰ء میں مارواڑی شکشا منڈل نے اپنی مراٹھی ہندی اور اردو کلاسز کو بند کرنے کا فیصلہ کیا۔ مراٹھی اور ہندی ہائی اسکول کا تو انتظام کر دیا گیا لیکن مسلم Mass Contact کی تحریک کی ناکامی کی وجہ سے اردو کلاسز کو نہ صرف بند کیا بلکہ اس کا دوسرا انتظام بھی نہیں کیا گیا۔ اس وقت ذاکر صاحب وردھا آئے ہوئے تھے۔ مدرسہ کا حال پوچھے پر میں نے انہیں بتایا کہ مارواڑی شکشا منڈل نے اردو کلاسیں بند کر دی ہیں۔ ڈاکٹر صاحب گاندھی جی سے ملے۔ اور ان سے کہا کہ یا تو شروع ہی سے ان کلاسوں کو شکشا منڈل کو کھولنا ہی نہیں چاہئے تھا اور اگر کھولا تھا تو پھر اس طرح بند نہیں کرنا چاہیئے تھا۔ مسلمانوں پر اس کا برا اثر پڑیگا۔ اردو کلاسز کے بند کر دینے کا گاندھی جی کو بہت افسوس ہوا۔ ڈاکٹر صاحب سے گاندھی جی نے مل کر اردو کا ایک نیا مدرسہ کھولنے کے لیے انتظام کر دیا۔ گاندھی جی نے مجھے بلایا اور کہا "تم اسکول کے فرنیچر اور دوسرے سامان کا انتظام کرو روپیہ آ جائیگا"۔ جیسا کہ مدرسہ کھلا اور آج بھی مولانا آزاد اردو ہائی اسکول کے نام سے قائم ہے۔ یہ کام ڈاکٹر صاحب نے اس خوش اسلوبی سے کیا اور مدرسہ چلانے کا انتظام اس خوبی سے کرایا کہ وہ لوگ جنہوں نے مدرسہ بند کیا تھا وہ بھی ہمارے دوست اور ساتھی ہو گئے۔

جب ہندوستان کی Interim گورنمنٹ سن ۴۶ء میں بن رہی تھی ڈاکٹر صاحب کو شامل ہونے کی دعوت کانگرس نے دی لیکن انہوں نے شامل ہونے سے انکار کیا یہ کہہ کر کہ ملک کی دو بڑی سیاسی جماعتوں میں اتفاق نہیں اور یہی دونوں جماعتیں Interim Government میں آ رہی ہیں ان میں کوئی سمجھوتہ نہیں ہے تو ہم تعلیمی کام کرنے والوں کے لیے یہ بہت مشکل ہے کہ اس وقت ایسی گورنمنٹ میں شریک ہوں اگر دونوں جماعتوں میں سمجھوتہ ہو جاتا ہے تو میں Interim گورنمنٹ میں شریک ہو جاؤنگا۔ ڈاکٹر صاحب کے اس انکار سے جواہر لال جی تو نہیں لیکن ولبھ بھائی پٹیل ان سے بہت ناراض ہو گئے تھے۔ جب ڈاکٹر صاحب جالندھر کے حادثہ سے بچ بچا کر آئے اور جواہر لال جی سے ملے تو پنڈت جی نے اس واقعہ پر اظہار افسوس کرتے ہوئے انہیں ولبھ بھائی سے ملنے اور صورتِ حال بتانے کا مشورہ دیا۔ ڈاکٹر صاحب ولبھ بھائی پٹیل صاحب سے ملنا نہیں چاہتے تھے لیکن جواہر لال جی کے اصرار پر گئے۔ ڈاکٹر صاحب کے پٹیل صاحب کے پاس جانے سے پہلے ہی جو تفصیلی باتیں ڈاکٹر صاحب اور جواہر لال جی کے درمیان ہوئی تھیں وہ سب کسی طرح پٹیل صاحب تک پہنچ چکی تھیں۔ ہندوستان کی سیاسی زندگی میں بڑے بڑے اتار چڑھاؤ آ رہے تھے۔ گاندھی جی جناح ملاقات کے

بعد بعض حلقوں سے دونوں کی دوبارہ ملاقات کی آواز اٹھ رہی تھی۔ جناح صاحب کا اصرار تھا کہ ان سے مسلمانوں کا نمائندہ سمجھ کر بات کی جائے وہ گاندھی جی یہ سمجھتے تھے کہ کانگریس پورے ہندوستان ہندو و مسلم دونوں کی نمائندہ ہے اور وہ صرف ہندوؤں کے نمائندہ کی حیثیت سے بات نہیں کریں گے۔ اس دوران نواب صاحب بھوپال درمیان میں پڑے۔ گاندھی جی اور جناح صاحب سے انہوں نے علیحدہ علیحدہ ملاقاتیں کیں ان ملاقاتوں کا نتیجہ وہ اعلان تھا جس میں گاندھی جی نے کہا تھا کہ مسلم لیگ ہی کو وہ مسلمانوں کی نمائندہ جماعت تسلیم کرتے ہیں نواب صاحب بھوپال کی اس کارکردگی پر ان کی بہت واہ واہ ہوئی نواب صاحب بھوپال کی اس کارکردگی میں ڈاکٹر صاحب کی بھی درخواست کا بہت دخل تھا۔ ڈاکٹر صاحب اور نواب صاحب دونوں چاہتے تھے کہ ملک میں جو عدم یقینی کی کیفیت پیدا ہوگئی ہے وہ کسی نہ کسی طریقہ سے دور ہو اور ہندوستان اپنی آزادی کی منزل سے قریب تر ہو جائے لیکن گاندھی جی نے دوسرے دن ہی۔ لکھا یہ بیان واپس لے لیا اور اس سے علیحدگی ہوئی وہ مسلم لیگ کو واحد نمائندہ جماعت ماننے کو تیار نہیں اور یوں ہندوستان کی سیاسی زندگی میں ایک انتشار پیدا ہو گیا۔

ملک کی تقسیم کے بعد جبلپور سے ڈاکٹر صاحب ایک جلسے کے لیے میسو گرام آ رہے تھے شفیق صاحب قدوائی ساتھ تھے مسز کرپلانی بھی اسی گاڑی سے آئی تھیں۔ وردھا کے پلیٹ فارم پر ڈاکٹر صاحب نے اپنے ساتھیوں سے گھبراہٹ کر مجھ سے پوچھا کہ آپ یہیں ہیں تو یہیں رہیں گے؟ میں نے جی ہاں" جواب دیا کہا "یہاں سے بھی لوگ ہجرت کر رہے ہیں" میں نے کہا تو ہاں حیدرآباد کا رخ کر رہے ہیں۔ آپ کا مدرسہ کیسا چل رہا ہے" میں نے بتایا "اس پر بھی اثر پڑا ہے۔ ڈاکٹر صاحب نے کہا موت تو برحق ہے۔ کہیں چھپ کر بھی آپ بیٹھیں تو وہاں بھی آئیگی اس لئے ہمت نہ ہاریئے ثابت قدم رہیئے۔ جہاں ہیں وہیں رہیئے۔ ایک مرتبہ آپ پھسلے تو پھسلتے ہی چلے جائیں گے۔ ایمان سلامت رکھئے اور خدا پر بھروسہ۔ ڈاکٹر صاحب کو مسز کرپلانی نے آواز دی اور پھر وہ اُدھر چلے گئے۔ ڈاکٹر صاحب اس وقت جالندھر کے حادثہ سے بچ کر آئے تھے جس کا بہت ہی مختصر ذکر انہوں نے خود کیا تھا شفیق قدوائی صاحب نے پورا اور مفصل واقعہ ڈاکٹر صاحب پر کیا گذری بتایا تھا کہ کس حوصلہ اور ہمت سے کام لیکر انہوں نے جالندھر کے اسٹیشن پر آر۔ ایس۔ ایس کے رضاکاروں سے کہا تھا کہ "بحمداللہ میں مسلمان ہوں چلئے کہاں لیکر چلتے ہیں آپ مجھے" ایسے وقت جس کا بھروسہ خدا پر ہو وہی ایسی موت جو نظر آ رہی تھی کے سامنے یہ کہہ سکتا ہے۔ ایمان اور یقین کی یہ سخت آزمائش تھی جس میں ڈاکٹر صاحب پورے اترے۔

ڈاکٹر صاحب کو حیدرآباد سے قلبی لگاؤ تھا۔ حیدرآباد کے اندرونی حالات اچھے نہیں تھے۔ حیدرآباد

کے کرسی نشینوں کے متعلق ایک مرتبہ بڑے جذباتی انداز میں کہا تھا کہ "انہیں تھرنا تھوما کر لیجئے تھوڑے دنوں بعد یہ دیکھنے کو کہیں نہیں ملیں گے۔ عہد رفتہ کی یادگار بن جائینگے"۔ دوسری طرف صورت حال یہ تھی کہ انکی طرح نظام یہ چاہتے ہیں کہ انکے تخت و تاج کو رضاکاروں سے بچایا جائے کہنے لگے نظام یہ سمجھتے ہیں کہ حکومت ہند انکو بچا سکیگی میرے پاس پیغام آتے تھے کہ ولبھ بھائی پٹیل سے حیدر آباد کا سمجھوتہ کرا دیں نظام کی مدد کروں ایک لاکھ روپیہ بلکہ اس سے زائد بھی آپکی مدد ہوگی۔ ڈاکٹر صاحب نے پیغام لانے والوں کو بتایا کہ "وہ غلطی میں مبتلا ہیں کہ پٹیل کوئی سمجھوتہ کریں گے وہ تو نظام کا خاتمہ کر کے رہینگے۔ اور آپ یہ بھی غلط سمجھتے ہیں کہ رضاکار نظام کو تخت و تاج سے محروم کر دینا چاہتے ہیں"

تقسیم کے بعد ہندوستان خصوصاً دلی میں شرنارتھی آنا شروع ہوئے ان کے بچوں کی تعلیم کے لیے دلی سے سرد کے فرید آباد میں ایک مرکز کھولا گیا اس سلسلہ میں جو سرکاری کارروائی ہوئی کہ تعلیم کا انتظام کس کے سپرد کیا جائے تو جواہر لال جی کے کاغذات پر یہ سطریں بطور نوٹ لکھا تھا

'Educat.on of refugee children should be ertrusted to the Jam'a as its responsibi..ty Jam1a is more modern in a way and sec.lar in its spirit

ڈاکٹر صاحب نے اس نوٹ کو دیکھ کر تعلیمی کام کرنے کی حامی تو بھر لی لیکن جواہر لال جی کو اس پر آمادہ کر لیا کہ شرنارتھی بچوں کی تعلیم کا کام ہندوستانی تعلیمی سنگھ کی ذمہ داری قرار دی جائے۔ جامعہ والے اس کام میں تعلیمی سنگھ کو مدد دینگے۔ یہ کام جامعہ کے ایک استاد شفیق صاحب کے سپرد کر دیا گیا جنہوں نے اسی طریقہ سے کام شروع کیا۔ یہ تعلیمی سنگھ والوں سے میل نہیں کھاتا تھا ڈاکٹر صاحب کے پاس جب جھگڑا پہنچا تو انہوں نے فیصلہ کیا کہ جامعہ والے تو کام ہٹ گئے ہیں لیکن وہ کام تعلیمی سنگھ کے پروگرام کے مطابق ہوگا۔ تعلیمی سنگھ کی جائنٹ سکریٹری آشا دیوی فرید آباد میں رہیں گی اور کام کی نگرانی کریں گی۔ اس طرح ہندوستانی تعلیمی سنگھ کے دو مرکز قرار پائے ایک ہندوستانی تعلیمی سنگھ سیواگرام اور دوسرا تعلیمی سنگھ فرید آباد۔ شرنارتھیوں اور آشا دیوی جی میں کچھ اختلافات ہوئے اور بات بڑھی شرنارتھیوں میں ایک صاحب تھے رام لال جی جو ایک جماعت کے لیڈر تھے۔ انہوں نے ایک جماعت شرنارتھی کو اپنے ساتھ ودیا تعلیم کی دیوی مان کر رکھا تھا اپنے حواریوں سے ہر روز صبح و شام دیوی جی کے سامنے پرارتھنا اور پوجا پاٹ کراتے تھے۔ آشا دیوی جی کو اس پر اعتراض ہوا اور جھگڑا بڑھا۔ رام لال جی نے برت رکھا برت کے چار دن کسی طرح گذر گئے۔ رام لال جی کہتے تھے کہ جب تک ڈاکٹر حسین صاحب یہاں آکر میری بات نہیں سنیں گے میں برت نہیں توڑونگا۔ ڈاکٹر صاحب فرید آباد گئے رام لال جی کی بات سنی اور رام لال جی نے برت توڑ دیا۔ لیکن جھگڑا آشا دیوی جی سے قائم رہا۔ کچھ دنوں بعد سیواگرام میں

تعلیمی سنگھ کا جلسہ جالندھر یا ہوگیا پنڈ سے آئے تھے۔ اس وقت رام لال جی دیوی جی کو اور اپنے ساتھ ۱۰۰ اپنے ساتھیوں کو لیکر سیوا گرام آئے وہ چاہتے تھے کہ آشا دیوی تمام لوگوں تعلیمی سنگھ کے سامنے ان سے معافی مانگیں کہ آشا دیوی نے ان پر یہ شک و شبہ کیا اور انہیں بدنام کیا ذاکر صاحب کو پھر درمیان میں ڈالا گیا۔ کہاں تو رام لال جی اور انکے ساتھی بھرے ہوئے آئے تھے پولس کو اطلاع دینے کا سوچا جا رہا تھا لیکن ذاکر صاحب سے بات چیت کرنے کے بعد رام لال جی اور انکے ساتھیوں کی حالت یہ تھی کہ سب نے یک زبان ہو کر کہا کہ جو ذاکر صاحب کہیں وہ لوگ کرینگے ذاکر صاحب نے بڑی حسن و خوبی اور خداداد صلاحیت سے کام لیکر اس جھگڑے کو یوں سلجھایا کہ رام لال جی بالکل رام ہو گئے اور شام ہی کی گاڑی سے دلی روانہ ہوگئے آشا دیوی کو رام لال سے معافی نہیں مانگنی پڑی ایسی کئی الجھنیں ذاکر صاحب نے سلجھائی ہونگیں۔ ہر فریق کا ان پر اعتماد تھا اور ان پر بھروسہ رکھتا تھا

ذاکر صاحب جامعہ چھوڑ کر علی گڈھ چلے گئے جہاں انہوں نے اپنی زندگی کے ۲۵ سال سے زائد گذارے اور اسکی تعمیر کی لیکن وقت کے حالات اور تقاضے ایسے تھے کہ اس وقت وہ علی گڈھ کی وائس چانسلری قبول نہ کرتے تو قوم کے سب سے نقصان کا اندیشہ تھا علی گڈھ یونیورسٹی پر ہر طرف سے یلغار ہو رہی تھی اور ہر ایک موثر حیثیت والا بھی اس سے وفاداری کا ثبوت مانگتا تھا اور بقول رشید احمد صدیقی صاحب علی گڈھ نے ایک جیلی کی ضمانت مانگی تھی۔ ذاکر صاحب کے علی گڈھ جانے سے وہ مسائل ختم ہوئے اور یونیورسٹی کو نئی زندگی ملی ۔

ایک مرتبہ حیدرآباد کے ایک صاحب ذاکر صاحب سے گفتگو کر رہے تھے دوران گفتگو میں مسٹر غلام محمد کا جو ان دنوں حیدرآباد کے فنانس منسٹر تھے ذکر آگیا۔ ان صاحب نے اُن کے خلاف بولنا شروع کیا اور صاحب موصوف کی کچھ اخلاقی کمزوری کی باتیں بتائیں۔ ذاکر صاحب ان صاحب کی گفتگو سے لطف مند ہو رہے تھے کچھ دیر صبر و سکون سے سنتے رہے پھر یکایک بولے۔ بس بس خاموش ہو جائیے۔ کمزوریاں کس میں نہیں ہوتیں مجھ میں اور آپ میں سب ہی میں ہیں اس سے کوئی خالی نہیں۔ آپ کی نظر صرف غلام محمد صاحب کی کمزوریوں پر گئی۔ آپ ان کی خوبیاں بھی تو دیکھئے۔ انکی صلاحیت کار اور کارکردگی پر نظر ڈالئے آپ موازنہ کرینگے تو انکی خوبیوں کا پلہ بھاری رہے گا۔ یہ بات تو درست نہیں کہ انکی کمزوریوں کو اچھالا جائے اور خوبیوں کو نظر انداز کیا جائے۔ اسکے بعد وہ صاحب شرمندہ ہو کر چپ ہوگئے۔ ذاکر صاحب اچھی باتوں کو پسند کرتے تھے اور اچھے لوگوں کو بھی۔ اس سے تو ان کی اچھائی اور عظمت کا پتہ چلتا ہے۔ وہ ہر ایک معاملہ کا روشن رخ بھی دیکھ لیتے تھے۔

ایک مرتبہ سیوا گرام میں ونوبا جی بھی جلسہ میں شریک ہونے آئے ذاکر صاحب عابد صاحب اور مجیب صاحب

بھی تھے۔ یہ سب جلسے کے بعد باہر الگ پلنگ پر آکر بیٹھ گئے۔ ونوبا نے ذاکر صاحب سے کہا "میں ان دنوں قرآن شریف پڑھ رہا ہوں، عربی زبان بھی سیکھنا چاہتا ہوں۔ عربی گرامر کی کوئی اچھی کتاب بتائیے۔" ونوبا جی نے ایک عربی انگریزی گرامر کا نام لیا کہ "وہ میں دیکھ رہا ہوں لیکن مجھے ایسا لگتا ہے کہ گرامر ایسی لکھی نہیں ہے [illegible] جیسی وہ کتاب ہے" ذاکر صاحب نے کسی کتاب کا نام اور اسکے مصنف کا نام بھی بتایا۔ پھر قرآن پاک کے مضامین پر بات چلی۔ ونوبا جی سے ذاکر صاحب نے کہا "قرآن شریف کو خود پڑھنا چاہیئے بہت اچھی بات ہے لیکن بہت سے مضامین اور احکامات سمجھنے کے لئے کسی اچھے استاد کی ضرورت باقی رہتی ہے جو ساری چیزوں پر عبور رکھتا ہو اسکے بعد ہی قرآن پاک کی عظمت کا صحیح اندازہ ہو سکتا ہے۔" ونوبا جی نے کہا "میں اسکی کوشش کر رہا ہوں۔" اسکے بعد ونوبا جی نے یکایک پوچھا "ذاکر صاحب آپ نے کبھی داڑھی منڈوائی ہے؟" ذاکر صاحب نے جواب دیا "نہیں ونوبا جی میری داڑھی کو کبھی استرہ نہیں لگا قینچی سے کترتا ہوں" پھر مزاحاً کہا "جرمنی میں خواتین میری داڑھی اور اسکی تراش کی طرف بہت پسند کرتی تھیں"

اسی سلسلے میں ذاکر صاحب نے بتایا کہ جرمنی میں ایک شہر ہے وہاں ہر دسویں سال ایک میلہ ہوتا ہے اس میلے کے لئے ڈھونڈ کر کوئی نوجوان ایسا نکالا جاتا ہے جسکی داڑھی کرائسٹ جیسی ہو جیسی تصویروں میں ہوتی ہے۔ تصویروں میں کرائسٹ کی داڑھی بڑی خوبصورت سی ہے ایسی ہی داڑھی والا نوجوان ڈھونڈ کر میلے کا ہیرو بنایا جاتا ہے"

گاندھی جی کی موت کے بعد سیوا گرام میں گاندھیائی تعمیری کام کرنے والے جمع ہوئے تھے مولانا آزاد، عابد صاحب، مجیب صاحب اور ذاکر صاحب بھی بلائے گئے تھے گاندھیائی کام کرنے والوں میں خواتین بھی تھیں، ان میں ایک خاتون مردولا سارا بائی بھی آئی تھیں انہیں جب پتہ چلا کہ ذاکر صاحب کے ساتھ جالندھر میں کیا حادثہ پیش آیا تھا وہ ذاکر صاحب سے کہنے لگیں کہ وہ جالندھر جا رہی ہیں انہیں وہاں سے گمشدہ چیزوں کا پتہ لگانے کا کام کرنا ہے لہٰذا آپ کا بیگ اور بستر جو جالندھر میں رہ گیا تھا اگر وہ مل گیا تو لے آؤں۔ ذاکر صاحب نے کہا "اسکی تو ضرورت نہیں ہے وہ کسی کے کام آ رہا ہوگا میری کتابیں بھی رہ گئی ہیں وہ شاید جالندھر میں کسی کے کام کی نہ ہوں اگر وہ کہیں مل جائیں تو لیتی آئیے۔" مردولا بہن نے اسکی کوشش کرنے کا وعدہ کیا کچھ دیر ادھر ادھر کی باتیں کر کے وہاں سے اٹھ گئیں ذاکر صاحب نے مجھ سے پوچھا "آپ مردولا بہن کو جانتے ہیں بڑی بے پناہ عورت ہیں تریپوری کانگریس اجلاس میں وہ والنٹیر کور کی Organiser تھیں انہوں نے تب اس کام کو اس سلیقے سے کیا کہ ہر صوبے کے کانگریسی کام کرنے والوں اور لیڈروں کی تصویریں جمع کیں اور والنٹیروں کو اسکی ٹریننگ دی کہ ہر لیڈر اور کام کرنے والے کو وہ پہچان جائیں کہ کون آ رہا ہے اور کس صوبے کا ہے تاکہ انہیں کوئی دقت نہ پیش آئے۔ بڑے حسن و سلیقہ

سے یہ کام مرد مولانا ہی نے کیا تھا۔ وائنیز ڈس کو منظم اور باقاعدہ بنانے کا خوب انتظام تھا۔ بڑے عصب کی کام
کرنے والی ہیں مسلمانوں میں کوئی ایسا کام کرنے والا نہیں ہے۔ یہ غنیمت ہے کہ ایسی ضرورت ابھی تک پیش نہیں آئی۔
ضرورت ہوگی تو شاید ہم میں بھی ایسے لوگ پیدا ہو جائیں اور ہماری خواتین میں سے کوئی بھی عورتوں کو نکال کر
لانے کے لیے تیار ہو جائے۔"

سقوط حیدرآباد کے بعد عثمانیہ یونیورسٹی میں ذریعہ تعلیم پر غور کرنے کے لیے ایک کمیشن مقرر کیا گیا تھا مولانا آزاد نے
ذاکر صاحب کو اس کا چیئرمین بنایا تھا۔ ذاکر صاحب مولانا کے دفتر پہنچ گئے اور مولانا سے پوچھا آپ خود عثمانیہ
یونیورسٹی میں کیا تبدیلی چاہتے ہیں۔ ارشاد فرمائیے۔ معلوم ہوا کہ اس وقت کے حالات میں جواہر لال نہرو بھی عثمانیہ یونیورسٹی
میں ذریعہ تعلیم اردو ہونا نہیں چاہتے تھے۔ اس صورت میں کیا کیا جائے یہ سوال تھا۔ مولانا آزاد کی رائے اور ذاکر
صاحب کا بھی یہ خیال تھا کہ عثمانیہ یونیورسٹی میں ذریعہ تعلیم انگریزی ہو۔ انہیں بہت سی دقتیں اور آسانی بھی۔ ذاکر صاحب
کا یہ کارنامہ بھی یاد رکھے جانے کے قابل ہے کہ انہوں نے کمیشن کے ممبران کو جس میں تلگو والے بھی تھے اور ہندی والے بھی اس پر
آمادہ کرایا اور سب نے متفقہ فیصلہ کیا کہ یونیورسٹی میں ذریعہ تعلیم انگریزی ہو۔ مگر ذاکر صاحب کو اس کا افسوس تھا کہ ذریعہ تعلیم
اردو جو تیس برس سے کامیابی سے چلایا جا رہا تھا وہ ختم ہو رہا ہے۔ جس میں اور ملک کے باہر بھی اس ذریعہ تعلیم
نے بڑے وقار کا درجہ پایا تھا۔

ایک مرتبہ مولانا آزاد عالی ریل رہنے کی وجہ سے دردھا گئے تھے اور شہر کی جامع مسجد میں مقیم تھے۔
انہی دنوں ذاکر صاحب بھی دردھا تشریف لائے تھے ذاکر صاحب نے بغیر ملے ہی آر لو سحانی صاحب سے
جامع مسجد میں جاکر ملنے کا فیصلہ کیا میں نے کہیں ان سے پوچھ لیا کہ "مولانا آزاد سحانی کو بھی کھانے پر مدعو کر لوں" ذاکر صاحب
نے کہا۔ نہیں نہیں آپ مولانا کو جانتے نہیں اگر وہ یہاں کھانے کے لیے آئیں تو کھانے میں یہ پاس نقص نکالیں گے
اس طرح کہ آپ بدمزہ ہو جائیں گے مولانا کو بلانا مناسب نہیں میں آپ کے خیال سے کہہ رہا ہوں آپ کو اس سے
تکلیف ہوگی اور مولانا کو بلا کر آپ بدمزہ ہو جائیں گے۔" طیب صاحب جو ذاکر صاحب کے ہمراہ تھے انہوں نے اس پر صاد کیا۔

ایک مرتبہ اردو زبان کا ذکر ہو رہا تھا اور لوگ بھی تھے بات چلتے چلتے روس تک پہنچی۔ ذاکر صاحب نے کہا
روس نے اپنی صوبائی زبانوں کو اجازت دیدی ہے کہ وہ اپنے صوبہ کی زبانیں استعمال کریں لیکن رسم الخط روسی
ہو۔ اپنی اپنی زبانوں میں ہر صوبہ والا روس کے نظام حکومت کی تعریف کرے۔ ہندی والے بھی یہی بات چاہتے ہیں کہ اردو
کا رسم الخط بدل دیا جائے۔ رسم الخط بدلنے سے زبان کی خصوصیات ختم ہو جائیں گی۔ اور زبان کا اصلی حسن و خوبی بھی

نہیں رہے گی یہ ہوگا رسم الخط ملنے کا نتیجہ جیسا کہ روس میں ہو رہا ہے

ذلو ماتی بھوی داس کے لیے ہندوستان کے دورے میں علی گڑھ بھی گئے تھے مسلم یونیورسٹی میں بھی انہیں
بلایا گیا تھا ذاکر صاحب نے ان کا استقبال کرتے ہوئے ایک تقریر کی تھی تقریر کیا تھی مسلمانانِ ہند کی دل کی دھڑکن تھا
اور انکے ارمانوں اور ہندوستانی قومیت کا ایک صحیح تصور تھا۔ تقریر اخبارات میں بھی شائع ہوئی تھی یہ آواز بھی جو اتنی
صاف صاف، واضح اور سرکاری کسی ذمہ دار رہنما کو سنائی گئی تھی۔ بہت پر خلوص اور ایمان اور وجدان سے پہلے بھی ذاکر صاحب نے
اسی طرح کی بات کاشی ودیا پیٹھ کے تقسیم اسناد کے جلسے میں کی تھی اور ہندوستان میں مسلم قوم کا موقف، حالات
اور زندگی کے بارے میں یہ کہا تھا:

گرچہ مثلِ غنچہ دلگیریم ما ـــــــ گلستاں میرد اگر میریم ما

ذاکر صاحب قومیت اور قوم پرستی کا صحیح اور سچا تصور رکھتے تھے۔ ہندوستانی تہذیب اور اس کے
مضمرات کو جانتے تھے اور اسکے علمبردار تھے۔ وہ ہندو مسلم سب فرقوں میں اتحاد، رواداری، بھائی چارہ اور
ماضی کے کارناموں پہ فخر کرنے کا عملی پرچار کرتے تھے۔ اس تقریر کو اخبارات میں پڑھکر بہار مسلم ایجوکیشنل کانفرنس
والوں نے ارادہ کیا کہ کانفرنس کا اجلاس بہار میں ہو جسکی صدارت کی تکلیف ذاکر صاحب کو دی جائے کیونکہ آزادی
کے بعد سے تعلیمی مسائل اس صوبہ میں پیدا ہوگئے تھے مجھے ذاکر صاحب سے درخواست کرنے کے لیے دلی
بھیجا گیا۔ ذاکر صاحب نے اسے منظور کر لیا۔ سب تیاریاں مکمل ہو چکی تھیں لیکن عین وقت پر اپنی علالت کے
سبب ذاکر صاحب نہ آسکے انہوں نے حبیب الرحمٰن صاحب پرنسپل ٹیچرس کالج علی گڑھ کو اپنی جگہ بھجوایا تھا۔

۱۹۴۹ء میں بنیادی تعلیم کی کانفرنس صوبہ بہار کے ایک گاؤں بکرم میں ہوئی تھی جسکے ذاکر صاحب
صدر تھے کانفرنس کی صبح ذاکر صاحب نے ترنگا جھنڈا لہرایا تھا اور کہا تھا کہ جب میں یہ جھنڈا لہراتا ہوں تو لرزنے
جاتا ہوں اس جھنڈے کو جب ہم نے لہرایا تھا تو کہا تھا کہ اس کا سایہ ہوگا جو اس جھنڈے کے نیچے آئیگا وہ
محفوظ اور مامون رہیگا۔ لیکن ہم نے ایسا نہیں کیا اس جھنڈے کو لیکر ہم نے قتل و غارتگری کی اور خون کی ندیاں
بہائیں۔ ہم بنیادی تعلیم کا کام کرنے والے ملک کو یہ بتانا چاہتے ہیں کہ اس جھنڈے کو لیکر ہم امن و شانتی کا
پرچار کرنا چاہتے ہیں ملک کے سب لوگوں کو آپس میں ملانا چاہتے ہیں۔ ٹوٹے ہوئے دلوں کو جوڑنے کا کام کرینگے۔
بچھڑے ہوئے مل جائیں اور ٹوٹے ہوئے دل مل جائیں تب ہی بنیادی تعلیم کو کامیاب کہا جاسکے گا۔ ورنہ بنیادی
تعلیم اور اسکولوں کی دوسری تعلیم میں کوئی فرق نہ رہیگا۔"

دس بجے بنیادی تعلیم کی کانفرنس کا اجلاس ہوا۔ راجندر بابو بھی تشریف لائے تھے۔ ذاکر صاحب کا خطبۂ صدارت بڑے معرکہ کا تھا۔ "انسے تنے جملے بولنے کا انداز والہانہ اور بے ساختہ گاندھی جی کی صفات بھی گنائی تھیں اور کہا تھا، "وہ جس کو بھی چھو دیتے تھے، اس کو بھی سونا بنا دیتے تھے۔ کئی لوگوں کی انہوں نے زندگیاں سنواریں اور انہیں سونا بنا دیا۔" تقریر کے جوش میں وہ بہا تھا، بعض جملے اور الفاظ چھوٹ گئے تھے، پھر سیدین صاحب نے سیاق و سباق دیکھ کر اور ذاکر صاحب سے پوچھ کر اسے مکمل کیا تھا کہ یہ تقریر ہندوستانی تعلیمی سنگھ کے رسالہ بنیادی تعلیم میں چھپ سکے۔ تقریر بہت دلنشیں تھی۔ ذاکر صاحب نے یہ بھی کہا تھا "حکومت کو تعلیم دلانے کا انتظام ایسا کرنا چاہیے جیسا کہ لوگ والدین چاہتے ہیں ورنہ حکومت کو یہ نوید ہو کہ وہ زیادہ دن تک عوام پر حکومت نہیں کر سکے گی۔ اور اوپر سے لادی ہوئی ایسی تعلیمی پالیسی نہیں چلا سکے گی۔" بنیادی تعلیم کی مخالفت سرکاری حلقوں میں افسران حکومت Bureaucrats کر رہے تھے۔ وہ نہیں چاہتے تھے کہ ہاتھ کے کام پر مبنی تعلیم رائج کی جائے۔ وہ یہ نہیں سمجھتے تھے کہ بنیادی تعلیم کا مطلب یہ ہے کہ بچے کو بنیادی طور پر ایسی تعلیم دی جائے جیسا کہ ہر شہری کے لئے ضروری ہے۔ مادری زبان کے ذریعہ تعلیم ہو۔ اسکی مدت سات سال ہو اور ہندوستانی قوم میں ایسی قومیت کے جذبات پیدا ہوں اور ہر مذہب والے ایک دوسرے کی قدر کرنا سیکھیں۔

اس کانفرنس کے بعد ہم دہلی سے ذاکر صاحب یوسکو کے جلسہ کے لیے جا رہے تھے۔ ذاکر صاحب بکرم آباد سٹیشن پر اپنا اسباب بھول کر چھوڑ آئے تھے۔ یہ خیال تھا کہ شاید کسی دوسرے ڈبے میں انکا سامان اٹھا لیا ہوگا، صرف ایک بیگ انکے ہاتھ میں تھا۔ بکرم پہنچنے پر انہیں معلوم ہوا کہ اسباب ساتھ نہیں۔ بکرم ہٹ سے تقریباً ۱۵ میل تھا۔ اسباب کی تلاش شروع ہوئی۔ ذاکر صاحب کے اس بکس میں یوسکو جانے کے لیے ہوائی جہاز کا ٹکٹ تھا اور اخراجات کے لیے پیسے بھی۔ تلاش کے بعد بکس مل گیا۔ جب بکس آیا تو ذاکر صاحب نے کہا "ذرا کھول کر دیکھ لیجیے میرا ٹکٹ اور پیسے اسمیں ہیں یا نہیں"۔ بکس کے قفل لگے ہوئے تھے جو معمولی تھے، کھول کر دیکھا تو ٹکٹ اور روپیے محفوظ تھے۔

ذاکر صاحب ایک مرتبہ سعودی حکومت کے بلانے پر یورپ سے واپسی پر حجاز گئے۔ وہاں انہوں نے عمرہ ادا کیا۔ معلم انہیں عربی زبان کی دعائیں پڑھا رہا تھا۔ ذاکر حسین صاحب نے انہیں روک کر کہا کہ "مجھے اپنی زبان میں بھی خدا سے کچھ دعائیں مانگنے دیجیے۔ عمرہ کا پورا حق میں ادا کر دوں۔ خدا سے اپنی زبان میں کچھ کہہ کر میری تسکین ہو جائے گی۔" اور ایک بات انہوں نے کہی تھی کہ وہ روایتی اونٹ جسکا ذکر ہم سنتے تھے عرب میں کہیں نظر نہ آیا

اسکے بجائے کیڈلک اور رولس رائس نظر آتی ہیں۔"

ذاکر صاحب شیخ الجامعہ کے عہدہ سے علی گڑھ کے وائس چانسلر پھر بہار کے گورنر اور اسکے بعد نائب صدر و صدر مملکت ہے۔ جتنے جتنے ان کے اعزاز اور عہدے بڑھے اتنا ہی انکے مزاج میں عجز اور انکسار آتا گیا۔ ذاکر صاحب وہی ذاکر صاحب رہے جو جامعہ میں تھے انکے ملنے جلنے کے انداز میں کوئی فرق اور تبدیلی نہیں آئی۔ ان کی اصلی صفات اور اجاگر ہوتی گئیں۔ انکی دلکش گفتار اور دلکش ہوتی گئی۔ انکی شخصیت کی بلندی بلند تر ہوتی گئی۔ وہ جامعہ کے سردار تھے ان کے ساتھ کام کرنے والوں نے انہیں سردار ہی مانا تھا بڑھتے بڑھتے وہ قوم کے بھی سردار بن گئے اندرا جی نے سچ ہی کہا تھا کہ انکے صدارت کا عہدہ سنبھالنے سے اس عہدہ کی زیب و زینت بڑھی ہے۔ وہ بہت بڑے انسان تھے انکی پرکشش شخصیت زندگی کی چھوٹی چھوٹی باتوں کو بھی جب وہ بیان کرتے تو ان باتوں کو دلفریب بنا دیتی تھی انکی طبیعت کی گہرائی اور مزاج کی گہرائی ہر معاملہ کے ہر پہلو تک پہنچ جاتی تھی۔ ان کے کاموں میں بلند ہمتی ارادوں میں تہذیب اور شرافت تھی۔ کام کو حسن و خوبی اور سلیقہ سے کرنے کا ڈھنگ پوری طرح جانتے تھے جیسے جیسے ان کے عہدے اور اعزاز بڑھتے گئے ویسے ہی انکے دائرے بھی وسیع تر ہوتے گئے۔ اور ذاکر صاحب نے قوم کی خدمت کرنے کا ان ذریعوں سے کام لیا۔

ہندوستان میں حکومت کی مدد سے سب اعلیٰ پیمانہ پر جشنِ غالب منایا گیا تھا۔ یہ ذاکر صاحب ہی کے طفیل ہوا کہ اردو کے ایک شاعر کی یاد حکومت نے ساری ملک کے ہر صوبہ اور ہر زبان میں یہ جشن منایا گیا۔ یہ بھی ذاکر صاحب کا کارنامہ ہی سمجھنا چاہیئے کہ غالب کی عظمت کو ہندوستان نے پہچانا۔ جشنِ غالب کے بعد غالب کی قدر اردو اور ہندی جاننے والوں کے علاوہ اور زبانوں کے بولنے والوں میں بھی ہو رہی ہے اور یہ بھی ہے کہ اردو غزل سننے کا شوق بھی مسلمانوں کے علاوہ ہندوستان کے دوسری زبانیں بولنے والوں میں بھی پیدا ہوا ہے۔ یہ سب جشنِ غالب کا فیض ہے۔

ذاکر صاحب نے Cxford History of English Literature کی طرز پر "علی گڑھ ہسٹری آف اردو لٹریچر لکھوانے کے لیے علی گڑھ یونیورسٹی کو مالی امداد بھی دلوائی تھی اپنے اثر اور رسوخ سے۔

علی گڑھ یونیورسٹی کی وائس چانسلری کے بعد ذاکر صاحب صوبہ بہار کے گورنر بنائے گئے۔ یہ صوبہ اہالیانِ حکومت کی ذاتی عداوتوں اور مناقشوں سے ملوث تھا۔ ذاکر صاحب نے پانچ سال تک اس صوبہ کی گورنری اس شان اور کامیابی سے کی کہ پارٹی بازی کا ایک بھی جھگڑا ابھر کر سامنے نہیں آیا۔ ذاکر صاحب کی شخصیت ہی ایسی تھی کہ

صوبہ بہار کے سارے جھگڑے دبے رہے۔ وہ جب صوبہ بہار سے رخصت ہوئے تو لوگوں نے بڑے اعزاز اور بھرے دل کے ساتھ انہیں رخصت کیا۔ ستیہ نرائن سنہا صاحب دلی تک ذاکر صاحب کو چھوڑنے آئے

ذاکر صاحب کو آرٹ سے بھی بہت لگاؤ تھا ان کے پاس یورپی مصوروں اور ہندوستانی مصوروں کے شاہکار جمع تھے۔ اوکھلا میں انہوں نے جامعہ کے ڈرائنگ ہال میں جرمن مصوروں اور ہندوستانی مصوروں کی تصاویر لگوائی تھیں جو ان کے جمالیاتی ذوق کا مظہر تھیں یہ تصاویر وہ اپنے ساتھ جامعہ آنیوالوں کو دکھایا کرتے تھے ——— ایک مرتبہ جب وہ بہار کے گورنر تھے اپنے پرائیوٹ سکریٹری مسٹر پاٹھک کو ساتھ لیکر جامعہ آئے اور ایک ایک تصویر کے پاس کھڑے ہوکر انہیں بتایا کہ اس تصویر میں کیا کیا خوبی ہے۔ "بچوں میں ذوق لطیف پیدا ہو اس واسطے یہ تصویریں میں نے یہاں لگوائی ہیں۔"

ذاکر صاحب کو پھولوں اور پودوں سے بہت شغف تھا خصوصاً گلکش سے۔ جامعہ کی کرایہ کی عمارتوں میں بھی انہوں نے پھول اور پودے لگوائے تھے علی گڈھ کیمپس کی جیتل اور باؤنڈریوں کو پھول اور پودوں سے سجا دیا تھا اور یونیورسٹی کیمپس کو گلزار سا دیا تھا ہر طرف پھول ہی پھول۔ ان کی دلی یونیورسٹی کیمپس رنگ اور خوشبو سے بھر گیا تھا اس سے ذاکر صاحب کے ذوق لطیف اور حسن مذاق کا خوب اظہار ہوتا ہے اوکھلا میں جامعہ کی نئی عمارات میں بھی یہی ذوق پھول اور پودوں کا نہایت عمدہ طریقہ سے نمایاں ہے ان کے ساری گورنری کے بہار ہی کی بات ہے کہ ہندوستانی تعلیمی سنگھ کی مدد سے آرٹس کے استاد دیوی پرشاد جی نے بچوں کے آرٹ کے بارے میں ایک بہت اچھی کتاب لکھی۔ ذاکر صاحب ان کو دیوی بھائی کہہ کر پکارتے تھے کتاب ہندی زبان میں تھی۔ دیوی بھائی چاہتے تھے کہ ذاکر صاحب سے اس کتاب کا تعارف لکھوائیں۔ انہیں مسودہ کتاب کا بھیجا ذاکر صاحب نے دیوی پرشاد جی کو بیٹھا لیا اور تین چار دن اپنا مہمان رکھا ان سے پوری کتاب سنی اور پھر فورورڈ لکھا اس فورورڈ میں ذاکر صاحب نے لکھا ہے: "دیوی بھائی کی کتاب کسی تعارف کی محتاج نہیں۔ دیوی بھائی نے بچوں کے آرٹ کے بارے میں بہت اچھی باتیں لکھی ہیں۔ اچھی کتاب کے لیے کسی تعارف کی ضرورت نہیں۔ اچھی کتاب خود اپنا تعارف ہے۔ مجھ سے دیوی بھائی نے اس کتاب کا تعارف لکھوایا ہے۔ دیوی بھائی بڑے آرٹسٹ ہیں بڑے آدمیوں کے ساتھ اپنے نام کو جوڑ لینے سے آدمی خود بڑا ہو جاتا ہے اور بڑا ہی محسوس کرتا ہے میں ان کے نام کے ساتھ اپنا بھی نام ٹانک (جوڑ) لیتا ہوں" یہ تھے ذاکر صاحب جنہوں نے اپنے ایک ماتحت کی اس قدر عزت افزائی کی۔ ذاکر صاحب تعلیمی سنگھ کے صدر تھے اور دیوی بھائی بنیادی مدرسہ کے استاد۔ ایسی بات کسی افسر نے اپنے ماتحت کے متعلق شاید ہی کبھی کہی ہو۔

بہار کی گورنری کے زمانہ میں ذاکر صاحب نے خدا بخش لائبریری کی از سر نو تنظیم کرائی اور لائبریری کو مرکز کا ایک ادارہ بنایا اور حکومت سے منظور کرایا ۔ یہ بہت بڑی خدمات ہوئی وہیں انہوں نے شاد عظیم آبادی کے کلام کو جو مسودہ کی صورت میں تھا خود اپنے قلم سے نقل کیا، شاد کی تحریر دن کو طبع کرایا ۔

اکتوبر سن ۱۹۴۶ء میں جامعہ کے ۲۵ سال پورے ہوئے سلور جوبلی منائی گئی جس وسیع پیمانہ پر جوبلی کے انتظامات کیے گئے تھے وہ قابل دید تھے۔ نواب صاحب بھوپال نے جوبلی کے جلسہ کی صدارت کی تھی چار دن یہ جشن رہا۔ جوبلی کے جلسہ میں جو ۲۹ اکتوبر کو ہوا ڈائس پر ایک طرف مولانا آزاد، جواہر لال نہرو، راج گوپال اچاری، آصف علی، کلثوم سیانی اور دوسرے کانگریسی اصحاب تھے درمیاں میں نواب بھوپال اور دوسری طرف قائد اعظم جناح، نواب زادہ لیاقت علی خاں، سر عبدالقادر، غضنفر علی خاں، فاطمہ جناح، بیگم اکرام اللہ اور مسلم لیگ کے دوسرے اراکین تھے۔ اور پیچھے کرسیوں میں یونیورسٹیوں کے چانسلرس علی گڈھ یونیورسٹی کا وفد، لکھنؤ یونیورسٹی کا وفد، عثمانیہ یونیورسٹی کا وفد، نذیر حسین زیدی، قدسیہ زیدی اور سید حسین وغیرہ تھے۔ اور شاعروں میں جوش ملیح آبادی روش صدیقی وغیرہ موجود تھے۔ ایسا سماں نہ کبھی پہلے دو سال میں دیکھا گیا اور نہ آئندہ دیکھا جائیگا۔ مسلم لیگ اور کانگرس دونوں کا ذاکر صاحب پر بھروسہ اور اعتماد تھا دونوں انکے کاموں کی قدر اور عزت کرتے تھے۔ جمیل مظہری نے ایک نظم پڑھی تھی اسکا ایک شعر مجھے اس وقت یاد آرہا ہے

وہ ذاکر جو مرقع تھا کبھی حسن جوانی کا ۔۔۔ سبب کیا ہے ذرا اس سے تو پوچھو ناتوانی کا

ذاکر صاحب نے ۲۵ سال کی رپورٹ پڑھی تھی کہ کس طرح جامعہ والوں نے اپنا خون پسینہ ایک کرکے جامعہ کی آبیاری کی ہے۔ انہوں نے مولانا محمود الحسن مرحوم کو اور مولانا محمد علی مرحوم کو زبردست خراج عقیدت پیش کیا تھا اور مولانا محمد علی کے متعلق کہا وہ دیوانوں میں فرزانہ اور فرزانوں میں دیوانہ تھا۔ اور اس سے ہم نے بہت کچھ سیکھا ہے۔ بہت سے پیغامات پڑھے گئے۔ جناح صاحب نے بھی تقریر کی اور جامعہ کو اپنا خراج عقیدت پیش کیا۔ وہ منظر بھی دیکھنے کے قابل تھا جب ذاکر صاحب کے ہر ہر جملہ کی داد ایسے دی جا رہی تھی جیسی شعر کی داد دی جاتی ہے سامعین سر دھن رہے تھے۔ تقریر میں جوش اور ستائش حالات پورے عروج پر تھی۔ جامعہ کی بے سروسامانی کا نقشہ کھینچا تھا جامعہ میں کام کرنے والوں کی خدمات گنائی تھیں اور پھر قوم سے کانگرس اور مسلم لیگ دونوں سے اپیل کی تھی ملک میں فرقہ واریت کی آگ بھڑک رہی ہے یہ نہ سوچیے کہ آگ کس نے لگائی یہ سب کو جلا کر راکھ کر دیگی ایسے میں تعلیمی کام کرنے والوں کو محبت کا پیغام دینا چاہتے ہیں انکا کام دیوانگی معلوم ہوتا ہے کہ وہ

کیسے کام کریں۔ لوگوں کے تعلقات کو کیسے سمجھائیں اور محنت کی فضا قوم میں کیسے پیدا کریں۔ خدارا سر جوڑ کر بیٹھیے اور قوم و ملک کو بچائیے۔"

ذاکر صاحب کو پتھر جمع کرنے کا بہت شوق تھا۔ ان کے جمع کیے ہوئے پتھر اوکھلا میں ذاکر میموریل ہال میں اب بھی رکھے ہیں جو مختلف ملکوں کے لوگوں نے انہیں پیش کیے تھے۔ آخری مرتبہ مجھے ذاکر صاحب سے ملاقات کا شرف سکندرآباد (دکن) میں حاصل ہوا جہاں ذاکر صاحب دستور کے مطابق بحیثیت صدر جمہوریہ آکر ٹھہرے ہوئے تھے۔ ذاکر صاحب نے مجھ سے کہا "سنا ہے آپ کے علاقے میں کچھ پتھر ملتے ہیں، جلد کچھ میرے لیے بھجوائیے۔" ذاکر صاحب پتھروں کے بارے میں کہا کرتے تھے کہ "پتھر کسی کو دھوکا نہیں دیتے جیسے وہ ہوتے ہیں ویسے ہی اپنے آپ کو پیش کرتے ہیں۔ پتھروں سے کوئی دھوکا نہیں کھا سکتا اور وہ زمین کی تاریخ بھی بتاتے ہیں کہ زمین کے اندر ان پر کیا کیا گذری۔" میں نے پتھر جمع کیے ان میں ایک گاؤں گرڑ Girad کے فوصل بھی تھے۔ چھالیہ، ناریل، گیہوں اور چاول، بادام، کھجور کے Foss.l یہ Fossil گرڑ میں ایک ہی کھیت میں ملتے ہیں۔ ان فوصل کا ذکر Imper.al Gazetteer of .ndia اور وردھا ضلع کے Fossil میں بھی ہے کہ یہ کیسے سے ان کے علاوہ اور بھی کئی پتھر جمع کیے، رنگ برنگ کے، سبز و سرخ، کسی میں سے تاروں کی ایک تہ گذری تھی اور کسی میں اور دھات کی۔ شاید ان پتھروں میں سے ہزاروں سال پہلے لاوا گذرا تھا۔ عجیب و غریب پتھر تھے۔ یوں سطح پر کچھ معلوم نہیں ہوتا تھا لیکن توڑ کر دیکھیے پر سب چیزیں عیاں ہوتی تھیں۔ میں نے کوئی آدھا تھیلا ایسے پتھر اور Fossil جمع کیے تھے ان کو صاف کیا، گرد و غبار نکالا تھا۔ انہیں مختلف ڈبوں میں رکھا تھا تاکہ ذاکر صاحب کو بھیجوں۔ لیکن اسی تیاری میں تھا کہ ذاکر صاحب اللہ کو پیارے ہو گئے، اور پتھر نذر کرنے کی حسرت دل میں لیکر رہ گیا۔ میں نے دلی جا کر ان کی آخری رسومات اور جنازہ میں شرکت کی۔ ذاکر صاحب وہیں سے ایوان صدر تک گئے تھے اور ایوان صدر سے جامعہ واپس گئے، وہیں ان کا مقبرہ ہے۔

غالباً آنند نارائن ملا نے ذاکر صاحب کی موت پر اپنے تاثرات کا اظہار کیا تھا۔ مقطع کا ایک مصرعہ تھا

ع دفن ہو جائے نہ خوشبو بھی کہیں پھول کے ساتھ

ذاکر صاحب تو دفن ہو گئے مگر خوشبو باقی ہے اور مقبرہ کے پاس ہی گلاب کا بڑا تختہ ہے۔

ایک مرتبہ گورنر صاحب نے سینٹ زیویرس کالج رانچی کی سالانہ تقریب کو زینت بخشی۔ وہاں کا طالب علم
ہونے کے ناتے میں بھی اس موقع پر حاضر تھا۔ یسوعی راہبوں (Jesuit father) نے ذاکر صاحب کا بڑی گرم جوشی سے
استقبال کیا۔ اس کے بعد میں نے ایک فادر کو ذاکر صاحب سے جرمن زبان میں گفتگو کرتے دیکھا اور یہ بھی دیکھا کہ گورنر
موصوف جرمنی زبان بڑی روانی سے بول رہے تھے۔ انہوں نے بڑے ماہرانہ اور عالمانہ انداز میں گفتگو کی۔
میں متجسس ہو کر تقریب کے اختتام پر اس فادر کے پاس گیا اور دریافت کیا کہ جرمن زبان سے گورنر صاحب
کی واقفیت کیسی ہے۔ مجھے سب تعجب ہوا جب فادر نے جواب دیا کہ "سب عمدہ" وہ اس انداز سے بولے گویا
ان کی مادری زبان ہو۔ بے شک یہ ایک بڑا خراج عقیدت ہے۔

ڈاکٹر ذاکر حسین بڑی عظیم شخصیت کے حامل تھے۔ ان کی شخصیت میں مشرق و مغرب کا بہترین امتزاج تھا۔
ہندوستان ان پر فخر کرنے میں حق بجانب ہے۔

●●

سے باز آتے۔ ڈاکٹر صاحب سے اپنی ملاقاتوں کے تذکرہ کے علاوہ دو اہم واقعات کا ذکر بھی یہاں ضروری سمجھتا ہوں جس سے ڈاکٹر صاحب کی زندگی کے دو اہم پہلو سامنے آتے ہیں۔

ڈاکٹر صاحب کو طلباء کی صحت کا بہت خیال رہتا تھا اور حفظانِ صحت کے اصولوں کے مطابق انہیں خود جو تجربہ ہوتا تھا وہ چاہتے تھے کہ طلباء بھی اس تجربے سے مستفید ہوں چنانچہ ایک زمانہ میں ڈاکٹر صاحب کو سبزیاں کھانے کی رغبت زیادہ ہوئی اور اس سے انہیں فائدہ بھی تو انہوں نے طلباء کو بھی تلقین فرمائی کہ وہ اپنی غذا میں سبزیاں زیادہ استعمال کریں اور پھر ہدایت جاری فرمائی کہ ہوسٹلوں میں دونوں وقت ناکم ازکم ایک وقت طلباء کو گوشت کے بجائے ابلی ہوئی سبزیاں دی جائیں چنانچہ ایک عرصہ تک ہوسٹلوں میں طلبا کو ایک وقت ابلی ہوئی سبزیاں کھانے کو ملتی رہیں اور اس غذائی تبدیلی سے طلباء کو جسمانی و دماغی دونوں قسم کے فوائد حاصل ہوتے اسلئے کہ اس زمانہ میں سبزیاں سستی بکتی تھیں۔

پروفیسر سعید احمد اکبرآبادی (مرحوم)

سابق صدر شعبہ دینیات، علیگڑھ مسلم یونیورسٹی
سابق ایڈیٹر "برہان" دہلی

جب ذاکر صاحب بہار کے گورنر ہوکر پٹنہ آئے، میں اس زمانے میں کلکتہ مدرسہ کا پرنسپل تھا۔ اس زمانے میں ذاکر صاحب نے دو باتیں ایسی کیں جو مجھ کو ابھی تک یاد ہیں اور ان کا میرے اوپر بڑا اثر ہے۔ ایک بار ذاکر صاحب گورنمنٹ ہاؤس میں ٹھہرے ہوئے تھے وہاں مس پدمجا نائیڈو (جو اس زمانے میں مغربی بنگال کی گورنر تھیں) نے ذاکر صاحب سے کہا کہ ہمارے کلکتہ مدرسہ کے پرنسپل اکبرآبادی صاحب مدرسہ چھوڑ کر جا رہے ہیں، ہم کو مجھے بڑا افسوس ہے کیونکہ ان کے بعد ہمارا مدرسہ تباہ ہو جائیگا، لہذا آپ اکبرآبادی صاحب کو روکیے۔ ذاکر صاحب نے مجھے بلایا اور کہا کہ گورنر صاحبہ یہ کہتی ہیں کہ آپ کے جانے کے بعد ہمارا انسٹی ٹیوشن تباہ ہو جائے گا لہذا آپ رہ جائیے۔ تو میں نے معذرت کی اور کہا کہ میں تو جانے پر مجبور ہوں کیونکہ وعدہ کر چکا ہوں۔ انہوں نے کہا خیر جب آپ کمٹمنٹ کر چکے ہیں تو میں کیا کر سکتا ہوں لیکن اپنی قائم مقامی کے لیے کوئی ایسا آدمی دیجیے جو آپ کے نزدیک قابل اعتماد ہو۔ تو میں نے ایک صاحب کا نام تجویز کر دیا جس کی باقاعدہ کاروائی پبلک سروس کمیشن کے ذریعہ ہوئی۔

میں نے انھیں ایک بار خط لکھا جب وہ بہار کے گورنر تھے کہ میں اب علی گڑھ جا رہا ہوں اور مجھ کو افسوس ہے کہ میں علی گڑھ اس وقت جا رہا ہوں جب آپ یہیں ہیں تو اس پر ذاکر صاحب نے ایک پوسٹ کارڈ لکھا کہ مجھے بڑی خوشی ہے کہ آپ علی گڑھ جا رہے ہیں مگر افسوس اس کا ہے کہ اس وقت جا رہے ہیں جب میں یہیں ہوں اور اس پر یہ شعر لکھا۔

اُگ رہا ہے در و دیوار پہ سبزہ غالب ہم بیاباں میں ہیں اور گھر میں بہار آئی ہے

اللہ اکبر! کس قدر شریف آدمی تھے اور باوضع۔

یہ خوشی کی بات ہے کہ رحم صاحب نے کتاب چھاپی ہے "تذکرہ ذاکر" اس میں میرا بھی ایک مضمون ہے۔ ذاکر صاحب میں ایک جذبۂ تشکر پیدا ہوا کہ میرے لیے جو کتاب تیار ہوئی ہے اس میں اکبرآبادی صاحب نے بھی حصہ لیا ہے۔ اس کا اندازہ

کچھ بعد میں ہوا جب میں ان سے پہلے راشٹرپتی بھون گیا ہمارے ساتھ پروفیسر خلیق احمد نظامی، اسلوب احمد
انصاری اور ملک رام وغیرہ بھی تھے۔ اس ملاقات کے تقریباً ایک سال بعد ذاکر صاحب کا خط آیا۔ انہوں نے لکھا کہ
مجھے اظہار تشکر میں تاخیر اسلئے ہوئی کہ میں نے اب تک آپ کا مضمون نہیں پڑھا تھا۔ میرا جی چاہتا تھا پہلے پڑھ لوں
پھر لکھوں۔ ایک صاحب میرے پاس سے وہ کتاب اٹھا لے گئے اور انہوں نے بہت دیر میں واپس کی اور مجھے شرم آتی
تقاضا کرتے ہوئے۔ جب صاحب وہ کتاب لائے تو میں نے پڑھنا شروع کیا۔ میں نے آپ کا مضمون پڑھا اور اب میں انتہائی
مسرت کے ساتھ اپنے جذبات تشکر آپ کے سامنے پیش کرتا ہوں۔ شکر گزار ہوں کہ آپ نے بڑا اچھا مضمون لکھا

تقسیم کے بعد مولانا ابوالکلام آزاد نے ہم کو ایک مرتبہ لنچ پر بلایا۔ میں تو سب کا خورد تھا، عمر میں بھی کم۔
لیکن بہرحال ان لوگوں کے ساتھ لگا ہوا تھا۔ اس لنچ پر مولانا حفظ الرحمٰن صاحب، مولانا کفایت اللہ، مولانا احمد سعید،
مولانا حبیب الرحمٰن لدھیانوی، ڈاکٹر ذاکر حسین، شفیق الرحمٰن قدوائی، یہ سب لوگ موجود تھے۔ کھانا ہوا۔ کھانے کے بعد کچھ
باتیں ہوئیں کہ کیا کیا جائے۔ یہ ۱۹۴۸ء کی بات ہے، یعنی پارٹیشن کے بالکل قریب۔ ذاکر صاحب نے کہا کہ مولانا!
اب تو ایک سیکولر گورنمنٹ یہاں قائم ہو گئی ہے تو اب تو تعلیمی اداروں کے ساتھ فرقہ وارانہ نام لگے ہوئے ہیں یہ چلے گی
بات؟ جیسے علی گڑھ مسلم یونیورسٹی تو کیا مسلم کا لفظ رہے گا؟ بنارس ہندو یونیورسٹی، یہ ہندو کا لفظ رہے گا؟ یہ تو نہیں
رہنا چاہیے۔ وہ تو سیکولر گورنمنٹ ہو گی۔ ذاکر صاحب کی اس بات پر مولانا آزاد کچھ خاموش سے ہو گئے۔ انہوں نے کوئی
جواب نہیں دیا۔ میں نے انہیں خاموش دیکھ کر عرض کیا کہ ڈاکٹر ذاکر صاحب اور شفیق الرحمٰن قدوائی صاحب، یہ دونوں گواہ
ہیں اس بات کے کہ جامعہ ملیہ کی جب مالی حالت خراب ہو گئی تو اس پر غور و خوض کرنے کے لیے ڈاکٹر انصاری صاحب کی
کوٹھی پر دریا گنج میں ایک اجتماع ہوا۔ مہاتما گاندھی، سیٹھ جمنا لال بجاج (جو اس زمانے میں کانگریس کے ٹریژرار تھے) ڈاکٹر
ذاکر حسین، حکیم اجمل خاں اور شفیق الرحمٰن قدوائی یہ سب موجود تھے۔ اور اس پر گفتگو ہو رہی تھی کہ جامعہ کی مالی حالت بڑی
خراب ہے اب کیا کریں؟ اسے بند کریں یا جاری رکھیں۔ اس پر سیٹھ جمنا لال بجاج نے حکیم اجمل خاں کو خطاب کرتے
ہوئے یہ کہا کہ حکیم صاحب! اگر آپ اس سے اسلامیہ کا لفظ نکال دیں تو میں آپ کو ہندوؤں سے لاکھوں روپے لا کر
دے سکتا ہوں، اور جب تک یہ اسلامیہ کا لفظ رہے گا میں ہندوؤں سے روپیہ نہیں لا سکتا۔ اس پر گاندھی جی اٹھ کے
بیٹھ گئے اور کہنے لگے کہ بجاج! تم کیا کہتے ہو؟ جامعہ سے جب اسلامیہ کا نام ہٹا لیا جائے تب تم ہندوؤں سے روپیہ لا سکتے
ہو؟ ورنہ نہیں؟ حکیم جی! میں نے تو یہ لفظ خود رکھوایا ہے اور ایسا میں نے اسلئے کیا کہ اسلام کی تہذیب ایک بہت بڑی تہذیب

ہے اور وہ کچھ ایسا ہے کہ تمام انسانوں کا اس پر حق ہے۔ اس میں ہندوؤں کا بھی حق ہے اور عیسائیوں کا بھی۔ یہ تو دنیا کا ایک
بہت بڑا کلچرل سورس ہے۔ لہٰذا اس کے لیے ایک مدرسہ گاہ ایسی ہونی چاہیئے جس میں اسلامی تہذیب کی تعلیم دی جائے
پھر انہوں نے یہ بھی کہا کہ فرض کیجئے کہ میرا لڑکا دیوی داس ـــــ میں کہتا ہوں کہ اگر وہ ہندو تہذیب کی تعلیم حاصل کرنا
چاہے تو بنارس جائے، لیکن اگر اسلامی تہذیب کی تعلیمات لینا چاہے، اور لینی چاہیئے۔ تو میں کہاں بھیجوں؟ ـــ میں نے
تو خود ہی اسلامیہ کا لفظ لگوایا ہے بجا ہے! آزاد! حکیم صاحب! آپ اسکی بات رہنے دیجئے۔ میں آپ سے وعدہ کرتا ہوں کہ
اسلامیہ کا لفظ اس میں رہے گا اور میں اسی نام کے ساتھ آپ کو ہندوؤں سے لاکھوں روپے دلواؤں گا۔ چلیئے میرے
ساتھ مدراس چنانچہ مدراس کا دورہ کیا، یہ کیا، وہ کیا۔ یہ واقعہ جب میں نے سنا تو میں نے دیکھا کہ مولانا آزاد پر اس
کا بڑا اثر ہوا بات یہ ہے کہ وہ ایسے آدمی تھے کہ ان کے اندرونی جذبہ کا اظہار ان کے چہرے سے فوراً ہو جایا کرتا تھا
اور اس کے بعد انہوں نے ذاکر صاحب سے پوچھا، کیا واقعی آپ موجود تھے اس وقت؟ انہوں نے کہا جی ہاں،
میرے سامنے کی بات ہے۔ پھر شفیق الرحمٰن قدوائی سے پوچھا، قدوائی صاحب! آپ بھی موجود تھے اس وقت؟
انہوں نے کہا جی ہاں،

ذاکر صاحب کے بہت لوگوں سے تعلقات تھے، قرول باغ میں ان کی سادگی ان کی وضعداری، ان کی
مروت اور ان کا لحاظ، واقعی وہ ایک اعلیٰ اخلاق کے انسان تھے۔ قرول باغ میں جب ہم لوگوں نے لیتھو مشین کا دفتر
قائم کیا تو اس وقت یہ جامعہ ملیہ نہیں تھا اور ذاکر صاحب ایک مکان میں رہا کرتے تھے۔ عابد صاحب بھی وہاں پر رہتے
تھے اور مجیب صاحب بھی۔ سب سے شاندار مکان مجیب صاحب کا تھا۔ کیونکہ مجیب صاحب گھر کے بڑے مالدار
تھے جامعہ سے جو تنخواہ ملتی تھی، وہ تو برائے نام تھی۔ پچھتّر روپے کا عہد دیہاں کیا تھا ان تینوں نے یعنی مجیب،
ڈاکٹر عابد حسین اور ڈاکٹر ذاکر حسین۔ ان تینوں نے طے کیا تھا کہ صرف ۷۵ روپے ماہوار تنخواہ لیکر ہی ساری زندگی
DEVOTE کر دیں گے جامعہ ملیہ کی خدمت میں۔ ان میں سب سے زیادہ غریب بیچارے ذاکر صاحب تھے مگر صاحب!
میں نے اس زمانہ میں دیکھا کہ تنگ دستی کا کوئی اثر نہیں وہی بشاش بشاش اور بہت خوش، زندگی نہایت سادہ تھی۔ چونکہ
ہمارے دفتر "برہان" کے قریب ہی ان کا مکان تھا۔ تو اکثر ہم لوگ جایا کرتے تھے کبھی شام کو چلے گئے اور کبھی
اتوار کو چلے گئے۔ چائے کی پیالی دیا کرتی تھی اس میں بعض پیالیاں بے جوڑ ہوتی تھیں اور بعض پیالیاں ٹوٹی ہوتی تھیں کبھی پرچ
ٹوٹی ہوتی تھی۔ فقط چائے۔ بہت ہوا تو اس کے ساتھ بسکٹ وغیرہ دیدیئے۔ کھانا بھی گھر میں ہی پکوا سکتے تھے چونکہ

تنخواہ میں اتنی گنجائش ہی نہیں تھی تو طلباء کے پیے جو سلینے میں کھانا پکتا تھا اسی کو وہ خرید لیتے تھے اور وہی کھانا چلتا تھا۔ کمرے کے اندر ایک تخت بچھا ہوا تھا اور اس کے اوپر کھدر کی چادر۔ چونکہ صفائی ستھرائی کا انہیں بہت خیال رہتا تھا مونڈھے تھے وہ بھی ٹوٹے پھوٹے، مگر ان کے اوپر کشن وغیرہ رکھا ہوا تھا، وہ بھی کھدر کا۔ صفائی ستھرائی بہت زیادہ تھی مگر بے حد سادگی کے ساتھ۔ اس زمانے میں رکشہ، وکشہ تو کہیں تھا نہیں، یکّے تھے۔ دیکھا کہ یکّے میں بیٹھے ہوئے چلے جا رہے ہیں۔ ٹرام وے چلتی تھی ہندو راؤ کے باڑے سے لیکر فتح پوری یا جامع مسجد تک۔ تو دیکھا کہ ذاکر صاحب جامعہ ملیہ سے لیکر ہندو راؤ کے باڑے تک، جہاں سے ٹرام وے چلتی تھی، وہاں تک پیدل آتے تھے اور ہندو راؤ کے باڑے آکر ٹرام وے میں بیٹھتے تھے۔ اس زمانے میں شاید ایک آنہ کرایہ تھا اور اس طرح سے وہ جاتے تھے مگر کوئی اثر نہیں۔ معلوم ہوتا تھا ایک بہت بڑا انسان ہے جس کے سامنے ایک اعلیٰ مقصد ہے اور اس کے لیے وہ ہر قسم کی قربانیاں دے رہا ہے اس طرح میرے اوپر ان کا بڑا اثر ہے ان کے کردار کا اور میرے ساتھ تو ان کے بہت پرانے تعلقات تھے۔ میں اس وقت قرولباغ میں تھا۔ اور پھر جب میں جامع مسجد پر رہنے لگا چونکہ بچے سب وہیں چلے گئے تھے، چوڑی والاں کے محلہ میں شمسی کا گھر ہوا کرتا تھا، میں اس میں رہا کرتا تھا، معین شمسی کے ساتھ۔ معین الدین شمسی صاحب جرمنی میں پڑھے ہوئے تھے ڈاکٹر ذاکر صاحب اور ڈاکٹر عابد صاحب کے جرمنی کے دوستوں میں سے تھے۔ یہ میکنکل انجینئرنگ کے لیے گئے ہوئے تھے۔ ان کا کارخانہ SONS & J کے نام وہاں پہ ہے میرے بہت گہرے دوست ہیں جرمنی کے پڑھے ہوئے ہیں اب بھی ہیں دلّی میں۔ آپ کو ان کا ایک اور پتا بتاؤں۔ یہ جو پاکستان میں اصغر علی خاں ہیں نا، ایر مارشل اصغر خاں، وہ ان کے داماد ہوتے ہیں سید معین الدین شمسی کے۔ مولانا ابوالاعلیٰ مودودی کی شادی ان کی بھتیجی سے ہوئی ہے شمسی کا گھر کا بہت مشہور خاندان ہے ان کے والد حکیم اجمل خاں کے خاص دوستوں میں تھے۔ حکیم صاحب کی جو مجلس رات کو شروع ہوتی تھی اور بارہ ایک بجے رات تک چلتی تھی اس میں وہ بالالتزام شریک ہوتے تھے۔ سید معین الدین شمسی وہاں کے خاندانی لوگوں میں ہیں تو نہیں جناب۔ ان کے ساتھ رہا کرتا تھا شمسی کا باڑے کے اندر۔ ایک تو ہم سے تعلق، پھر معین الدین شمسی سے جرمنی کا تعلق۔ لہٰذا ذاکر صاحب نے ہم سے وعدہ کیا کہ چوڑی والاں کے محلے کی نہاری بڑی عمدہ ہوتی ہے وہاں ایک دوکان ہے جو بہت عمدہ نہاری پکاتا ہے۔ لہٰذا پوسے پیرن میں، ایک دعوت نہاری کی تمہاری طرف سے ہوگی اور ایک دعوت معین شمسی کی طرف سے۔ تو صاحب، اس طرح وہ دو دعوتیں ہمارے ساتھ کھاتے تھے اور نہاری بڑے شوق سے کھاتے تھے اسی میں وہ بیمار ہوئے چونکہ وہ کھانے میں احتیاط نہیں کرتے تھے۔

صاحب نے ہم میں سے ہر ایک سے پوچھنا شروع کیا کہ آپ اپنی تعلیم ختم کرکے کیا کریں گے۔ سب کی زبان پر تھا، "قومی خدمت" سوائے ایک صاحب کے کہ ان کا نمبر آخر میں تھا۔ ڈاکٹر صاحب نے ان کی طرف دیکھ کر کہا "اور آپ بھی قومی خدمت کریں گے۔" وہ گھبرا گئے اس کے لیے تیار نہ تھے۔ سراسیمگی میں جواب دیا، "جی نہیں میرا ارادہ سرکاری ملازمت ہے۔" اس پر ڈاکٹر صاحب نے اپنے مخصوص تبسم کے ساتھ فرمایا، "نہیں بھئی، قومی خدمت کوئی ایسی بری چیز بھی نہیں کہ آپ اس سے ایسی بیزاری کا اظہار کریں۔" اس پر ہم سب ہنس پڑے اور پھر ڈاکٹر صاحب نے بڑی لطف سے ہم سے تھوڑی دیر مختلف موضوعات پر گفتگو کی اور ہم اس احساس کے ساتھ اجازت لے کر واپس ہوئے کہ آج ہم نے ایک بڑی شخصیت کو دیکھا۔ یہ تھا میرا پہلا تاثر ڈاکٹر صاحب کو دیکھ کر اور ان کی باتیں سن کر۔

غالباً دوسری بار ۱۹۴۶ء میں جامعہ سے چند لوگ ان سے ملنے تربیتی کورس گئے تھے۔ عبدالغفار مدھولی صاحب مرحوم بھی تھے اور میں بھی۔ عبدالغفار مدھولی صاحب مرحوم سے ڈاکٹر صاحب نے جب ان کی خیر و عافیت پوچھی تو یہ بھی پوچھا کہ مدھول میں مکان تو اپنی جگہ پر ہے؟ مدھولی صاحب کے تعجب سے ظاہر ہوتا تھا کہ اس بات کو نہیں سمجھے۔ ڈاکٹر صاحب مسکرائے اور کہا "میں نے یہ بات اس لیے پوچھی کہ آج کل ہمارے ملک میں راتوں رات بستیوں کی بستیاں صاف ہو جاتی ہیں، مکانوں اور دکانوں کو جلا کر راکھ کر دیتے ہیں۔" یہ کہہ کر ڈاکٹر صاحب تھوڑی دیر کے لیے خاموش ہو گئے۔

۱۹۷۰ء۔ ۱۹۷۱ء میں جامعہ کی گولڈن جوبلی ہونے والی تھی اس موقع پر بعض کاموں اور منصوبوں کے لیے چندہ کی ضرورت تھی۔ میں مدراس اور جنوبی ہند کے دوسرے شہروں کی طرف مامور تھا۔ مدراس میں میں سیٹھ جمال کے قائم کردہ جمالیہ کالج دیکھنے اور ان کے گھر والوں سے ملنے گیا۔ یہ وہی سیٹھ جمال ہیں جنہوں نے ۱۹۲۸ء میں جب جامعہ مالی اعتبار سے بڑے سخت مرحلوں سے گزر رہی تھی اور حکیم اجمل خاں اور ڈاکٹر صاحب مدراس گئے تھے جامعہ کے لیے چندہ کرنے ہزاروں روپئے سے مدد کی تھی، یہی کوئی چالیس پچاس ہزار روپئے۔ اس وقت کانگریس کے مدراس سیشن کا موقع بھی تھا جس کے صدر ڈاکٹر مختار احمد انصاری مرحوم تھے۔ میں نے جمالیہ کالج جا کر دیکھا اور اس کے صحن میں وہ بڑا درخت بھی دیکھا جس کے نیچے حکیم صاحب مسلہ اور ڈاکٹر صاحب نے آرام فرمایا تھا۔ پھر سیٹھ جمال کے صاحبزادے سے ملنے گیا جو ممبر پارلیمنٹ رہ چکے تھے اور اس وقت علیل تھے۔ مدراس آنے کا مقصد پوچھا، میں نے بتایا تو رونے لگے اور کہا، "ڈاکٹر صاحب یہاں آئے تھے تو میرے والد سے جو کچھ بن پڑا تھا کیا تھا، اب وہ تو نہیں ہیں میں مصیبت زدہ ہوں اور بیمار ہوں، میرا کام خراب ہو گیا ہے اور پریشان حال ہیں، ڈاکٹر صاحب سے کہہ دیجیے گا کہ مجھے بڑی شرمندگی ہے۔" میری آنکھیں بھی بھر آئیں، اور دعائے خیر کرتا ہوا کمرہ سے باہر آگیا۔ دہلی واپسی پر

تھوڑے دن بعد ایک تقریب میں ڈاکٹر صاحب سے ملاقات ہوئی، وہ حسب عادت لوگوں کے پاس جاکر ہاتھ ملا رہے تھے اور باتیں کر رہے تھے کافی خوش تھے۔ اس گوشے میں بھی تشریف لائے جدھر میں تھا۔ جب انہوں نے ہاتھ ملایا تو میں نے سیٹھ جمال مرحوم کے صاحبزادے کی باتیں۔ ہمراہ لیں مجھے ذرا ایک طرف کرکے کہ ان کا چہرہ دیوار کی طرف تھا، دیا "سیٹھ جمال نے ہماری بڑے کٹھن وقتوں میں مدد کی تھی۔ انہوں نے ہمیں رقم دی تھی۔" تب کہا تھا کہ "کرم صاحب! یہ حقیر رقم حاضر ہے جس کو لوگوں نے وعدے کیے ہیں ان سے جتنے بھی ملے اس میں اپنی طرف سے ملا دیتے ہیں، میں یہاں ان سے وصول کر لوں گا۔" پھر ڈاکٹر صاحب نے فرمایا: "کسی نے دیئے تھوڑے ہی ہوں گے۔ درحقیقت یہ سب بار سیٹھ جمال ہی نے برداشت کیا ہوگا اور خندہ پیشانی سے کیا ہوگا۔" میں نے دیکھا کہ جب یہ باتیں ڈاکٹر صاحب کہہ رہے تھے تو ان کی آنکھیں نم تھیں اور آواز بھرائی ہوئی تھی۔ یہ سب سیٹھ جمال کے لیے جذبۂ احسان مندی کا اظہار تھا اور بیتے ہوئے سخت دنوں کی یاد بھی جس کا اپنا الگ ایک مزہ تھا۔

ڈاکٹر صاحب نے اپنے نفسوں کو ہمیشہ دبا رکھا اور قوم کے محسنوں کی خدمت میں ہمیشہ خراج عقیدت پیش کیا

گورنر مقرر ہونے سے پہلے، ——— ۵۶ ـ ۱۹۵۷:

ڈاکٹر صاحب علی گڑھ سے مستعفی ہو کر آگئے ہیں۔ جامعہ میں اپنے مکان میں مقیم ہیں۔ جامعہ کے رفقاء ان کے پاس بیٹھ جانے لگے طرح طرح کی باتیں ہوتیں۔ ایسی بھی کہ ڈاکٹر صاحب انہیں پسند نہ کرتے چھوٹی باتیں، دوسروں کی شکایتیں، جامعہ کے معاملات۔ مجھ سے جامعہ کے رجسٹرار جناب ارشاد الحق صاحب مرحوم نے بیان فرمایا کہ جب وہ عاجز آگئے اور ایسی باتیں سننا نہیں چاہتے تھے تو ایک دن منشی صاحب سے یا سعید صاحب سے (یہ ارشاد صاحب کو یاد نہ تھا) کہا، "آپ کو معلوم نہیں ہے شاید اوروں میں کسی کو معلوم نہ ہوگا کہ میری شیروانی کی جیبوں میں پتھر بھرے ہوتے ہیں، کہتے کہ ڈاکٹر دیوانہ ہو گیا ہے۔ کوئی ان سے ملنے جاتا ہے تو وہ پتھر مارتا ہے۔"

انہیں ارشاد صاحب مرحوم نے یہ بھی فرمایا کہ ڈاکٹر صاحب نے جامعہ کو اپنی شخصیت کی تکمیل کے لیے استعمال کیا۔ اس پر میں نے کہا تھا کہ ارشاد صاحب! اس کو یوں کہیے تو شاید زیادہ مناسب ہو کہ جامعہ کی تعمیر کے ساتھ ڈاکٹر صاحب کی شخصیت کی تعمیر بھی ہو گئی۔

••

ڈاکٹر سید محمد مشتاق رضوی
شعبۂ فلسفہ، مرزا غالب کالج
گیا

جب میں اعلیٰ تعلیم حاصل کرنے کی غرض سے ۱۹۴۹ء میں علیگڑھ مسلم یونیورسٹی میں داخل ہوا تو نہایت افراتفری کا زمانہ تھا۔ مخصوص سیاسی، سماجی اور معاشی حالات کے باعث سارے ہندوستان کے مسلمانوں پر بیچارگی کا عالم طاری تھا۔ ہندوستانی مسلمانوں کا اہم ترین تعلیمی اور تہذیبی مرکز ہونے کی حیثیت سے علیگڑھ ایک ایسا آئینہ تھا جس میں ان کی افراتفری، مایوسی، بے حسی اور کلیت کی تصویر نہایت واضح طور پر جھلک رہی تھی۔ صورتحال کچھ غیر یقینی اور مایوس کن تھی اور اس پر طرّہ یہ کہ وائس چانسلر کے عہدہ پر فائز تھے نواب اسمٰعیل خاں، جنھیں تقسیم ہند سے پہلے مسلم لیگ ایکشن کمیٹی کے چیرمین ہونے کا اعزاز بھی حاصل تھا۔ غرضیکہ حالات بد سے بدتر ہوتے جارہے تھے۔ پنڈت نہرو چاہتے تھے کہ بنارس ہندو یونیورسٹی کی وائس چانسلری آچاریہ نریندر دیو اور علیگڑھ مسلم یونیورسٹی کی وائس چانسلری ڈاکٹر صاحب قبول کرلیں۔ ڈاکٹر صاحب علیگڑھ کے مخصوص حالات کے پیش نظر اس عہدہ کو قبول کرنے میں جھجک محسوس کررہے تھے لیکن جب ان پر یہ حقیقت اچھی طرح واضح ہوگئی کہ اگر انھوں نے یہ ذمہ داری نہیں لی تو حالات کا سدھرنا ناممکن ہوجائے گا تو یک بیک مسئلہ حل ہوگیا کہ انھوں نے اس گھڑی یونیورسٹی کی باگ ڈور سنبھالی جس کے لیے اس کی نسبت کا فیصلہ ہوا تھا۔ یونین ہال میں ان کی پہلی تقریر کا نقش ابھی تک ذہن پر قائم ہے۔ اعتماد اور یقین سے بھری ہوئی اس تقریر نے جادو کا کام کیا۔ ہر شخص نے سانس روک کر ان کی باتیں سنیں اور ہال سے نکلے تو سبھی کے چہروں پر اطمینان کی جھلک نمایاں تھی۔ تقریباً چھبیس سال بعد ان کو خطاب کرنے کا موقع ملا تھا● مگر ان کے لہجہ میں گھلاوٹ ہی گھلاوٹ تھی کڑواہٹ کا شائبہ تک نہیں تھا۔ بعد میں ان کو قریب سے دیکھنے کے مواقع بھی ملے۔ میرے شعبہ (شعبۂ فلسفہ) میں جب بھی آئے تو ہیومر (HUMOUR) اور WIT کی پھلجھڑیاں ہی چھوڑتے آئے اور جاتے جاتے فکر و حکمت کا کوئی نہ کوئی نکتہ سمجھا کر گئے۔

اسوقت ایک واقعہ ذہن میں آرہا ہے۔ جلیل الرحمٰن اعظمی (مرحوم) اور پدم بھوشن ڈاکٹر عبید صدیقی علیگڑھ جیل میں بند تھے۔ امتحانات قریب تھے ہم لوگ ان لوگوں کی رہائی کے لیے خاصے فکرمند تھے۔ باقر مہدی اور میں جیل سے ملنے چلے گئے۔ ملنے کی اجازت نہیں مل رہی تھی اتنے میں ڈاکٹر صاحب جیل کے پھاٹک سے باہر آتے ہوئے دکھائی دیے۔ باقر نے ان کی شیروانی کا دامن تھام لیا اور بچوں کی طرح ضد ہوگئے کہ ملنے کی اجازت دلوادیجیے۔ ڈاکٹر صاحب نے نہایت شیریں اور نرم لہجہ میں ہم لوگوں سے کہا کہ جیل کے کچھ ضابطے اور قاعدے ہوتے ہیں۔ آپ ان لوگوں سے درخواست کیجیے وہ ملوادیں گے۔ ہم لوگ ڈاکٹر صاحب کو ان کی کار تک چھوڑ کر لوٹے تو کیا دیکھتے ہیں کہ جیل پھاٹک پر کھڑے ہیں اور ہم لوگوں کو باہر بات کرنے کی اجازت مل گئی ہے۔ یہ تھا ڈاکٹر صاحب کا مدد کرنے کا طریقہ۔ پُروقار اور انصاف پسند۔ ●●

● یہ جملہ ان کے الفاظ میں "تو تقریباً چھبیس برس بعد مجھے آپ لوگوں سے اس ہال میں گفتگو کرنے کا موقع ملا ہے۔ اس دوران حالات کچھ ایسے رہے کہ مجھے اس سعادت سے محروم رکھا گیا"

پروفیسر ظل الرحمٰن خاں اب ۹۲۵ ق ،

شاہجہاں پور میں شاہجہاں میں علی گڑھ مسلم یونیورسٹی
سے شعبہ طبیعیات میں اعلیٰ تعلیم حاصل کی پھر اس
شعبے کے چیرمین ہوئے۔ ہاشم علی صاحب کے
جانے کے بعد یونیورسٹی کے کارگزار وائس چانسلر بھی
بنے سالہا سال شعبہ طبیعیات میں پروفیسر رہے۔ علیگڑھ
کے طویل قیام کے باوجود شاہجہاں پور کی کشش
جو ایک لمحے کے لیے بھی کم نہیں ہوسکی۔ ذاکر صاحب
کے مخلص ہونے کے ناتے ذاکر صاحب پر
ان کا فرمایا ہوا سب سے زیادہ مستند ہوگا۔

ان کا وطن قائم گنج، ضلع فرخ آباد تھا۔ ان کے والد فدا حسین خان صاحب وکالت کے سلسلے میں حیدرآباد دکن چلے
گئے تھے لیکن اپنے وطن ہمیشہ آتے جاتے رہتے۔ وہاں کوٹھی بھی بنوائی۔ اس طرح ان کا تعلق یوپی اور حیدرآباد دونوں سے ہے۔

ابتدائی تعلیم اسلامیہ اسکول اٹاوہ میں حاصل کی جہاں وہ اسکول کے ہیڈ ماسٹر الطاف حسین صاحب اور ٹیچر مولوی شبیر اللہ
سے بہت متاثر ہوئے۔ اسکول کے زمانے سے ہی ان کو تحریک خلافت سے گہری دلچسپی پیدا ہوگئی۔ وہ تحریک کی حمایت میں تقریریں
کرتے اور چندہ جمع کرتے۔ میں نے سنا ہے کہ ان کے ہونے والے خسر نے ان کی تقریر سنکر اپنی بیٹی کی ان سے شادی کرنیکا فیصلہ کرلیا
ہائی اسکول پاس کرکے انھوں نے علی گڑھ میں ایم۔ اے۔ او کالج میں داخلہ لیا۔ وہاں ان کے خاص دوستوں میں
رشید احمد صدیقی، حبیب ایمن صاحب اور اقبال احمد خاں سہیل خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ سنا ہے ذاکر صاحب کورس کی چیزیں
تو کم پڑھتے تھے لیکن علمی اور ادبی محفلیں گھنٹوں چلا کرتی تھیں۔ کھیل کے میدانوں کے پاس تماشائیوں میں بھی دیکھے جاتے تھے۔

سنا۔ طالب علمی ہی میں انھوں نے افلاطون کی کتاب 'ریاست' کا اردو میں ترجمہ کیا جو بہت مقبول ہوا۔ علی گڑھ کی طالب علمی
کے دور میں وہ صوبہ ہند کے اور کچھ جماعت سے الیکشن جیت کر یونین کے نائب صدر رہے۔ اس زمانے میں طالب علم صدر نہیں ہوتا
تھا۔ اس زمانے میں اقبال احمد خاں سہیل نے ایک تہنیت نامہ فارسی میں لکھا جس کے چند اشعار ملاحظہ ہوں۔

بیا ہمہ رفعتِ او سنگ ریب در ما آریم	چو افتد دیدہ بر ذاکر نگہ را پر فشاں داریم
مرا زیبا اگر صد بار لب چون ہزار آمد	کہ در گلزار دانش باز فصل نو بہار آمد
بیا یہ ذاکر ز حسد طالع با ہوا داراں	کہ ما حیل عزیزاں کارواں سالاری آید
نگار یونین را ساعت صدر نیب دیں آید	کہ اکنوں سرو گلزار یونین ذاکر حسین آید

آخری شعر ملاحظہ ہو۔

الٰہی دور جام مہر تا ہر آسماں باشد	درین میخانہ دانش ہمیں پیر مغاں باشد

جب اورنگ زیب خاں شاید اگلے سال الیکشن جیتے تو اس موقع پر بھی سہیل صاحب نے ایک تہنیت نامہ لکھا
ذاکر صاحب کا کہنا تھا کہ اورنگ زیب خاں کے خلاف ان کا الیکشن اس بات کا اعلان تھا کہ علی گڑھ میں اب چھوٹے
آدمی کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔ اس سے پہلے ہر شعبہ پر بڑے جاگیرداروں کی اولادیں چھائی ہوئی تھیں۔ چھوٹے آدمی کی زبان
کھولنے کی ہمت نہیں تھی اور بڑے آدمیوں کا بہتوں نے فائدہ اٹھایا ہوگا بہتوں نے نقصان اٹھایا ہوگا لیکن چھوٹے آدمی کی یہ جیت عارضی
تھی کیونکہ شاید اگلے سال ہی بڑا آدمی کرسی صدارت پر براجمان ہوگیا۔ اب جاگیردار تو باقی نہیں رہے مگر دس سال سے جو فیل ہو
سنا ہے اس کی اہمیت تھوڑی بہت اب بھی ہے، گو کہ فرق ہوا ہے۔

جب گاندھی جی کی تحریک ترکِ موالات شروع ہوئی تو ایسا معلوم ہوتا تھا کہ علی گڑھ میں اس کو بہت بڑی کامیابی حاصل ہوگی لیکن بالآخر ایسا نہ ہوا۔ مایوسی کے دور میں جب آخری بار علی برادران نے ایم۔ اے۔ او کالج میں تقریر کی تو ذاکر صاحب اور ایک دوسرے کسی صاحب نے تحریک میں حصہ لینے کا اعلان کر دیا۔ جس پر سب کو بہت تعجب ہوا کیونکہ ذاکر صاحب کا بظاہر کوئی رجحان اس طرف پہلے نہیں معلوم ہوا تھا اور دوسرے اس وقت تحریک علی گڑھ میں دم توڑ چکی تھی۔ رشید صاحب کا بیان ہے کہ ذیل کے شعر کا جو محمد علی جوہر نے پڑھا تھا، ذاکر صاحب کے دل پر بہت گہرا اثر پڑا ؎

سپردم بہ تو مایۂ خویش را   تو دانی حسابِ کم و بیش را

چنانچہ وہ جامعہ میں گئے جو پہلے علی گڑھ میں قائم ہوئی اور پھر وہاں سے دہلی منتقل ہو گئی۔ پہلے قرول باغ میں رہی اور پھر وہاں سے ابھی موجودہ جگہ پر پہنچی۔

چونکہ جامعہ کے اس زمانے کے حالات سے لوگ عام طور پر واقف ہیں اس لئے اس زمانے کے زیادہ تر حالات کا ذکر صرف اشارۃً کیا جائیگا۔ شدید مالی مشکلات سے تو لوگ واقف ہی ہیں۔ اسی زمانے میں ایک روایت کے مطابق دہلی کارپوریشن کی ایک نشست کے لیے ان کا الکشن نواب زادہ لیاقت علی خاں سے ہوا اور دوسری روایت کے مطابق لیاقت علی خاں صاحب کے کسی قریبی رشتے دار سے ہوا، جس میں لیاقت علی خاں صاحب نے سرگرم حصہ لیا۔ دونوں روایتوں کے مطابق ذاکر صاحب الکشن جیتے۔

گو وہ علی گڑھ چھوڑ کر چلے آئے تھے، ان کا علی گڑھ سے اس زمانے میں برابر تعلق رہا۔ وہ اس زمانے میں وہاں کی کورٹ، اکیڈمک کونسل یا ایگزیکیوٹو کونسل کے برابر ممبر منتخب ہوتے رہے۔ ان BODIES میں انھوں نے نمایاں حصہ لیا۔

جامعہ کے زمانے میں ان کو برابر چندے جمع کرنے کا کام کرنا پڑتا تھا۔ ایک دفعہ وہ مسجد کے لیے چندہ لینے میرے وطن شاہجہانپور بھی آئے۔ ہمارے شہر کے مشہور تاجر اور رئیس حاجی سید جمال صاحب مرحوم نے جامعہ میں مسجد بنانے کے لئے شاید بیس ہزار روپے دینے کا وعدہ کیا۔ اس کے لئے ذاکر صاحب خود آئے۔ حاجی صاحب نے بتایا کہ وہ چاندی کے سکے دیں گے۔ علی گڑھ کے زمانے میں والد مرحوم کی ذاکر صاحب کے بڑے بھائیوں سے اچھی دوستی رہی تھی اور وہ ذاکر صاحب کے یونین کے الکشن میں ان کے خاص طرفداروں میں تھے۔ شاید ان کے نام کی طرف ہی اقبال سہیل صاحب کے تہنیت نامے میں اشارہ ہے۔ چنانچہ ذاکر صاحب والد مرحوم سے ملنے ہمارے گھر آئے اور انھوں نے چاہا کہ جب حاجی صاحب رقم ادا کریں تو وہ سکے لیکر انھیں بیس ہزار روپے کے نوٹ دیدیں کیونکہ سکوں کے بوجھ ڈھونے میں پریشانی

اور خطرہ دونوں چیزیں تھیں۔ لیکن احتساب کی نوبت نہیں آئی کیونکہ کوئی فقہی مسئلہ ایسا [illegible] کی ہو گیا کہ حاجی صاحب نے چندہ نہیں دیا۔ ذاکر صاحب نے معاملے کی تفصیل مجھے بتائی تھی مگر بدقسمتی سے مجھے اب یاد نہیں ہے ورنہ میں آپ کے سامنے پیش کرتا۔ چندہ جمع کرنے کے کام میں انکو اکثر تلخ تجربے ہوئے۔

گاندھی جی کی دعوت پر ایک کمیٹی کی مدد سے ابتدائی تعلیم کی وردھا اسکیم انھوں نے مرتب کی۔ اس کی دو باتیں خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ پہلی بات تو یہ کہ ابتدائی تعلیم بچے کی مادری زبان میں ہونا چاہیے اور دوسری یہ کہ تعلیم کو بالکل سیکولر رکھا گیا۔ البتہ پرائیویٹ اداروں کو یہ آزادی تھی کہ اگر وہ چاہیں تو اپنے خرچ پر جن بچوں کے والدین اجازت دیں ان کو مذہبی تعلیم دیں۔ یہ اور دیگر اصول قومی سطح پر اصولاً مانے گئے اور قومی پالیسی کا حصہ بن گئے۔ یہ دیگر بات ہے کہ جن بچوں کی مادری زبان اردو ہے ان میں سے زیادہ تر کی ابتدائی تعلیم اردو میں نہیں ہو رہی ہے۔ گو کہ بنیادی تعلیم کی اسکیم عملاً ناکامیاب ہو گئی مگر ان دو اصولوں کو اصولاً مان لیا گیا۔ اور کچھ ہوا ہو یا نہ ہوا ہو اس سے کانگریس میں خصوصاً اور ملک میں عموماً جو لوگ سیکولر پالیسیوں کو عمل میں لانے کی کوشش کر رہے تھے، ان کے ہاتھ مضبوط ہوئے اور آئندہ کے آزاد ہندوستان کی سیکولر پالیسی بنانے میں مددگار ثابت ہوا۔ اسی لئے ذاکر صاحب کو سیکولرازم کا معمار کہا گیا ہے۔ مگر یہ بات قابل بیان ہے کہ مجموعی طور پر ملک کی فضا اس لحاظ سے سیکولر تھی کہ لیگ اور جناح تک نے کبھی بھی آزادی سے پہلے اسلامی حکومت کی بات نہیں کی۔ بلکہ عام طور پر لوگوں کو یہ اندازہ تھا کہ جناح اس طرح کی سیاست کو وجود میں لانے کے خلاف ہیں۔ اس کا بالکل صاف اندازہ جناح کی اس تقریر سے ہوتا ہے جو انھوں نے ۱۱ اگست ۱۹۴۷ء کو ڈھاکہ میں پاکستان کی آئین ساز اسمبلی کے سامنے کی۔ کانگریس میں سیکولر خیالات کے لوگ بھاری اکثریت میں تھے گو کہ مخالف خیال کے لوگوں کی تعداد بھی ان کے برابر نہیں تھی۔ پھر بھی کانگریس میں کوئی گروہ اعلانیہ طور پر ہندوستان کو ہندو ریاست بنانے کی بات نہیں کرتا تھا۔ شاید صرف ہندو مہا سبھا ایسی گفتگو کرتی رہی ہو گی، مگر اس کی کوئی طاقت نہیں تھی گاندھی جی رام راج کی بات کرتے تھے جس سے غلط فہمیاں پھیلانے کا لوگوں کو موقعہ ملا، مگر وہ بلاشبہ سیکولر ہندوستان کے حامی تھے۔ ان کا کوئی ذرا سا بھی تعلق ہندو راشٹر کے فلسفے سے نہیں تھا۔

لہٰذا ابتدائی اور بنیادی تعلیم کو سیکولر رکھنا کوئی جدت نہیں تھی یہ ہماری تحریک آزادی کی روایات، ملک کے مزاج، اور ضروریات کے عین مطابق تھا۔

کم از کم ہندوستان جیسے ملک میں جہاں اتنی مختلف زبانیں بولی جاتی ہیں، اتنے مختلف رسم و رواج ہیں، اتنے مختلف دھارے ہیں کہ ایئر IYER اور آئینگر IYENGAR تضاد کی حد تک مختلف ہیں گو کہ دونوں جنوبی

ہند کے برہمن ہیں، پھر مختلف خطوں کے سیاسی، معاشی اور ثقافتی تجربات الگ مختلف ہیں کہ سیکولرازم کے علاوہ اور کوئی چارہ نہیں ہے۔ کم از کم ہندوستان میں مذہب کی بنیاد پر ریاست اور حکومت نہیں چلائی جا سکتی۔ اقلیت کی طرف سے تو شاید مذہبی حکومت کی مخالفت اتنی شدید نہ ہو جتنی اکثریت کے مختلف طبقوں، مزدوروں، اچھوتوں، عورتوں اور نوجوانوں کی طرف سے ہوگی۔ برہمن کی برتری کو آج کون ماننے کا ہے کہ باپ کی برتری کو جوان مان نہیں رہے ہیں

ہم تو آزادی سے پہلے کے ہندوستان کی بات کر رہے تھے۔ اس وقت ملک کا مزاج کم از کم لاشعوری طور پر سیکولر تھا۔ پھر بھی اخلاقی بنا پر بہت سے لوگ یہ سمجھتے تھے کہ بچوں کو مذہبی تعلیم ملنا چاہیے۔ اس لیے ابتدائی تعلیم کو سیکولر رکھنے کی تحریر عام طور سے جو سوچنے کا ڈھنگ تھا اس سے الگ تھی۔ کمیٹی میں اس بات پر کافی اختلاف رہا۔ ملک کے پیمانے پر مسلمانوں میں اس پہلو کی خاص طور پر بہت مخالفت ہوئی۔

جمہوریت، سیکولرازم، اور سوشلزم پچھلے دو سو سال کی دین ہے، اور یہ یورپ سے ہمارے پاس آئے۔ میری رائے میں ان کو پرانی تاریخ میں ڈھونڈنا گمراہ کن ہے۔ ہندوستان میں جمہوریت کو تو ہم نے جوں کا توں لے لیا، مگر سیکولرازم اور سوشلزم میں ہم نے ترمیمیں کی ہیں۔ مثلاً یورپ میں سیکولرازم کے ارتقاء میں ایک ہلکا سا عنصر مذہب کی مخالفت کا بھی ملتا ہے۔ ہمارے یہاں ایسا نہیں ہے۔

اس کے دو طریقے ممکن تھے ایک تو یہ ہو سکتا تھا کہ ریاست اور حکومت مذہب کی تقریباً بالکل بات ہی نہ کرتی یا سب مذاہب کی برابر سے بات کرتی بظاہر آخر الذکر طریقہ اختیار کیا گیا ہے لیکن اس کا جھکاؤ اکثریت کی طرف بہت زیادہ معلوم ہوتا ہے۔ اس طرح سے سیکولرازم مسخ ہو گئی ہے۔

صاف ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ذاکر صاحب کو ان خطروں کا احساس بہت پہلے سے تھا یا تو اس صدی کی دوسری دہائی کے اواخر میں یا تیسری دہائی کے شروع میں انھوں نے کچھ اس طرح سے کہا ہے کہ کچھ لوگ اس وقت بہت اچھی نیت سے مذہب کو سیاست میں استعمال کر رہے ہیں مجھے یہ ڈر ہے کہ یہ کہیں بہت نقصان دہ ثابت نہ ہو۔ میں نے اسے خود کہیں پڑھا ہے مگر مجھے یاد نہیں کہ کہاں۔ اس کو ڈھونڈ کر نکالنا چاہیے۔ لہٰذا انھوں نے یہ بہتر سمجھا کہ ریاست اپنے آپ کو مذہب سے بالکل الگ رکھے مگر یہ بات صاف رہنا چاہیے کہ ان کی سیکولرازم میں مذہب کی مخالفت کا ذرا سا بھی عنصر نہیں ہے ——— چونکہ سیکولرازم پر میں نے اتنی گفتگو کی ہے تو میں اتنا اور کہہ دوں کہ میری رائے میں اس وقت ہندوستانی ریاست تو سیکولر ہے مگر حکومت ہندو کی طرف میں ہے

جامعہ کے آخری دور کی قابل ذکر بات سلور جوبلی ہے جو ۱۹۳۶ء میں منائی گئی۔ اس کی خاص بات یہ

تھی کہ مختلف قومی پارٹیوں کے لیڈر ایک پلیٹ فارم پر جمع ہوئے۔ اس سے جامعہ کے کام کا ملک بھر میں چرچا ہوا۔ لیفٹسٹ
سے ایک پلیٹ فارم پر آ کر اس بات کی توقع اصولاً پیدا کی کہ مختلف الخیال لیڈر مل جل کر ملک کے مسائل پر تبادلۂ خیال
کر سکتے ہیں اور ایک CONSENSUS پیدا کر سکتے ہیں۔ لیکن یہ توقعات پوری نہ ہو سکیں کیونکہ ملک کی فضا بہت مکدر
ہو چکی تھی اور اب کسی تصفیہ کی گنجائش باقی نہیں رہ گئی تھی۔ پھر بھی سلور جوبلی کو سنگ میل کی حیثیت حاصل ہے۔

۱۹۴۶ء میں انتخابات کے بعد پنڈت نہرو کی قیادت میں جب عبوری حکومت INTERIM GOVERNMENT
قائم ہوئی تو ذاکر صاحب کو وزیر تعلیم بننے کی دعوت دی گئی جس کو انہوں نے قبول نہیں کیا۔ چونکہ یہ بات عام طور پر معلوم
ہے، اس لئے میں کوئی اور تفصیل بیان نہیں کروں گا۔

آزادی اور تقسیم ملک کے فوراً بعد جب ذاکر صاحب دہلی سے کشمیر جا رہے تھے تو جالندھر اسٹیشن پر ان کو
بلوائیوں نے گھیر لیا اور بڑی مشکل سے ایک سکھ افسر کی وجہ سے ان کی جان بچی۔ یہ واقعہ تفصیل سے اور لوگوں نے بیان کیا
ہے، اس لئے میں سوائے اس کے کچھ نہیں کہوں گا کہ اس طرح کے تجربے کے باوجود ان کے خیالات اور رویے میں کوئی
فرق پیدا نہیں ہوا۔

جب کشمیر کا تصفیہ کرنے کے لیے یو این (U N) کی طرف سے ایڈمرل نمٹز ADMIRAL NIMITZ
آئے تو ایک شاید چودہ نکاتی پروگرام ذاکر صاحب نے ان کے سامنے پیش کیا۔ اس سب کے علاوہ انہوں نے اس دور
میں ہندوستان اور بیرون ملک کے سفر کئے اور مختلف اہم کمیٹیوں کے ممبر رہے۔ فسادات سے متاثر لوگوں کی مدد کرنے کی مہم میں
شدومد سے لگے رہے۔

ذاکر صاحب اور دیگر جامعہ والوں کی مالی مشکلات کا اندازہ ذیل کی باتوں سے بخوبی لگایا جا سکتا ہے۔ ایک
صاحب جن کا تعلق عرصے تک جامعہ سے رہا، بعد میں کمیونسٹ پارٹی میں شامل ہو گئے، دو تین سال قبل ان سے جامعہ میں
میری ملاقات ہوئی۔ دوران گفتگو انہوں نے کہا کہ میں سب بڑے بڑے کمیونسٹ لیڈروں سے واقف ہوں، اور میں نے
ذاکر صاحب کو بھی جامعہ کے دور میں دیکھا ہے، میں یہ پوری ذمہ داری سے کہہ سکتا ہوں کہ رہن سہن کے اعتبار سے
ہندوستان کے سب سے بڑے کمیونسٹ گاندھی جی اور ذاکر صاحب تھے۔ جامعہ میں ان کے گھر کی حیثیت ایک
COMMUNE کی تھی

دوسری بات بہت دلچسپ ہے۔ قرول باغ کے ایک بنیے نے جب ذاکر صاحب صدر تھے، ان کے ساتھ
فوٹو کھنچوانے کی خواہش ظاہر کی۔ ذاکر صاحب راضی ہو گئے۔ اوپر سے ان کو روکا گیا کہ وہ اس بنیے کے ساتھ فوٹو نہ

کھینچوا دیا کیونکہ اس کی خراب شہرت ہے۔ انھوں نے یہ بات نہ مانی اور فوٹو کھنچوا لیا۔ جب ان سے وجہ پوچھی گئی تو ان کو یہ انکشاف کرنا پڑا کہ ان کے قرول باغ کے زمانے میں وہ خیال ان کو اُدھار دیتا تھا ورنہ فاقے ہوتے۔

پنڈت نہرو اور مولانا آزاد کے بہت اصرار پر انھوں نے علی گڑھ کا وائس چانسلر ہونا قبول کر لیا اور سنہ ۱۹۴۸ء میں علی گڑھ پہنچ گئے۔ اس سلسلے میں اور باتیں تو لوگ جانتے ہیں مگر شاید ایک اہم بات زیادہ لوگوں کے علم میں نہ ہو اس لئے میں اسے مختصراً بیان کروں گا۔ یہ معلومات مجھے ڈاکٹر سید عابد حسین صاحب مرحوم سے حاصل ہوئی تھی۔

جب ۱۹۴۷ء میں ملک کی تقسیم ہوئی تو اکثریت میں مسلمانوں کے خلاف بہت سخت ناراضگی پیدا ہوئی جو نفرت کی حد تک پہنچ گئی۔ اس وقت پنڈت گوبند بلبھ پنت یو پی کے وزیر اعلیٰ تھے۔ وہ یہ چاہتے تھے کہ مسلمان یو پی میں رہیں اور بڑے پیمانے پر ہجرت نہ ہو مگر فضا کو دیکھتے ہوئے ان کو اس میں بڑی دشواری نظر آتی تھی چنانچہ انھوں نے یہ سوچا کہ تقسیم ملک کی ذمہ داری مسلمانوں سے ہٹا کر اردو اور مسلم یونیورسٹی پر ڈال دی جائے۔ آپ کو یہ یاد رہے کہ علی گڑھ کے طلبا اور اساتذہ نے مسلم لیگ کی حمایت میں زبردست حصہ لیا تھا۔ اس سب کے باوجود میں یہ سمجھتا ہوں کہ تقسیم ملک کی ذمہ داری مسلمان اور ہندوؤں پر برابر کی ہے۔ میں یہ مزید کہنا چاہتا ہوں کہ ہماری آزادی کی جنگ میں بہت سی کمزوریاں تھیں مثلاً یہ طے نہ ہو سکا کہ گؤکشی کے مسئلہ پر کیا کرنا چاہیئے۔ ماری سوید رام جیم بھومی اور کرشن جنم بھومی وغیرہ قسم کے مسائل پر قومی تحریک کا کیا رویہ ہونا چاہیئے تو پھر تقسیم تو ہونا ہی تھی۔ مسلمانوں پر ذمہ داری کیوں رکھ دی جائے۔ خیر ان باتوں پر بحث کا یہ موقع نہیں ہے۔ ہم پنت جی کی بات پر واپس آجائیں۔ انھوں نے یہ سوچا کہ غصہ کو مسلمانوں سے ہٹا کر اردو اور علی گڑھ یونیورسٹی پر منتقل کر دیا جائے اور اس طور سے ان دونوں کا مکمل طور سے خاتمہ کر دیا جائے۔ اس طرح مسلمانوں کو یو پی اور ہندوستان میں باقی رکھا جا سکے گا۔ اس پالیسی کو سمپورنانند جی کی پوری حمایت حاصل تھی۔ اس پس منظر میں ذاکر صاحب کا علی گڑھ کا وائس چانسلر بننا بہت کا حامل ہے۔

ایسا معلوم ہوتا ہے کہ مرکز نے ذاکر صاحب کو علی گڑھ بھیجنے کا فیصلہ پنت جی کی رائے کے خلاف کیا۔ شاید پنت جی کو ذاکر صاحب سے اس وجہ سے کچھ ناراضگی پیدا ہو گئی جس کا ویسے تو کوئی ظاہری اظہار نہیں ہوا لیکن ہم آئندہ صفحات میں بتائیں گے کہ شاید یہ ناراضگی آگے چل کر بہت اثر انداز ہوئی۔

علی گڑھ جو بالکل ختم ہوتا ہوا معلوم ہو رہا تھا اسے ذاکر صاحب نے نئے سرے سے ایک نئی زندگی دی ان لوگوں کو خصوصاً جنھوں نے پاکستان کی مہم میں نمایاں حصہ لیا تھا ان کو ذاکر صاحب نے ... ان سے

جائیں گے۔ لیکن ذاکر صاحب نے ایسا نہیں کیا اور ہر اس آدمی کو جو یونیورسٹی کے لیے کسی بھی طریقے سے مفید ہو سکتا تھا، انھوں نے اس کو اپنا تعاون دینے کا وعدہ کیا اور یہ رویہ اختیار کیا کہ جو کچھ ہوا اس کو بھلا دیا جائے بشرطیکہ آئندہ کام خوش اسلوبی سے ملک کے آئین اور قانون کے مطابق ہو۔

انھوں نے تحقیق کے کام پر زور دیا جو علی گڑھ میں کچھ عرصے پہلے صرف خال خال ہو رہا تھا۔ اس کام کو آگے بڑھانے کے لیے انھوں نے باہر کے لوگوں کا بڑی تعداد میں تقرر کیا، اور جہاں کوئی اچھا آدمی ملا اس کو بلا امتیاز مذہب و ملت و خیالات تقرر کیا۔ ایسا نہیں ہے کہ علی گڑھ میں اس کی روایت نہیں تھی۔ سر سید نے خود بھی یہی پالیسی رکھی تھی۔ ان کے بعد ان کے پوتے سر راس مسعود نے بھی بالکل یہی پالیسی اختیار کی تھی۔ مگر پچھلے پندرہ سولہ سال میں لوگ اس پالیسی کو بھول گئے تھے۔ لہٰذا بہت سے لوگوں کو غیر مسلموں اور ترقی پسند خیالات کے لوگوں کا خاصی بڑی تعداد میں لیا جانا برا لگا۔ لیکن ذاکر صاحب اپنی پالیسی پر قائم رہے۔ پھر انھوں نے وہاں کے اساتذہ کو بڑی تعداد میں باہر کے ملکوں میں پڑھنے اور تحقیق کا کام کرنے بھیجا۔ یونیورسٹی کا بجٹ کئی گنا بڑھا۔ تحقیق کا کام بڑے پیمانے پر شروع ہوا۔ پڑھائی لکھائی کا معیار بڑھا۔ یونیورسٹیوں نے نام پیدا کرنا شروع کر دیا۔ کھیلوں کا معیار بھی جو تقسیم ملک کے بعد بہت گر گیا تھا، آہستہ آہستہ بڑھنا شروع ہو گیا اور اپنی پرانی سطح پر آ گیا۔ اس کا ذکر زیادہ تفصیل سے آگے چل کر ہوگا۔ ڈرامے آئے دن ہونے لگے۔ سنگیت اور نغمے سنائی دینے لگے۔ غرضیکہ کلچرل سرگرمیاں زور و شور سے ہونے لگیں۔ علی گڑھ کی ایک قابل ذکر بات یہ ہے کہ وہاں ایک نابینا اسکول پہلے سے تھا۔ وہ خیرات زکوٰۃ پر چلتا تھا جس سے وہاں کے بچوں پر بہت برا اثر پڑتا تھا۔ ذاکر صاحب نے اس کو گرانٹ پر لے لیا جس سے اسکول کی کارکردگی اور وہاں کے بچوں کی زندگی پر بہت اچھا اثر پڑا۔

علی گڑھ میں جو لوگ میرے طالب علمی کے زمانے میں رہے ہیں وہ یہ جانتے ہیں کہ مارچ سے لے کر جون تک ایسی دھول اڑتی تھی کہ سڑک پر چلنا دشوار ہو جاتا تھا۔ ذاکر صاحب نے بڑے پیمانے پر وہاں درخت لگوائے اور لان تیار کرائے۔ اس سے خوبصورتی میں اضافہ ہوا اور دھول اڑنا بند ہو گئی۔

ذاکر صاحب نے علیگڑھ کے اقامتی کردار میں کچھ تبدیلیاں کرنے کی کوشش کی مگر اس میں ان کو کوئی خاص کامیابی حاصل نہیں ہوئی۔ ذاکر صاحب کے زمانے میں بہت سی اہم شخصیتیں مثلاً پنڈت نہرو، بابو راجندر پرشاد، ڈاکٹر رادھا کرشنن، راجا گوپال اچاریہ، پنڈت گووند ولبھ پنت اور مولانا آزاد وغیرہ علیگڑھ آئے۔ ان کے علاوہ بیرون ملک کی کئی اہم شخصیتیں بھی علیگڑھ آئیں، جن میں شاہ سعود اور شہنشاہ ایران خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ مولانا آزاد، ذاکر صاحب کے شروع زمانے میں آئے۔ اس موقع پر خاصی بدمزگی ہوئی اور مولانا ناخوش واپس گئے۔

ذاکر صاحب نے یونیورسٹی کی کارکردگی کو بہتر بنانے کی ہر ممکن کوشش کی اور ہر چھوٹی سے چھوٹی بات کی طرف ذاتی توجہ دی۔ طالب علموں کے لیے وظائف کا انتظام کیا۔ اپنی جیب سے بھی خاصی رقم دی۔ ہالوں میں خود جا کر طالب علموں کی ہمت افزائی کرتے۔ ان سب باتوں کا نتیجہ یہ ہوا کہ تھوڑے ہی عرصہ میں فضا بالکل بدل گئی اور یاس کے بجائے نوجوان ہر طرف پر امید نظر آنے لگے۔ سیکولرازم اور جمہوریت کی قدریں نوجوانوں کے ایک بڑے طبقے میں ہر دلعزیز ہو گئیں۔ علم کی پیاس پیدا ہو گئی اور نوجوانوں میں جد و جہد کر کے آگے بڑھنے کی امنگیں پیدا ہو گئیں۔ بعد میں سب کو یہ اعتراف ہوا کہ ذاکر صاحب کے آنے سے یونیورسٹی بڑے خطروں سے بچ گئی اور اس نے بڑی ترقی کی۔

ذاکر صاحب کے دور میں جب نوابزادہ لیاقت علی خاں صاحب کو پاکستان میں قتل کر دیا گیا تو علی گڈھ میں اس پر بڑا ہنگامہ ہوا۔ انھوں نے بڑی خوش اسلوبی سے معاملات کو بگڑنے سے روکا۔ ایگزیکٹو کونسل یہ رزولیوشن پاس کر چکی تھی کہ کسی کی موت پر بھی یونیورسٹی سائرن نہیں بجایا جائے گا۔ لڑکوں کا اصرار تھا کہ سائرن بجایا جائیگا ذاکر صاحب نے لڑکوں کے موڈ کو بھانپ لیا تو انھوں نے یونین میں جا کر یہ کہا کہ اگر یونین بغیر کسی اختلاف کے یہ رزولیوشن پاس کر دے کہ سائرن بجایا جائے تو میں اسے مان لوں گا۔ اس پر دو لڑکوں نے ہاتھ اٹھانا چاہے کہ ان کو اس بات سے اختلاف ہے۔ ایک تو رضی الدین احمد جو بعد میں ترہٹی یونیورسٹی میں اردو کے پروفیسر ہوئے اور ایک صاحب کنگر تھے جن کا پورا نام مجھے یاد نہیں ہے [illegible] تھے لڑکوں نے ان کا ہاتھ نیچے دبا دیا لیکن ذاکر صاحب کو شبہ ہو گیا کہ کچھ لوگوں کو خلاف رائے دینے سے روکا جا رہا ہے تو انھوں نے کہا کہ چونکہ اس پر اختلاف ہے، اس لئے سائرن نہیں بجایا جا سکتا لڑکوں نے کہا کہ ان کو غلط فہمی ہے۔ کوئی اختلاف نہیں ہے وغیرہ وغیرہ۔ مگر یہ بات صاف تھی کہ اس پر اختلاف تھا۔ جب لڑکوں نے ذاکر صاحب کی بات نہیں مانی اور جس کمرے میں سائرن تھا اس کا دروازہ توڑنے لگے اور اندر داخل ہونے والے تھے تو انھوں نے کہا۔ "میں حکم دیتا ہوں کہ سائرن بجایا جائے۔"

علی گڈھ کے دور کی ایک خاص قابل ذکر بات یہ ہے کہ سائنس کے ایک غیر مسلم پروفیسر صاحب کی سخت مخالفت پیدا ہو گئی۔ ذاکر صاحب ان سے دل میں شاکی تھے مگر برابر ان کی حمایت کرتے تھے۔ یہ ضرور صحیح تھا کہ ان پروفیسر صاحب کا رویہ ڈکٹیٹروں جیسا تھا، مگر ان میں بہت خوبیاں بھی تھیں۔ علاوہ ازیں وہ اپنے مضمون میں کافی شہرت کے مالک تھے اور ہندوستانی یونیورسٹیوں کے اپنے مضمون کے سب پروفیسروں سے زیادہ اعلیٰ مقام رکھتے تھے۔ ان کے بارے میں مجھ سے ذاکر صاحب نے کہا کہ دوسرے آدمی میں یہ سب خرابیاں بلا وجہ میں ہیں وہ تو ہوں گی اور مضمون اتنا بھی نہیں آتا ہوگا۔ اب میں یہ سمجھتا ہوں کہ یہ بات مجموعی طور پر صحیح ہے۔ ان کا

کہتا تھا کہ ہمارے قومی اثاثوں کو لوگوں کے ساتھ تباہ کر سکتے ہو، جا چکے کوئی ABSOLUTE JUDGEMENT نہیں دے سکتا جیسے آدمی ہیں ویسا ہی سے کام ان کا ان ہوگا۔ وہ آدمی جیسا لوگ چاہتے ہیں کہاں سے آئے گا۔

ایک اور دلچسپ بات مجھے حسین علی کاظمی مرحوم نے سنائی۔ یہ علی گڑھ میں بعد میں DIRECTOR of PHYSICAL CULTURE ہوئے۔ اپنے علیگڑھ کے شروع کے دور میں ذاکر صاحب نے حسین علی صاحب کو بلایا اور ان سے کہا کہ یونیورسٹی کا اہم کام تو علم اور تحقیق کے کام کو بڑھانا ہے لیکن عام مسلمان علیگڑھ کو اسکی ہاکی ٹیم کی کارکردگی سے جانتا ہے۔ لہٰذا میری خواہش ہے کہ آپ ہاکی کوچ کی حیثیت سے کام کرنا قبول کریں اور ایک ایسی ٹیم بنا کر دیں جو علیگڑھ کی ہاکی کی پرانی عظمت کو دوبارہ زندہ کر دے، مجھ سے جو مدد ہو سکے گی وہ میں کروں گا

ڈاکٹر نورالحسن صاحب کو بلا کر ان سے کہا کہ وہ ان کو ہاکی کلب کا پریسیڈنٹ بنانا چاہتے ہیں۔ ڈاکٹر صاحب نے کہہ کر معذرت کی کہ وہ کبھی ہاکی نہیں کھیلے ہیں اور نہ ان کو اس سے کچھ واقفیت ہے۔ وہ اس میں کیا کر سکیں گے۔ ذاکر صاحب نے ان سے کہا کہ انھوں نے بہت سوچ سمجھ کر یہ فیصلہ لیا ہے اور یہ کام آپ کو قبول ہی کرنا ہے کیونکہ جو صلاحیتیں آپ میں ہیں ان سے آپ اس کام کو اور سب سے بہتر کر سکتے ہیں۔ لہٰذا ڈاکٹر نورالحسن صاحب نے اس کام کو قبول کیا اور ایک ایسی ٹیم بنائی کہ شاید اس جیسی ٹیم علیگڑھ نے پہلے بھی بہت مشکل سے بنائی ہوگی۔ یہ سب کی متفقہ رائے ہے کہ نورالحسن صاحب جیسا کامیاب ہاکی کا پریسیڈنٹ کوئی نہیں ہوا ہے۔

اس کے علاوہ نورالحسن صاحب کا بہت بڑا کارنامہ یہ ہے کہ انھوں نے شعبۂ تاریخ کی بنیادوں کو مضبوط کیا اور اس کے کام کو آگے بڑھایا۔ اس سلسلے میں اس بات کا اعتراف کرنا چاہئے کہ پروفیسر محمد حبیب مرحوم اور شیخ عبدالرشید مرحوم نے وہاں بہت پہلے سے صحت مند روایات قائم کی تھیں، اور شعبے کی آئندہ ترقی کیلئے راستہ ہموار کر دیا تھا شعبۂ تاریخ کے کام کو آگے بڑھانے میں دیر لگی، تو مخالفوں کو یہ کہنے کا موقع ملا کہ سیاست لڑانے کے سوا کوئی علمی اور تحقیقی کام وہاں نہیں ہو رہا ہے اور سب ایک FRAUD ہے۔ مجھ سے تو ذاکر صاحب نے کبھی اس سلسلے میں کوئی بات اشارتاً بھی نہیں کہی مگر میں نے اڑتی پڑتی یہ بات سنی ہے کہ وہ بھی شاکی ہو گئے تھے کہ ان کی توقعات پوری نہیں ہوئی ہیں۔ مجھ کو اس میں ذرا شک ہے، کیونکہ ان کی زندگی ہی میں کچھ نتائج سامنے آنا شروع ہو گئے تھے۔ مجھے یقین ہے کہ اگر ذاکر صاحب اب زندہ ہوتے تو شعبۂ تاریخ کے کام سے نظریاتی اختلافات رکھنے کے بعد بھی بہت خوش ہوتے۔ ان میں وہ بات تھی کہ دو متضاد خیالوں میں ایک ساتھ خوبیاں دیکھ سکتے تھے (اس کی اور مثالیں بھی میں پیش کروں گا) چنانچہ اگر آج ذاکر صاحب زندہ ہوتے تو وہ بیک وقت

پروفیسر خلیق احمد نظامی، پروفیسر عرفان حبیب، پروفیسر اطہر علی، پروفیسر اقتدار عالم خاں صاحب اور کئی لوگوں کا نام درست اشتہار کرتے اور پروفیسر محمد حبیب اور شیخ رشید کے علاوہ نورالحسن صاحب کی مدد کا اعتراف کرتے۔

پنڈت نہرو کی علیگڈھ آمد کا میں پہلے ذکر کر چکا ہوں۔ اس موقعہ پر ذاکر صاحب نے جو تقریر کی اس کی ایک چھوٹی سی بات مجھے یاد رہ گئی جو اکثر میں اپنے طالبعلموں کو بتاتا رہتا ہوں۔ وہ میں یہاں اس لئے بتا رہا ہوں کہ ذاکر صاحب کا اسی طرح قصے سنا کر چیزوں کو بتانے اور سمجھانے کا طریقہ تھا۔ کہنے لگے کہ اکثر ایجاد بہت چھوٹی سی بات سے ہوتی ہے۔ مثلاً ریل کی پٹری پہلے سے تھی اس پر گھوڑا گاڑیوں سے کوئلہ کی کانوں میں کوئلہ ڈھویا جاتا تھا۔ اسٹیم انجن کانوں میں جو پانی بھر جاتا تھا اسکو نکالنے میں استعمال کیا جاتا تھا۔ جارج اسٹیفنسن نے صرف یہ کیا کہ اسٹیم انجن کو پٹریوں پر رکھ دیا اس طرح ریلوے کی ایجاد ہوئی۔

علیگڈھ کے زمانے کی ایک اہم بات یہ ہے کہ وہ رادھا کرشن کمیشن کے ممبر مقرر ہوئے۔ ہندوستان کی اعلیٰ تعلیم کی تاریخ میں اس کمیشن کی رپورٹ کی بہت اہمیت ہے۔

علی گڈھ کے قیام کے دوران انھوں نے ملک اور بیرون ملک کے کئی سفر کئے اسی زمانے میں انھوں نے اردو کی حمایت میں دستخطوں کی مہم چلائی۔

ویسے تو علی گڈھ میں ان کو طلبا اور اساتذہ کی بڑی اکثریت کا اعتماد اور تعاون حاصل رہا مگر آخر میں کچھ ساتھیوں سے شاکی ہو گئے اور دل برداشتہ رہنے لگے۔ چنانچہ بیر TERM پورا کئے ہوئے ۱۹۵۶ء میں علی گڈھ چھوڑ دیا۔

کچھ ہی عرصے بعد بہار کے گورنر مقرر ہو گئے۔ اس کے بعد پہلے وائس پریسیڈنٹ اور پھر پریسیڈنٹ کے عہدے پر فائز رہے۔ دو سال ہی پریسیڈنٹ رہے تھے کہ قلب کا دورہ پڑنے سے ۲ مئی ۱۹۶۹ء کو انتقال ہو گیا

<u>خیالات، مسائل اور شخصیتوں کی طرف رویہ:</u> ذاکر صاحب نے تحریک خلافت سے زندگی شروع کی لیکن جب وہ ایم، اے، او، کالج آئے تو وہاں کے تجربات سے ان میں جاگیردارانہ نظام کی قدروں کے خلاف فکر شعوری طور پر پیدا ہوئی اور میرے خیال میں اس نے ان کی مستقبل کی زندگی کا راستہ متعین کر دیا۔ شاید یہی ان کو گاندھی جی کے ساتھ لے گئی، اسی سے آگے چل کر انھوں نے سیکولرازم، نیشنلزم اور جمہوریت کے راستے ڈھونڈے، اور پھر زندگی بھر ان کو نہ چھوڑا۔

ان باتوں کے ساتھ ساتھ ان میں تکمیلیت پسندی بدرجۂ اتم تھی۔ اسی نے ان میں جمالیاتی حس پیدا کر دی مندرجہ بالا کی روشنی میں ہم ان کی فکر پر مختصراً ایک نظر ڈالنے جا رہے ہیں۔

<u>جاگیردارانہ نظام مخالف رویہ:</u> جیسا کہ ذکر آچکا ہے، اس کی شروعات علیگڈھ سے ہوتی ہے جب وہ علیگڈھ کے وائس چانسلر ہوئے تو انھوں نے کوشش کی کہ وہاں کے اقامتی کمروں میں ایسی تبدیلیاں پیدا کریں جس سے جاگیردارانہ قدریں کمزور ہوں، لیکن اس میں ان کو زیادہ کامیابی نہ ہوئی۔ ایک چھوٹی سی تبدیلی جو ہوئی وہ مجھے یاد ہے۔ پہلے ہالوں میں نائی بال کاٹنے اور شیو بنانے کے لیے مقرر تھے انھوں نے اس طریقے کو ختم کر دیا۔

ذاکر صاحب کے آنے کے بعد مولانا آزاد کی رائے اور مشورے سے ۱۹۲۰ء کے یونیورسٹی ایکٹ کی جگہ ۱۹۵۱ء کا ایکٹ لایا گیا اس سے پہلے کے ایکٹ نے یونیورسٹی کو پورا سا اور جاگیرداروں کے ہاتھوں میں سونپ دیا تھا نئے ایکٹ میں یہ اثرات بہت کم کر دیے گئے اور یونیورسٹی کو ایک صحت مند راستے پر ڈالا گیا۔

علاوہ ازیں ۱۹۲۰ء کے ایکٹ میں جو دو ایک باتیں سیکولرازم کے منافی تھیں وہ ختم کر دی گئیں مثلاً غیر مسلم اب کورٹ کے ممبر ہو سکتے تھے۔ ایک تبدیلی اس ایکٹ کی رو سے یہ کی گئی کہ اگر کوئی مسلمان طالب علم چاہتا تو دینیات کے بجائے HISTORY OF CIVILIZATION لے سکتا تھا۔ اس کا استعمال تو دو چار سال میں کبھی ایک دو بار ہی ہوتا ہے، مگر اصولاً یہ امکان اس ایکٹ کی رو سے پیدا کر دیا گیا۔

<u>سیکولرازم۔</u> بنیادی تعلیم کی سفارشات کا ذکر پہلے آچکا ہے۔ وہ ان کا بہت بڑا کارنامہ ہے اگر MINUTES دیکھے جائیں تو معلوم ہوگا کہ اگر ذاکر صاحب ذرا ڈھیلے پڑ جاتے تو سیکولرازم کا خاتمہ بہت پہلے ہو گیا ہوتا۔ ابھی تو سانس چل رہی ہے، ہو سکتا ہے کہ مریض جانبر ہو جائے۔ غالباً اسی کو مد نظر رکھتے ہوئے اچاریہ کرپلانی نے ذاکر صاحب کے لیے کہا ہے کہ وہ ہمارے سیکولرازم کے معمار تھے۔ یہ پہلے کہا جا چکا ہے کہ ملک میں عام طور پر ایک سیکولر مزاج تھا۔ لیکن چیزیں واضح اور صاف نہیں تھیں۔ یہ عین ممکن تھا کہ مذہبی تعلیم دینے کی سفارش کر دی جاتی۔ کمیٹی میں تو یہ رائے اکثریت میں معلوم ہوتی تھی۔

ایک بات جو مجھے اچھی طرح یاد پڑتی ہے مگر مجھے یہ یاد نہیں کہ میں نے کہاں دیکھا، اور جس کا ذکر آچکا ہے، یہ ہے کہ یا تو اس صدی کی دوسری یا تیسری دہائی میں ذاکر صاحب نے اس بات کے خطرے کا اظہار کیا کہ مذہب کو سیاست سے نہ ملایا جائے۔ اس کو گھونٹا جائے۔ اگر یہ مل جاتی ہے تو پھر یہ ماننا پڑے گا کہ ان کی سیاسی بصیرت ان کے ہمعصروں سے زیادہ تھی۔

ان کا سیکولرزم یا اس بات سے بھی ظاہر ہے کہ جب وہ نائب صدر اور صدر تھے تو گو کہ وہ سب نمازیں پڑھتے تھے اور قرآن شریف کی تلاوت برابر کرتے تھے، وہ جمعہ کی نماز پڑھنے نہیں جاتے تھے۔ کبھی ان سے اس بات تو نہیں ہوئی مگر یقیناً اس کی وجہ یہ معلوم ہوتی ہے کہ ان کا یہ خیال تھا کہ ایک سیکولر ریاست کے نائب صدر یا صدر کو DEMONSTRATIVE WAY میں RELIGIOUS نہیں ہونا چاہیے۔[1]

ایک دفعہ کچھ مسلمانوں نے یہ سوچا کہ کانگریس کے سب مسلمان ایم۔ پی ایک گروہ بنا لیں اور کسی ایک طرف سودا (BARGAIN) کر کے ہو جائیں تو اس سے بڑا فائدہ ہوگا۔ ذاکر صاحب نے اس کی سختی سے مخالفت کی، جس کی وجہ سے یہ پلان ناکامیاب ہو گیا

۱۹۴۷ء میں جامعہ کا حال بہت ہی خراب ہو گیا۔ کوئی طالب علم نہیں رہا۔ ہر طرف آگ لگ رہی تھی اور قتل و غارتگری ہو رہی تھی اور کچھ ایسا معلوم ہو رہا تھا کہ شاید کوئی مسلمان مع ذاکر حسین خاں کے ہندوستان میں رہ سکے گا تو وہاں کے استادوں نے ذاکر صاحب سے پوچھا کہ ہم لوگ ایسے میں کیا کریں تو انھوں نے کہا کہ ہم پھول لگائیں تاکہ ہم اپنے بعد کے آنے والوں کو خوبصورتی کا سبق سکھائیں۔ اس سے پہلے ان کے جالندھر کے حادثے کا ذکر آ چکا ہے۔ ایسے تجربات کے بعد اپنا توازن قائم رکھنا ہر آدمی کے لیے ممکن نہیں ہے۔ یہ وہی کر سکتا ہے جو سیکولرازم کے عظیم ترین معماروں میں سے ہو۔

کبھی انھوں نے پرائیویٹ گفتگو میں بھی ذرا سی دیر کے لیے بھی کسی کوئی ایسی بات نہیں کہی جو سیکولرازم سے ہٹ کر ہو۔ میں تو کہوں گا کہ پنڈت نہرو کے لیے سیکولر ہونا آسان رہا ہوگا کیونکہ انھوں نے مذہب قریب قریب ترک کر دیا تھا۔ ذاکر صاحب نے ایسا کوئی کام نہیں کیا تھا۔ ان کو مذہب عزیز تھا اور ملک کی فلاح و بہبود کے ساتھ مسلمانوں کی فلاح و بہبود بہت عزیز تھی۔ کبھی لغزش ہو سکتی تھی۔ کچھ ایسا خیال پڑتا ہے کہ کبھی بہت [illegible] میں بیا ایک دفعہ کہا ہے کہ اگر اس طرح کا دشمنانہ رویہ رکھا گیا تو میں یہ کہنے پر مجبور ہو جاؤں گا کہ شاید مسلمانوں نے پاکستان ٹھیک بنایا۔ باقی وہ برابر سیکولرازم کی تلقین کرتے رہتے تھے۔

جیسا کہ میں نے اوپر کہا ہے کہ ان کو مسلمانوں کے مسائل سے دلچسپی اور ہمدردی تھی۔ اس کی بے شمار مثالیں ہیں۔ میں ایک بہت دلچسپ واقعہ سناتا ہوں:

"یہ بات ۱۹۶۷ء کی ہے جب وہ صدر تھے۔ میں کشمیر سے قریب ایک ماہ بعد واپس آیا۔ اس دوران عرب۔ اسرائیل جنگ ہو چکی تھی جس میں عربوں کو شکست فاش ہوئی تھی۔ میں بھی اس سے متاثر تھا۔ میں سفر سے آتے

---

[1] [illegible]

ہی سو گیا تھا۔ جیسے ہی اٹھا تو دیکھا کہ ذاکر صاحب میرے کمرے میں داخل ہوئے۔ ایسا واقعہ پہلی اور آخری بار ہوا بعد کو معلوم ہوا کہ وہ ملازمین سے کئی بار پوچھ چکے تھے کہ میں اٹھا یا نہیں۔ آتے ہی بولے کہ "مجھے فکر ہوئی تھی" اتنا کہنا تھا کہ آنسو نکل آئے اور وہ ویسے ہی آنکھوں پر ہاتھ رکھ کر واپس چلے گئے۔

یہ PAN-ISLAMISM نہیں تھا۔ آپ کو یاد ہوگا کہ ہماری تحریک آزادی نے، خاص طور پر گاندھی جی نے ہمیشہ واضح طور پر عربوں کا ساتھ دیا تھا۔ ان کو امپیریلزم کے خلاف جدوجہد کرنے والی سب قوموں سے ہمدردی تھی۔ عربوں سے یقیناً کچھ زیادہ رہی ہوگی۔

<u>تکمیلیت:</u> وہ چاہتے تھے کہ جو کام کریں وہ بہترین کریں ورنہ نہ کریں۔ دوسرے درجے کا کام کرنے کو وہ برا سمجھتے تھے۔ اسی لیے ان کو تقریر لکھنے میں بڑی الجھن ہوتی تھی اور وہ اس سے بہت کڑھتے تھے، ان کا موڈ خراب رہتا تھا کیونکہ وہ بہترین چیز لکھنا چاہتے تھے۔ ان کی تقریر بالکل آخر وقت تیار ہو پاتی تھی۔

تکمیلیت پسندی کے فلسفے کی وجہ سے ہی انھوں نے نسبتاً بہت کم تحریری مواد چھوڑا ہے۔ میں سمجھتا ہوں کہ میر نے اپنے ذیل کے شعر میں ان کے فلسفے کی خاصی ترجمانی کی ہے۔

خوش سلیقہ ہے ہر ایک امر میں عیب بھی کرنے کو ہنر چاہیے

<u>مذہبی افکار:</u> ان کے فلسفۂ حیات میں خاص دخل قرآن، صوفی، لبرل فلسفی، شاعر، آرٹسٹ اور گاندھی جی کو ہے۔ ان کے یہاں خوبصورتی مذہبی عقیدے کا ایک خاص عنصر ہے۔ وہ کہا کرتے تھے کہ خدا عظیم ترین خوبصورتی ہے۔

وہ خوبصورتی کے سچے دلدادہ تھے۔ وہ ان کی روحانی غذا تھی۔ وہ خوبصورتی آرٹ، سنگیت، رقص، رنگین پتھروں، پھولوں اور رحمن لانز وغیرہ میں دیکھتے تھے۔ لان پر مجھے ایک قصہ یاد آیا۔ راچی میں میاں کے ساتھ لان میں ٹہل رہا تھا۔ میں لان کی خوبی کے بارے میں اس وقت کچھ نہیں جانتا تھا۔ انھوں نے مجھ سے پوچھا یہ لان کیسا ہے۔ میں نے اپنے خیال میں معقول کہا کہ "اچھا خاصا ہے"، تو اس پر انھوں نے جھنجھلاہٹ سے کہا کہ اگر یہ اچھا خاصا ہے تو پھر اچھا کیا ہے۔

ان کے اسلام کے تصور میں ڈرامہ، سنگیت، اور رقص وغیرہ حرام نہیں تھا۔ شاید ان چیزوں کی خوبصورتی ان کا خدا سے سلسلہ ملاتی ہے۔ ان کے مذہبی افکار یقیناً عام لوگوں سے مختلف تھے گو کہ وہ مجموعی طور پر باقاعدہ شرع

تھے۔ ان کو FULLY PRACTICAL MUSLIM کہنے میں مجھے ذرا سا بھی تامل نہیں ہے۔ مجیب صاحب نے یہ بالکل صحیح لکھا ہے کہ ان کو نہ تو کٹر کہا جا سکتا ہے نہ غیر کٹر۔ ان کی شخصیت اور افکار ایسے تھے جن کو دو چار الفاظ میں یا دو اصطلاحوں کی مدد سے بیان کیا جا سکے اگرچہ ذیل کے شعر ان کے افکار کو سمجھنے میں کسی قدر مددگار ہوں گے:

ہیں ہر ایک مذہب میں کچھ کافر بھی کچھ دیندار بھی　　یاد رکھ تو بات یہ اک محرمِ اسرار کی
میں کب کہتا ہوں اے واعظ کہ میں نے رازِ دیں سمجھا　　فقط اتنا ہی سمجھا ہوں کہ تو بھی کچھ نہیں سمجھا

یہ بات ظاہر ہے کہ اس طرح کی مذہبی فکر رکھنے والا آدمی تنگ نظر نہیں ہو سکتا۔

قوم و ملت اور ہندوستانی نیشنلزم کا ان کا تصور: علما میں سب سے پہلے مولانا حسین احمد مدنی نے مدلل اور واضح طور پر یہ کہا کہ قوم اور ملت دو الگ چیزیں ہیں اور قوم کی بنیاد وطن ہے۔ اس بات کی بنیاد تو پہلے سے شیخ الہند مولانا محمود الحسن نے رکھی تھی مگر مدنی صاحب نے اس کو بہتر طریقے پر پیش کیا۔ اسی نقطہ نظر سے "متحدہ قومیت اور اسلام" نام سے ایک مختصر کتاب مولانا حسین احمد نے لکھی۔ تھوڑے ہی عرصے بعد اس کے جواب میں مولانا اقبال سہیل خاں نے لکھی ہیں انھیں سے کہہ سکتا ہوں کہ وہ ذاکر صاحب کے قوم و ملت کے بارے میں خیالات کی ترجمانی کرتی ہیں اس لیے چند اشعار پیش خدمت ہیں:

گفت وحدت گفت مرد سمر　　ملت از دین و قوم از وطن است
ہم روایت و دلیل این معنی　　ہم ز آیت ثبوت این سخن است

آگے چل کر حب الوطنی پر کہتے ہیں:

گر بباید بہ ملت آمیختن　　عین ایمان محبت وطن است
قوم ما ست ہر کہ ہست بہ ہند　　خواہ شیخ است و خواہ برہمن است

.　　.　　.　　.　　.　　.

مسلم و ہندو و ہنود و یہود　　گل و نسرین و لالۂ چمن است
ہر کہ گفت خلاف این معنی　　راہبر نیست بلکہ راہزن است
ہر کہ خاک افگند بہ دیدۂ حق　　خاک بر سر و خاک در دہن است

جیسا کہ بتایا جا چکا ہے، اقبال سہیل خاں علیگڑھ میں ذاکر صاحب کے ساتھی رہے تھے اور ذاکر صاحب

ان کی لیاقت، ذہانت اور قابلیت کے بہت قائل تھے۔ ذاکر صاحب نے کہا ہے کہ "علی گڑھ میں شعر اور تنقید ادب کے امام سہیل تھے"۔ رشید احمد صدیقی نے ان کے لئے کہا ہے "۔ اس زمانے میں علی گڑھ کی ادبی فضا پر ذوق چھائے ہوئے تھے، لیکن سہیل نے وقتاً فوقتاً ذوق پر ایسی کڑی اور کبھی استہزائیہ اور تفریحی تنقید کی اور غالب کی شاعرانہ عظمت کا ایسا سکہ بٹھایا کہ کالج میں ذوق کا کوئی حمایتی نہ رہا۔"

کہا جاتا ہے کہ سہیل صاحب کا جواب پڑھ کر محمد اقبال نے مولانا حسین احمد سے لکھ کر معافی مانگی اور ان اشعار کو مجموعہ سے خارج کرنے کی ہدایت کی، مگر اس پر عمل نہ ہوا۔ لیکن جیسا میں نے کہا ہے، اگر ایسا ہوا تو میرے خیال میں چار اشعار نہیں بہت کچھ اور بھی خارج کرنا پڑے گا۔

انڈین نیشنلزم پر ذاکر صاحب بالکل صاف طور پر UNITY IN DIVERSITY کے قائل تھے۔

اس کو حال میں ہمارے ای۔ کے۔ گجرال کی ایک تقریر نے واضح طور پر سمجھایا۔ مختصراً عرض ہے:

انگریزوں کے آنے سے پہلے ہندوستان بہت سی ریاستوں میں بٹا ہوا تھا۔ ایک شہنشاہ مغلیہ کے پاس تھا، لیکن پورے دربار کے علاقے خود مختار تھے۔ صرف مختصر عرصے کے لیے اشوک اور اورنگزیب کے زمانے میں تقریباً پورا ہندوستان ایک حکومت میں تھا۔ اس طرح ہندوستان میں نہ صرف یہ کہ مختلف مذاہب تھے، مختلف زبانیں تھیں بلکہ مختلف علاقوں کے تاریخی تجربات اور معاشی حالات بھی مختلف تھے

انگریزوں کے آنے کا جو ردِ عمل ہوا اس سے دو مکتبِ خیال پیدا ہوئے۔ ایک تو وہ تھے جنھوں نے DIVERSITY کا اعتراف کیا اور UNITY IN DIVERSITY کی بات کی۔ دوسرا مکتب وہ تھا جس نے ان فرقوں کو نظر انداز کیا اور پورے ملک کے سب خطوں کو یکساں ایک بنانے کی کوشش کی۔ ان دونوں مکاتب میں شروع سے رسہ کشی چلی آرہی ہے۔ کانگریس میں بھی دونوں مکاتب رہے ہیں، لیکن اوّل الذکر مکتب حاوی رہا ہے۔ اسی مکتب کے علمبردار گاندھی جی، پنڈت نہرو، ذاکر صاحب اور بہت سے اور لوگ ہیں۔

دوسرے مکتب کے لوگ اقلیتوں سے پوچھتے ہیں کہ بتاؤ کیا تم اپنی ملت کو مقدم سمجھتے ہو یا ملک کو۔ اس سے بدمزگی اور ناراضگی پیدا ہوتی ہے۔ یہ سوال بالکل ایسا ہے جیسا کہ بعض لوگ ناسمجھی میں بچوں سے پوچھتے ہیں کہ آیا ان کو ماں سے زیادہ محبت ہے یا باپ سے۔ اس سے بچے کی نفسیات پر بہت برا اثر پڑتا ہے۔ بچہ دونوں سے محبت کرتا ہے۔ یہی فطری بات ہے

کرنل بشیر حسین زیدی

○

میں نے کبھی اسے کوئی عیب بات نہیں سمجھا کہ وہ عمر میں مجھ سے بڑے تھے انھوں نے جامعہ ملیہ کیلئے جو کچھ کیا وہ عظیم تر تھا، بمقابلہ کسی کام کے جو میں کر پایا ہوں۔ اور جب میں نے علی گڑھ کو سنبھالا تو ذاکر صاحب کا وہ دور ختم ہو چکا تھا۔ میں ان کو بزرگ سمجھتا تھا۔ اس بنا پر نہیں کہ وہ گورنر ہوئے، وائس پریسیڈنٹ ہوئے اور پھر پریسیڈنٹ۔ میں انکو دیگر وجوہ کی بنا پر بزرگ سمجھتا تھا۔ میں ایک چھوٹی سی مثال دیتا ہوں۔

ڈاکٹر عابد حسین نے یہ سمجھ کر کہ تقسیم کے بعد مسلمانوں کی جو فکر ہے اس کو صحیح راستہ پر لگایا جائے، ایک اخبار نکالا "نئی روشنی" ایک دفعہ روپیہ کی کمی پڑ گئی یا بجٹ ختم ہو رہا تھا میں مدد نہیں کر سکا انھوں نے ذاکر صاحب کو لکھا کہ روپیہ چاہئے ورنہ اخبار بند ہو جائیگا۔ ذاکر صاحب نے جواب لکھا کہ یونیورسٹی تو آپ کی مدد کر نہیں سکتی اور ذاکر حسین کو تو آپ جانتے ہی ہیں کہ مالی اعتبار سے اس کی کیا حیثیت ہے۔ لیکن ہاں، میں نے چھوٹی لڑکی کی شادی کے لیے تین ہزار روپے بچا کر رکھ چھوڑے ہیں۔ وہ میں بذریعہ ڈرافٹ آپ کو بھیج رہا ہوں۔ انھوں تین ہزار روپیہ کا ڈرافٹ عابد صاحب کو بھیج دیا۔ میں نے ایسا کوئی کام اپنی زندگی میں نہیں کیا کہ اپنی بیٹی کی شادی کی رقم کسی کو اٹھا کے دیدی ہو۔ یہ چھوٹی بات ہے، لیکن میرے لیے بڑی بات ہے۔ اگر ذاکر صاحب مجھے اپنے برابر نہیں سمجھتے تھے تو مجھ کو کوئی شکایت نہیں کیونکہ میں ان کے برابر تھا ہی کب! اگر مجھے برابری کا دعویٰ ہوتا تو پھر کوئی شکایت ہوتی۔

ایک صاحب جو اپنے زمانے میں ہندوستان میں کافی مشہور تھے اور کہتے تھے کہ میں بجائے خود یونیورسٹی ہوں۔ ہمارے مذہبی قسم کے Intellectuals میں بڑے مشہور آدمی تھے۔ میں نام اکثر بھول جاتا ہوں۔ وہ ایک بار قرول باغ ذاکر صاحب کے یہاں پہنچے جبکہ ان کی پچاس روپیہ ماہانہ تنخواہ تھی۔ وہ بھی کبھی ملتے تھے، کبھی نہیں

ملتے تھے۔ انھوں نے ڈاکٹر صاحب سے کہا: میں ایک سوال لے کر آیا ہوں۔ کہا' فرمائیے کہا' مجھے پچاس روپیہ فوراً چاہئیے۔ ڈاکٹر صاحب کو بخار ہے' بیمار پڑے ہیں۔ انھوں نے کہا مولانا! اس وقت میرے گھر میں شاید صرف پندرہ بیس روپئے ہوں۔ یہ حاضر ہے۔ جتنی کہئے دیتا ہوں۔ پچاس تو میرے پاس ہیں نہیں۔ کہنے لگے' ٹھیک ہے' اب چونکہ میری زبان سے پچاس نکل گیا ہے' اور میں نے پچاس کا سوال کیا ہے تو اب میری توہین ہوگی' اگر میری وہ بات پوری نہ ہو اگر میری زبان سے پچاس نکلا ہوتا تو آپ مجھے پانچ دیدیتے' لیکن اب کیا کروں' میں تو پچاس کہہ چکا ہوں۔ کہا مولانا' اگر یہ ہو تو؟ کہنے لگے' آپ منگائیے کہیں سے اپنے دوستوں سے' ساتھیوں سے' انتظام کیجئے' چنانچہ انھوں نے اپنے دوستوں کو بلایا اور کہا کہ بھئی یہ پچاس روپے پورے کردو۔ چنانچہ پچاس روپئے پورے کئے گئے اور انھیں دیئے گئے۔ اور وہ بہت بڑے آدمی تھے۔ ان کا نام بتاؤں تو آپ حیران رہ جائیں گے مگر نام یاد نہیں آرہا۔

مولانا عبدالماجد دریابادی کو میں کبھی معاف نہیں کروں گا' کیونکہ انھوں نے ڈاکٹر صاحب کے خلاف ہمیشہ لکھا اور ہمیشہ کہا بھی اپنے "صدق جدید" میں۔ جی ہاں "صدق جدید" میں وہ اکثر ڈاکٹر صاحب کے متعلق لکھا کرتے تھے۔ میرے نزدیک ان کی یہ بات ناقابل معافی ہے کہ ڈاکٹر صاحب کے انتقال کے بعد بھی انھیں بُرا لکھا۔ خیر' وہ ایک بار علی گڑھ تشریف لائے جب ڈاکٹر صاحب وائس چانسلر تھے۔ وہ ملے اور کہا "ڈاکٹر صاحب! مسلم یونیورسٹی میں اسلام کے خلاف عمل ہوتے ہوئے دیکھتا ہوں تو مجھے دلی رنج ہوتا ہے۔ اور آپ اس کے وائس چانسلر ہیں۔ آپ کو شرم آنی چاہئیے۔ پوچھا' کیا چیز خلاف اسلام دیکھ رہے ہیں آپ؟" کہنے لگے کہ "آپ کے یہاں لڑکے گاتے ہیں؟" جی ہاں وہ گاتے ہیں۔ کہنے لگے: "آپ اس کو جائز سمجھتے ہیں؟" فرمایا "مولانا! مسلم یونیورسٹی کا مفتی میں ہوں' آپ نہیں۔ میرے فتویٰ کے مطابق وہ گاتے ہیں۔" کہا کہ "لاحول ولاقوۃ۔" بہت نالاں تھے وہ عبدالماجد دریابادی کہ جن کی جہالت کے حالات لوگوں کو معلوم ہیں اور جو آدمی بر خود غلط ہو' اور اپنے آپ کو سمجھتا ہو کہ روحانیت میں اس کو اعلیٰ مقام حاصل ہے۔

[علما میں] بعض لوگ مستثنیٰ ہیں' مثلاً مولانا سعید احمد اکبر آبادی کو میں نے دیکھا کہ وہ بچے ہوئے ہیں اس سے۔ اور بہت حد تک مولانا سید سلیمان ندوی بھی بچے ہوئے تھے۔ وہ بھی غرور' خود پسندی اور تعلّی سے محفوظ تھے۔ لیکن یہ لوگ مستثنیات میں سے ہیں۔ ڈاکٹر صاحب کی ایک دو باتیں اور آپ کو سنا دوں۔

تقسیم ہند ہوگئی' اور نواب اسماعیل خاں ایکٹنگ وائس چانسلر ہوئے۔ میں جانتا تھا کہ ان کا کیا رویہ ہے۔

اور اندر سے وہ کیسے آدمی ہیں۔ یہ نئے حالات میں وہ علی گڑھ کو بچا سکیں گے اور اس کی صحیح خدمات کر سکیں گے
یا نہیں۔ چنانچہ میں نے مولانا سے جا کر عرض کیا کہ مولانا! علی گڑھ خطرے میں ہے۔ اس وقت نواب اسماعیل خاں کے
پاس چارج Temporarily ہے کیونکہ زاہد حسین صاحب جو محکمہ ریلوے کے اکاؤنٹنٹ جنرل تھے۔ گورنمنٹ آف انڈیا کے
وہ وائس چانسلر ہوئے، پھر پاکستان چلے گئے تو نواب صاحب چھتاری کے بعد انہوں نے چارج لیا ہے۔ لیکن میں سمجھتا ہوں
کہ موجودہ حالات میں اگر کوئی یونیورسٹی کو بچا سکتا ہے اور نئے حالات میں اس کا ماحول سازگار بنا سکتا ہے تو وہ ذاکر حسین
ہیں۔ کہنے لگے "جامعہ کا کیا ہوگا؟" میں نے کہا "جامعہ کی روایات جو رہی ہیں تو ملک جامعہ کے خلاف نہیں ہے۔ جامعہ کو وہ
پاکستان کا ایجنٹ نہیں سمجھتے ہیں۔ لہٰذا جامعہ کی فکر نہ کریں آپ۔ علی گڑھ کی فکر زیادہ کرنی چاہیے اور اگر آپ ذاکر صاحب
سے کہیں گے، میرے کہنے سے تو راضی نہیں ہوئے، لیکن آپ کے کہنے کو شاید وہ نہ ٹال سکیں گے۔ آپ ان کو مجبور کریں۔"
مولانا نے ذاکر صاحب کو بلایا اور میرے خیال میں شاید ایک سے زیادہ مرتبہ بلانا پڑا، اور بڑی مشکل سے آخر میں ذاکر
صاحب تیار ہوئے لیکن مولانا نے کہا کہ یہ بتاؤ کہ جیت بھی جائیں گے؟ میں نے کہا جناب! اس میں مجھے بھی شک ہے کیونکہ
جو کورٹ ہے وہ تو آٹوکریٹ ہے۔ اس وقت وائس چانسلر کا انتخاب کورٹ کرتا تھا۔ اب تو صورت مختلف ہے
کیسے لگے یہ؟ ذاکر صاحب نے وعدہ تو کر لیا ہے۔ اب تم نے بات اٹھائی ہے تو تم ذمہ داری لو، کرو کچھ۔ میں نے کہا
جی ہاں! میں سوچ کر کروں گا۔ میں مولانا کے پاس گیا اور کہا کہ مولانا ایک تجویز میرے ذہن میں آئی ہے، اگر آپ مدد
فرمائیں تو میرے خیال میں اس کا اچھا اثر ہوگا۔ میں نے کہا ریاست حیدرآباد کو ممبران کی سیٹ دیے گئے ہیں وہ بھی
ملک حیدرآباد کا، اور ان میں شاید ایک بھی کمی نہیں ہے۔ پولیس ایکشن ہو چکا ہے۔ جنرل چودھری ایڈمنسٹریٹر ہیں۔ اگر
سردار پٹیل چودھری سے یہ کہہ دیں کہ ان حضرات سے آپ کہیے، وہ تشریف لے جائیں علی گڑھ جا کر ذاکر صاحب کے لیے
ووٹ دیں اور ان کے لیے پلین میں آپ ریزرویشن کرا دیجیے اور وہ سیدھے دہلی لوٹ آئیں، اور کرنل
زیدی نے ان کے قیام کا انتظام کر دیا ہے تو وہ زیدی کو contact کر لیں۔ چنانچہ یہ ساری کارروائی ہو گئی۔ وہ لوگ آ
آ گئے۔ میں ان سب کو گھر کے علی گڑھ لے گیا۔ میں اور وہ سب حیران تھے کہ حیدرآباد کے لوگ کبھی نہیں آتے تھے،
یہ کیسے آ گئے؟ لوگوں نے کہا، "بھئی! بارے میں تو گورنمنٹ کا پوائنٹ آف ویو معلوم ہو گیا کہ گورنمنٹ آف
انڈیا اس قدر معاون ہے کہ ان آدمیوں کو حیدرآباد سے بھیجا ہے کہ ذاکر صاحب کو ووٹ دیں۔ لہٰذا ہم تو ان لوگوں
میں سے ہیں کہ کل تک ہم کہتے تھے کہ پاکستان ہو کے رہیں گے اور اب ہم یہ کہتے ہیں کہ ہم ہندوستان کے حلیف، وفادار
ہیں، کیونکہ ہم تو سورج پرست ہیں۔ لہٰذا لوگوں میں بے چینی ہوئی اور اب کچھ صاحبان ووٹ کیلئے تیار ہوئے۔

ہاں، تو نواب اسمٰعیل خاں نے کہا "میں بھی امیدوار ہوں چنانچہ لوگ گئے" ان سے کہا۔ انھوں نے کہا میں With Draw نہیں کروں گا۔ ذاکر صاحب نے کہا کہ بھئی وہ With Draw نہیں کرتے تو معاملہ بڑا نازک ہے۔ پتہ نہیں کیا ہو۔ مجھے تو اپنی سبکی کی پرواہ نہیں ہے لیکن ملک پر اس کا کیا ردعمل ہوگا۔ مولانا کیا کہیں گے؟ جواہر لال کیا کہیں گے؟ خیر کافی خوشامد درآمد کی انتہا کر دی اور بڑی مشکل سے نواب اسمٰعیل خاں نے With Draw کیا۔ ذاکر صاحب اب تنہا رہ گئے، چنانچہ الیکشن ہو گیا کم سے کم پچاس ممبر ہو گئے۔ تو ذاکر صاحب کا تقرر ہوا۔

ذاکر صاحب سے میری پہلی ملاقات اس وقت ہوئی جب جامعہ دہلی آئے تھے۔ اس سے پہلے میری کوئی ملاقات نہیں تھی، کیونکہ ذاکر صاحب علی گڑھ کی پیداوار ہیں اور میں دہلی کی۔ میں علیگ نہیں ہوں۔ جب ذاکر صاحب دہلی آئے ان کے ساتھ عابد حسین بھی تھے، اور جو سب سے زیادہ کو مس کرنے والی تھی اور ملانے والی، وہ خواجہ غلام السیدین تھے کہ وہ بھی ۱۹۲۵ء میں آ چکے تھے۔ تو سیدین صاحب کے ساتھ میں ان سے ملا اور پھر جب کبھی دہلی آتا تھا ان سے ملنے جاتا تھا۔

ذاکر صاحب ایک بار اپنی رائے سے شنکر اچاریہ کے پاس BLESSING کے لیے گئے، بشپ آف دہلی کے پاس گئے، گاندھی سمادھی گئے۔ میں نے ان سے پوچھا کہ آپ کسی مسلمان کے پاس نہیں گئے؟ تو کہنے لگے' اس کا نام بتا دیجیے میں کس کے پاس جاؤں؟ میں نے کہا یہ تو آپ کا کہنا ٹھیک ہے میں کوئی نام تو نہیں بتا سکتا۔ اگر مولانا حفظ الرحمٰن زندہ ہوتے تو میں کہتا کہ آپ حفظ الرحمٰن کے پاس جائیے، لیکن وہ نہیں رہے۔ اب اور کوئی نہیں جس کا نام میں لوں۔ لیکن یہ کیا ضروری ہے کہ آپ زندہ کے پاس جائیں۔ آپ قطب صاحب کے یہاں جاتے آپ نظام الدین صاحب کے یہاں جاتے ان کا خیال نہیں آیا۔ میں نے کہا ذاکر صاحب یہ بڑی بھول ہو گئی، اگر کوئی مسلمان زندہ نہیں تھا تو آپ مردہ کے یہاں جاتے۔ اور یہ ذاکر صاحب کی انسانی اور سیاسی غلطی تھی، جس پر آپ بجا طور پر انھیں مورد الزام ٹھہرا سکتے ہیں ذاکر صاحب کے پاس اس کی کوئی معقول وجہ نہیں تھی۔ مجھے بڑا صدمہ ہوا کہ ذاکر صاحب جیسے سمجھ بوجھ کے آدمی سے یہ حرکت کیسے ہوئی۔ مجھے اس پر کوئی اعتراض نہیں ہے کہ وہ کیوں گئے۔ ضرور جانا چاہیے، لیکن یہ کہ وہ کسی مسلمان کے پاس نہیں گئے۔ پھر ایک مردے کے یہاں بھی وہ گئے تھے گاندھی سمادھی تو وہ کسی مسلمان کے پاس بھی جا سکتے تھے۔ ان کے پاس کوئی جواز نہیں تھا۔ آخر "الانسان مرکب من الخطاء والنسیان"۔

جن حالات میں انھوں نے علی گڑھ چھوڑنے کا فیصلہ کیا اور اپنے اوپر ایک حالت طاری کر لی وہ ان کا عمل بالکل غلط تھا۔ میں تو ایگزیکیوٹو کاؤنسل کا ممبر تھا ہی اور وہ شروع سے چاہتے تھے کہ میں ایگزیکیوٹو کاؤنسل میں رہوں اور ان کی کچھ مدد کر سکوں۔ اور پھر رام پور کا چیف منسٹر ہونے کے بعد ایک دفعہ میں نے کہا چلیے بھئی

کا وقت ہو گیا۔ کہنے لگے میں نہیں جاؤں گا۔ میں نے کہا صاحب! پروفیسر گِب نے چھٹی کی درخواست دی ہے جس کی
بیجا مخالفت کی جا رہی ہے۔ کہنے لگے، میں نہیں جاؤں گا۔ آپ جائیے اور مہربانی کرکے چھٹی قبول کرائیے۔ میں نے
بہت کہا نہیں گئے، روٹھ گئے۔ اب گِب ان کے فیورٹ تھے اور وہ بہت چالاک آدمی اور اس کا نہایت
Dictatorial attitude تھا۔ اس نے وائس چانسلری کے زمانے میں کافی پریشان کرنا چاہا، کیونکہ وہ
پنڈت جی کا بھیجا ہوا تھا۔ پنڈت جی نے کہا تھا کہ "یہ بہت اچھا آدمی ہے۔ میں تمہیں دیتا ہوں"، تو ڈاکٹر صاحب نے اس
کو رکھا۔ حالانکہ اگر وہ بدسلوکی کرتے تو انھیں یہ حق تھا کہ وہ جا کر کہتے کہ آپ نے جو آدمی دیا ہے وہ ایسے تو
بہت اچھا ہے، لیکن اس کی بعض باتیں بری ہیں، آپ ذرا اس کو سمجھا دیجیے۔ مگر انھوں نے ایسا کبھی نہیں کیا،
پھر تو گِب نے یہ چالاکی کی کہ وہ جماعت اسلامی کا لیڈر ہو گیا، ان معنوں میں کہ اس وقت دو پارٹیاں تھیں، ایک
کمیونسٹ اور ایک مسلمان۔ گِب نے انتہائی تعصب کے ساتھ کمیونسٹوں کا مقابلہ کرنا شروع کیا۔ مسلمان فدا ہو گئے
اور کمیونسٹ اس کے دشمن ہو گئے۔ پھر کمیونسٹوں نے اس کے ساتھ ڈاکٹر صاحب کو بھی لے دھرا کہ وہ گِب سے
ملتے ہیں اور جا بیجا اس کی خوشامد کرتے ہیں۔ اس نے یہ کام کیا، وہ کام کیا، اور ڈاکٹر صاحب نے اس سے جواب
طلب نہیں کیا۔ لہٰذا ڈاکٹر صاحب عمر بھر مسلمانوں سے بیزار ہی رہے۔ میں تو ان سے روز کا ملنے والا تھا۔ وہ
مسلمانوں سے بددل اور چڑ گئے تھے۔ وہ جو پہلا لفظ میں نے استعمال کیا، اس سے بہتر لفظ یہ ہے کہ مسلمانوں سے
انھیں چڑ ہو گئی تھی۔ کیا بتاؤں کیوں ہو گئی تھی۔ چھوٹی چھوٹی باتیں ہیں جن سے اندازہ ہوگا آپ کو۔ اب وہ علی
چھوڑ کر آ گئے، اور وہ جامعہ ملیہ میں اپنے گھر میں رہنے لگے۔ مجیب صاحب جن کو وہ وائس چانسلر
کی حیثیت سے منتخب کر گئے تھے، سامنے ان کا گھر تھا۔ اب وہ روزانہ آ کر ڈاکٹر صاحب سے ادھر ادھر کی باتیں
کرتے تھے۔ جرمنی میں برسوں ساتھ رہے۔ ۶ مہینے ڈاکٹر صاحب رہے اور اس چھ مہینے میں روزانہ ڈاکٹر صاحب سے
ملاقات ہوتی رہی، لیکن لفظ "جامعہ" کبھی گفتگو میں نہیں آیا۔ جو نئے لوگ جامعہ میں آ گئے تھے، وہ ڈاکٹر صاحب
کے مداحوں میں نہیں تھے اور ڈاکٹر صاحب کو اس کا احساس تھا۔ مسلمان ان سے جو توقع کرتے تھے کہ وہ یوں کہیں
اور یوں کریں، ویسی وہ نہ کہتے تھے اور نہ کرتے تھے۔ اس لیے مسلمان ان سے خوش نہیں تھے۔ یہ لفظ جو میں نے
استعمال کیا ہے کہ وہ مسلمانوں سے "چڑ" گئے تھے، بالکل صحیح ہے۔ مرتے وقت تک یہی کیفیت تھی جب پریسیڈنٹ
شپ کے لیے ان کا نام تجویز ہوا تو میرے علم میں نہیں ہے کہ کتنے مسلمان ان کے لیے بھاگ دوڑ کر رہے تھے کہ ان
کی کامیابی ہو۔ شاید مسلمان خوش ہوتے اگر وہ ہار جاتے۔ اب اگر یہ کہا جائے تو لوگ گوارا نہیں کریں گے کہ صاحب!

یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ ذاکر صاحب کے ہار جانے سے مسلمان خوش ہوتے لیکن مجھے تعجب نہ ہوتا اگر وہ خوش ہوتے
پھر کئی موقعوں پر انھوں نے مجھے یاد رکھا۔ اسی وائس چانسلر شپ کو چھوڑ دیئے۔ سب سے پہلے شاہ سعود نے
مدعو کیا، اور ہمارا ڈیلی گیشن گیا تو انھوں نے کہا کہ بھئی زیدی صاحب! آپ کو میرے ساتھ چلنا ہے۔ پھر وہ مجھے
ساتھ لے گئے۔ کسی کو نہیں لے گئے، مجھے لے گئے۔ جب انھوں نے ریٹائر کیا تو انھوں نے کہا کہ میرا جانشین صرف
زیدی ہو سکتا ہے۔ مولانا کو تامل تھا۔ کچھ لوگوں نے میری مخالفت کی مولانا سے۔ مولانا نے کہا کہ بھئی، وہ چل پائیں گے؟
ذاکر صاحب سینہ سپر ہو گئے، انھوں نے اصرار کیا کہ زیدی ہی جائیگا۔ یہ دوسرا موقع تھا۔ تیسرے یہ کہ جب وائس
چانسلری ختم کر کے میں دلی آیا تو میری کمپنی کا ایک مکان تھا۔ وہ مکان اچھی حالت میں نہیں تھا۔ میں نے اس میں کئی
ہزار روپیہ خرچ کر کے اس کو رینوویٹ کیا۔ اس میں ۵/۶ مہینے لگے۔ ذاکر صاحب نے کہا جب تک رینوویٹ ہو
آپ ہمارے ساتھ رہیے گا۔ انھوں نے مجھے اپنے گھر رکھا ۵/۶ مہینہ تک۔ یہ بھی ہوتا تھا کہ وہ ٹیلی فون کرتے تھے، کیا
کر رہے ہو۔ میں کہتا کچھ نہیں کر رہا ہوں، کہتے چپکے سے آجاؤں؟ میں نے کہا، میں آجاتا ہوں۔ کہتے نہیں نہیں میں آجاؤں
گا۔ میں نے کہا آجائیے تو وہ صرف ایک آدمی کو لے کر چپکے سے میرے یہاں آجایا کرتے تھے۔ یہ بھی مراسم تھے۔ پھر
سوال آیا پارلیامنٹ کا راجیہ سبھا کا الکشن در پیش تھا، تو اندرا گاندھی نے مشورے کے لیے کچھ لوگوں کو جمع کیا۔
ذاکر صاحب بھی نائب صدر کی حیثیت سے شریک تھے۔ اندرا گاندھی نے کہا ذاکر صاحب کوئی اچھا نام بتائیے کہا ہاں،
کرنل زیدی کہا ہاں، ہاں بہت بہتر نام ہے تو ذاکر صاحب کے کہنے سے مجھے راجیہ سبھا کا ٹکٹ مل گیا۔ اور میں راجیہ سبھا
میں آیا بس اس سے آگے کچھ نہیں۔ اس کی وجہ، آیا ذاکر صاحب میں کمی تھی کہ وہ دوست کی حمایت کریں اور اس
کو آگے بڑھائیں یا دوستوں نے ان کو یہ اندازہ دیا کہ وہ منسٹری کیلئے تیار نہیں ہیں میں انھیں یہ الزام کیوں دوں جبکہ
میں نے گھر کی ان سے یہ کہا ہو کہ ذاکر صاحب، منسٹر کی تنخواہ ۲۲ سو روپیہ ہے اور میں لعام ٹرسٹ کا
ٹرسٹی ہوں۔ دو ہزار وہاں سے ملتے ہیں۔ ایک ہزار رامپور کی پنشن ہے۔ تین ہزار تو یہ ہو گئے۔ میں کمپنی کا ڈائرکٹر
ہوں تو میری آمدنی ۱۰/۱۵ ہزار ہے، اور یہ سب ریزائن کرنا پڑے گا منسٹری میں شمولیت کے بعد تو مجھے کوئی لالچ نہیں
ہے منسٹری کا۔ ہاں تو چاہتا ہوں کوئی خدمت کر سکوں۔ کوئی کمسٹر کٹیو رول ہو جس میں، میں ملک و قوم کی خدمت
کر سکوں۔ میں نے کہا، منسٹری میں کیا رکھا ہے۔ بڑے بڑے گدھے منسٹر ہوئے اور آج ان کا نام بھی کوئی نہیں
جانتا۔ یہ بھی ہو سکتا ہے کہ انھوں نے یہ دیکھا کہ اس شخص کو کچھ خواہش ہی نہیں۔

●●

جناب خلیل الرب

وطن ضلع الٰہ آباد، پیدائش ۹ فروری ۱۹۱۵ء، گورنمنٹ انٹر کالج جھانسی سے ہائی اسکول پاس کرنے کے بعد ۱۹۳۲ء میں مسلم [illegible] مسلم یونیورسٹی میں داخل ہوا۔ نیشنلسٹ تحریک سے گہری وابستگی کے باعث یونیورسٹی سے اخراج ہو جانے پر ۱۹۳۶ء میں بی اے آنرز کرنے کے بعد یونیورسٹی کو خیرباد کہنا پڑا۔ ۱۹۳۹ء میں پرائیویٹ امیدوار کی حیثیت سے ایم اے کیا۔ محکمۂ تعلیمات میں مختلف حیثیتوں سے کام کرتے ہوئے ڈپٹی ڈائرکٹر ایجوکیشن کے عہدہ سے سبکدوشی حاصل کی۔ اس کے بعد تقریباً پانچ سال تک علی گڑھ مسلم یونیورسٹی ہائی اسکول کے پرنسپل کی حیثیت سے خدمت کی۔ [illegible] مستقل [illegible] کتب [illegible] [illegible] زندگی کا بیشتر [illegible] بیشتر [illegible] مصنف۔
اردو اکادمی یوپی کے ممبر رہ چکے ہیں۔ اس وقت انجمن ترقی تعلیم [illegible] علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کورٹ کے ممبر ہیں۔
اردو کے مسائل اور تعلیم سے متعلق [illegible] کے علاوہ مختلف درجات کے لیے اردو کی درسی کتب تالیف کیں۔ یہ کتابیں یوپی کے علاوہ [illegible] تقسیم [illegible] کتابیں لکھی [illegible] تعلیم کے مسائل [illegible] اردو [illegible] میں رائج ہیں۔

ڈاکٹر ذاکر حسین صاحب سے متعلق چند ذاتی یادیں میری زندگی کا گراں قدر سرمایہ ہیں۔ یہ بات ۱۹۳۶-۳۷ء کی ہے۔ مسلم یونیورسٹی علی گڑھ کے اختتامی سیشن پر ۲۵ طلبہ کے ساتھ مجھے بھی یہ نوٹس ملا کہ اگلے سیشن سے یونیورسٹی میں ہمارا داخلہ نہیں ہوگا۔ اس نادر شاہی حکم کی کوئی وجہ نہیں بتائی گئی تھی، لیکن وجہ ظاہر تھی۔ ہمارا تعلق آزاد خیال اور قوم پرور طلبہ کی اس مختصر مگر فعال جماعت سے تھا جو اسٹوڈنٹس فیڈریشن سے الحاق رکھتی تھی اور مسلم اسٹوڈنٹس فیڈریشن سے جس کو یونیورسٹی کے ارباب بست وکشاد کی حمایت حاصل تھی، معرکہ آرا رہتی تھی۔ جہاں تک میرا معاملہ ہے، میں عملی طور پر زیادہ فعال اور سرگرم تو نہیں تھا مگر باز پرس کے لیے یہ جرم کیا کم تھا کہ میرا کمرہ ۴۴ ممتاز ہاؤس نیشنلسٹ طلبا کی آماجگاہ بنا ہوا تھا، اور میں قوم پرور عناصر سے گہری ذہنی وابستگی رکھتا تھا۔ مجھ سے پہلے علی سردار جعفری اور قاضی جلیل عباسی کا بھی اس وقت ایم۔ اے ہی میں یونیورسٹی سے اخراج ہو چکا تھا۔ میں نے اپنے مشفق اساتذہ سے درخواست کی کہ وہ مجھے یونیورسٹی میں صرف ایک سال کے قیام کی مہلت دلا دیں تاکہ میں اپنا ایم اے مکمل کر لوں مگر وہ اس معاملہ میں میری مدد کرنے میں معذور نظر آئے۔ میں فیصلہ نہیں کر پا رہا تھا کہ اب کیا کروں۔ بالآخر میں نے الٰہ آباد یونیورسٹی میں داخلہ لے لیا، اور ڈاکٹر کنور محمد اشرف کے ساتھ، جو اس وقت آل انڈیا کانگریس کمیٹی سے وابستہ مسلم عوامی رابطہ تحریک کے

انچارج تھے، سرگرمی سے کام کرنے لگا۔ جب سالانہ امتحان کا نتیجہ نکلا تو میرا نام کامیاب امیدوار کی فہرست میں نہیں
تھا۔ چونکہ میں پڑھنے لکھنے میں کافی اچھا تھا، اس لیے قدرتی طور پر اس ناکامی سے سخت ندامت اور دلگیری ہوئی لیکن
مایوسی کے اس اندھیرے میں روشنی کی ایک کرن نظر آئی۔ مجھے پتہ چلا کہ ڈاکٹر ذاکر حسین خاں الٰہ آباد آئے ہوئے ہیں اور
ڈاکٹر عبادالرحمٰن خاں کے یہاں مقیم ہیں۔ ڈاکٹر عبادالرحمٰن خاں علی گڑھ میں میرے پرووسٹ رہ چکے تھے۔ وہ اپنے
ڈیپوٹیشن کی مدت ختم کرکے محکمۂ تعلیمات یوپی میں واپس آگئے تھے اور اس وقت آچاریہ نریندر دیو تعلیمی کمیٹی کے
سکریٹری کی حیثیت سے اپنی رپورٹ مکمل کر رہے تھے۔ اس کمیٹی کی سفارش کی رو سے ایک بیسک ٹریننگ کالج الٰہ آباد میں
کھلنے والا تھا، اور عبادالرحمٰن خاں اس کے پرنسپل مقرر ہونے والے تھے۔ میں ذاکر صاحب سے ملا اور اپنی پریشانی کی
داستان انھیں سنائی۔ انھوں نے مسکرا کر مجھ سے پوچھا کہ میرا مقصد تعلیم کیا ہے۔ میں نے عرض کیا کہ میں سرکاری ملازمت
نہیں کرنا چاہتا۔ میری خواہش تھی کہ یونیورسٹی میں استاد ہوں یا قانون پاس کرکے وکالت شروع کردوں، لیکن نہ تو ایم اے
مکمل کرسکا اور نہ لا پریویس میں کامیاب ہوا۔ انھوں نے غور سے میری بات سن کر مشورہ دیا کہ آپ چاہیں تو بیسک ٹریننگ
کالج میں داخلہ لے لیں۔ ملک آزاد ہونے والا ہے۔ محکمہ تعلیمات میں داخل ہوکر بھی آپ کو ملک و قوم کی خدمت
کے مواقع ملیں گے۔ ان کا یہ مشفقانہ مشورہ میں نے قبول کرلیا۔ اور ان کا شکریہ ادا کرکے ان سے رخصت چاہی۔

اب میں ڈاکٹر کے ایم اشرف کے پاس آیا اور ان سے ڈاکٹر ذاکر حسین خاں کی ملاقات اور ان کے مشورہ کا
ذکر کیا۔ اس وقت گورنمنٹ آف انڈیا ایکٹ آگیا تھا اور ملک کے سات صوبوں میں پہلی کانگریسی وزارتیں بن چکی تھیں۔
ڈاکٹر اشرف کا ایک خط لے کر میں سمپورنانند جی سے ملا جو اس وقت گووند ولبھ پنت کی وزارت میں وزیر تعلیم مقرر
ہوئے تھے۔ انھوں نے مجھے بیسک ٹریننگ کالج میں داخلہ دے دیا۔ اگست ۱۹۳۸ء میں کالج شروع ہوا۔ ایک ماہ بعد ہی
ستمبر میں یونیورسٹی سے غلط نامہ نکلا، اور میں لا میں پاس تھا۔ وقتی طور پر میں پھر سخت ذہنی کشمکش میں مبتلا ہوگیا کہ دو
متبادل راہوں میں سے زندگی کے لیے کون سی راہ منتخب کروں۔ بالآخر میرے دل نے ذاکر صاحب کے مشورہ پر عمل کرنے
کے حق میں فیصلہ دیا۔ سیشن ختم ہوا۔ پریکٹکل امتحان لینے کے لیے ذاکر صاحب ممتحن ہو کر آئے۔ ظاہر ہے کہ ہندستان
کے پہلے بیسک ٹریننگ کالج کے پہلے امتحان کے لیے ان سے موزوں تر کون شخص ہوسکتا تھا۔ شام کے وقت ڈاکٹر
عبادالرحمٰن خاں کے بنگلہ پر ذاکر صاحب کی خدمت میں حاضر ہوا۔ بڑی محبت سے ملے اور میرا حال دریافت
کرکے اطمینان کا اظہار کیا۔ میں اسے اپنے لیے باعث سعادت سمجھتا ہوں کہ ذاکر صاحب میرے ممتحن تھے۔

اپریل ۱۹۴۵ء میں پھر امیدوار کی حیثیت سے علی گڑھ مسلم یونیورسٹی سے ایم۔ اے فائنل کا امتحان دے

کر میں اپنے احباب ڈاکٹر سلامت اللہ اور عتیق صدیقی مرحوم سے ملنے جامعہ ملیہ اسلامیہ گیا۔ ذاکر صاحب کی خدمت میں حاضر ہو کر اپنا نذرانۂ عقیدت پیش کیا ان کے قوی حافظے نے فوراً میری شناخت کر لی۔ موصوف نے از راہ نوازش میرے حالات دریافت کیے اور میری فرمائش پر اپنی ایک تصویر دستخط کر کے مجھے عنایت کی پرنسپل ٹیچرز ٹریننگ کالج مکرمی سعید انصاری مرحوم نے "یوپی میں بنیادی تعلیم" کے عنوان پر میری تقریر کا اہتمام کیا۔ سہ پہر کی یہ تقریب ٹیچرز ٹریننگ کالج اور ابتدائی مدرسے کے اساتذہ پر مشتمل تھی۔ تقریر کے دوران ذاکر صاحب جو اس وقت شیخ الجامعہ تھے، کمرے میں خاموشی سے داخل ہوئے اور پیچھے بیٹھ گئے۔ حاضرین کے اصرار پر بھی وہ آگے تشریف نہیں لائے اور اپنی جگہ سے ہاتھ ہلا کر خاموش رہنے کا اشارہ کیا۔ اس تقریب میں ذاکر صاحب کی غیر متوقع اچانک شرکت نے مجھے کسی قدر سراسیمہ کر دیا۔ ذاکر صاحب اس وقت ایک ماہر تعلیم کی حیثیت سے قومی شہرت حاصل کر چکے تھے۔ اپنے تعلیمی خیالات کو عملی جامہ پہنانے کے لیے گاندھی جی کی مردم شناس نظر انتخاب ذاکر صاحب پر پڑی تھی۔ ان کی سرکردگی میں ذاکر حسین کمیٹی رپورٹ مرتب ہو چکی تھی جس نے پہلی بار قومی تعلیمی پالیسی کی شکل میں بنیادی تعلیم کے خدوخال پیش کیے تھے۔ ایسے بلند مرتبت استاد اور ماہر تعلیم کی موجودگی میں ایک مبتدی مقرر کا سراسیمہ ہو جانا قدرتی امر تھا۔ ذاکر صاحب نے اس صورت حال کو محسوس کر لیا اور مشفقانہ انداز میں اپنی تقریر جاری رکھنے کو کہا۔ تقریر کے اختتام پر صاحب موصوف نے چند تعریفی کلمات سے میری حوصلہ افزائی کی اس کے بعد بنیادی تعلیم کے متعلق گفتگو ہونے لگی۔ ربط مضامین کے اصول پر بات چلی تو ایک صاحب نے سوال کیا کہ اصول ربط کے ذریعہ بچوں کو صفر کیسے پڑھائیں گے ذاکر صاحب ہنستے ہوئے بولے، یہ تو بہت آسان ہے میرے سامنے پلیٹ میں دو رس گلّے رکھے ہیں۔ ایک رس گلا میں نے منہ میں ڈال لیا تو پلیٹ میں ایک رس گلا باقی رہا۔ اسے بھی منہ میں رکھ لیا۔ اب پلیٹ میں کچھ نہیں بچا بس یہی صفر ہے۔

ماہ و سال گزرتے گئے، کئی دہائیاں بیت گئیں ذاکر صاحب اپنی خداداد صلاحیتوں اور لیاقت کی بدولت شہرت و اعزاز کے منازل طے کرتے رہے۔ اس طویل عرصے میں کبھی شرف نیاز حاصل نہیں ہوا ۱۹۶۴ء کے اواخر میں دارالمصنفین اعظم گڑھ (شبلی اکاڈمی) کا جشن طلائی نہایت اعلیٰ پیمانے پر منایا گیا۔ ذاکر صاحب جو اس وقت نائب صدر جمہوریہ تھے۔ اس جشن کے مہمان خصوصی تھے۔ راقم الحروف اس وقت اعظم گڑھ میں ڈسٹرکٹ انسپکٹر آف اسکولز کے عہدے پر تعینات تھا۔ میرے کرم فرما شاہ معین الدین صاحب مرحوم اور محب مکرم صباح الدین عبدالرحمٰن صاحب کی ایما پر کتابوں کی نمائش کے ساتھ ساتھ کتب خانے کے اندر سے نادر

میں نے گلاب کے پھولوں کی ایک نمائش آراستہ کر دی تھی۔

اعلیٰ افسران اور معززینِ شہر کی جلو میں جب ذاکر صاحب اس سکشن میں پہنچے تو ان کا چہرہ خوشی سے کھل اٹھا۔ شاہ معین الدین صاحب سے تعجب آمیز لہجہ میں پوچھا، بھئی اتنے اعلیٰ قسم کے گلاب اعظم گڑھ جیسی چھوٹی جگہ میں کہاں سے آ گئے۔ شاہ صاحب نے یہ کہتے ہوئے مجھے آگے کیا کہ یہ سارا کرشمہ جلیل الرب صاحب کا ہے۔ انھیں پھولوں کا مذاق ہے۔ میں نے آگے بڑھ کر عقیدت سے ذاکر صاحب کو سلام کیا اور چند نئے اور عمدہ گلابوں کی طرف ان کی توجہ مبذول کرائی۔ پھولوں کی نمائش دیکھ کر پنڈال کی طرف بڑھتے ہوئے مجھ سے کہا کہ ان گلابوں کی کچھ قلمیں مجھے مل سکتی ہیں؟ میں نے عرض کیا کہ میرے لیے اس سے بڑھ کر فخر و مسرت کی کیا بات ہوگی کہ میرے بھیجے ہوئے گلاب ذاکر صاحب کے باغیچہ میں جگہ پائیں۔ اسی وقت میں نے یہ بھی عرض کیا کہ آپ کی عنایت کی ہوئی ایک تصویر بھی میرے پاس ہے۔ صبح آپ کو دکھاؤں گا۔ دوسرے دن صبح جب میں نے ان کو تصویر دکھائی تو ہنستے ہوئے بولے کہ یہ تو اس وقت کی تصویر ہے جب آتش جوان تھا۔

تیسرے دن صبح ذاکر صاحب کی روانگی کا وقت تھا۔ میں اپنے مکان پر کھانے کی میز پر بیٹھا ناشتہ کر رہا تھا۔ عالی

عدیل عباسی مرحوم میرے ساتھ ناشتہ کی میز پر تھے۔ اتنے میں ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ کا فون آیا۔ صاحب آپ کہاں ہیں۔ وائس پریسیڈنٹ صاحب آپ کو یاد کر رہے ہیں فوراً آئیے۔ ریسیور رکھ ہی رہا تھا کہ پھر گھنٹی بجی اس کی بار سپرنٹنڈنٹ پولیس کا فون تھا۔ میں گھبرا گیا کہ ایسی کیا خاص بات ہو سکتی ہے جو اس طرح میری طلبی ہو رہی ہے۔ میں تو خود ہی ناشتہ کر کے جانے والا تھا۔ عدیل بھائی سے معذرت کر کے میں نے جیپ منگوائی اور شبلی نیشنل ڈگری کالج پہنچا۔ کالج کے وسیع میدان میں خیموں کا شہر آباد تھا۔ ذاکر صاحب بھی ایک بڑے خیمہ میں ٹھہرے تھے۔ میں جب دربار ہال کے نزدیک پہنچا تو دیکھا کہ ذاکر صاحب بیچ ہال میں کھڑے خوش گپیاں کر رہے ہیں۔ پروفیسر محمد مجیب، ڈاکٹر یوسف حسین خاں، بشیر حسین زیدی صاحب، شاہ معین الدین صاحب، صباح الدین عبدالرحمٰن صاحب، ضلع کے اعلیٰ احکام اور شہر کے ممتاز افراد ان کے گرد حلقہ بنائے کھڑے تھے۔ میں نے سب کو سلام کیا۔ مجھے دیکھتے ہی ذاکر صاحب نے زیدی صاحب، اور یوسف حسین خاں صاحب کو مخاطب کرتے ہوئے کہا بھئی جلیل الرب صاحب نے کمال کر دیا۔ ان کے پاس تو ۱۹۲۱ء کے گلاب بھی موجود ہیں۔ اس کے بعد ایک بارگی میری جانب مڑے اور دلنواز لہجے میں پوچھا "آپ کا حافظہ کیسا ہے؟" میں اس اشارہ کا مطلب سمجھ گیا۔ میں نے مسکراتے ہوئے کہا کہ میرا حافظہ اس قسم کا واقع ہوا ہے کہ جو بات یاد رکھنے کے قابل ہوتی ہے وہ یاد رہتی ہے اور جو بات یاد رکھنے کے قابل نہیں ہوتی وہ حافظہ سے نکل

جاتی ہے۔ فرمایا "میری بات یاد رہے گی"، میں نے عرض کیا "بھلا آپ کی بات بھولنے والی ہے۔" حاضرین اس رمزیہ گفتگو سے محظوظ ہو رہے تھے۔ اس کے بعد ذاکر صاحب فرداً فرداً سب سے ہاتھ ملا کر رخصت ہوئے۔ جھنڈے کی سلامی ہوئی۔ ذاکر صاحب اپنی کار میں بیٹھے اور حکام کے کارواں کے ساتھ پارس کے ہوائی اڈے کو روانہ ہو گئے۔

میں نے گلابوں کی قلمیں تیار کرائیں، اور اعلیٰ قسم کے ایک درجن پودے ان کی خدمت میں ارسال کیے۔ ذاکر صاحب کا شکریہ کا خط آیا جس میں لکھا تھا کہ مجھے کوئی تحفہ اتنا عزیز نہیں ہے جتنا کہ گلابوں کا۔" یہ تھی ذاکر صاحب کی دلنواز شخصیت۔ ان کی تصویر اور اس خط کو میں نے بڑی احتیاط سے رکھا تھا۔ تصویر چونکہ البم میں تھی اس لیے محفوظ رہی، مگر خط نجی فائل میں محفوظ نہ رہ سکا جس کا مجھے افسوس ہے۔

●●

جناب عیاض انصاری

○

وہ گروپ جو ڈاکٹر ضیاء الدین صاحب کا تھا، وہ بیک ڈاکٹر ضیاء الدین کا مخالف ہو گیا اس سے
ذاکر صاحب کو یہ موقع مل گیا کہ ڈاکٹر ضیاء الدین کے خلاف کچھ مواد جمع کریں

حیدرآباد میں بہار کے گورنر کی حیثیت سے گئے اور اولڈ لوائز کا ریسیپشن ہوا اس میں کسی نے سوال کیا
تو اس کا یہ جواب دیا کہ کیا ہمیشہ ہی میرے ہاتھ میں بھیک کا پیالہ ہی رہے، یہ بھی ایک خدمت ہے، جو میں کر رہا ہوں

ان کی بزرگی کے سامنے میری خوردانہ حیثیت تھی۔ رشید صاحب کی شفقت بھی بالکل ایسی
ہی رہی میرے سامنے کہ انھوں نے مجھے طالب علم نہیں سمجھا بلکہ یہی سمجھا کہ یہ میرے دوست کا بھانجا ہے خود ذاکر صاحب
بھی یہی سمجھتے تھے۔ حاذق صاحب نے ابھی دوسری شادی کر لی۔ میرے خاندان کے لیے گویا سوہان روح تھی میں ان
صدمات کا شریک تھا۔ اسی شدت کے ساتھ۔ حاذق صاحب کو انھوں نے مجبور کیا کہ طلاق دو چھوڑ دو۔ یہ معاملہ کچھ دو
تین برس تک چلا۔ اس سلسلے میں ان سے بہت سے معاملات پر بہت سی گفتگوئیں ہوئیں۔ پھر آخر تھک گئے۔ ذاکر صاحب
نے لکھا، مگر انھوں نے نہیں مانا۔ میں بھی تھک گیا
میری شکل و صورت، میری پرسنالٹی اور میری وجاہت جو کچھ ہو، وہ اس سے متاثر ہوئے اور سب سے
بڑی بات یہ کہ جو انداز گفتگو تھا۔ اس سے زیادہ متاثر ہوئے کہا نہیں انھوں نے، انھوں نے کہا کہ بھئی ہم کو تو
تلاش ہے اور چاہتے ہیں کہ دلّی والا ہو، باہر کا ہو۔ انھوں نے یہ دیکھا کہ انٹرویو وغیرہ ہو رہے ہیں تو انھوں نے
ایک لیٹر INDIRECTLY اس کو لکھ دیا۔ اس کا اثر ہوا اس شخص پر۔ بخاری صاحب نے تو دیکھا بھی
نہیں تھا۔ اس نے مجھ کو خوش کر دیا۔ یہ بیک گراؤنڈ ہے۔ اس سلسلہ میں جو سب سے اہم بات ہے وہ یہ کہ میں حاذق صاحب

کا مجاہد ہونے کے باوجود، ذاکر صاحب کی سیاست جو علی گڑھ کی تھی، اس کا معاون ہو گیا۔ یہ محض ان کی شخصیت اور ان کی پرسنالٹی تھی۔ میں ہمیشہ اسی خاندان میں رہا ہوں۔ ان کا آنا، ان کی سادگی، تو میں ذاکر صاحب کا مخالف ہوا اور ذاکر صاحب کو، اب اصل بات کہہ رہا ہوں جو کہنے کی ہے کہ ہر کام کو وہ پورے طریقے سے، جسے عاقبت کہتے ہیں ہر کام کی، اس کی پوری عاقبت سوچ کر ہی کام کرتے تھے۔ چنانچہ انھوں نے جہاں یہ اندازہ کیا کہ اخبار نکالو 'علی گڑھ کے اولڈ بوائز کا' اور ڈاکٹر صاحب کے خلاف اس اخبار میں لکھا جائے۔ اب کون نکالے؟ بلی کے گلے میں گھنٹی کون باندھے؟ ذاکر صاحب نے کہا، کچھ حرج نہیں، عیاض کے نام سے نکال دیجیے۔ معلوم نہیں، کس طرح ان کی نظر تھی کہ وہ میرے انداز گفتگو سے یہ محسوس کر چکے تھے کہ یہ لڑکا   اس کے لیے کچھ لکھا جائے، کچھ کیا جائے۔ اس لیے یہ بھی ہونا تھا کہ ہم لوگ اب باقی چیز کے کارتوس اس کو دیے جائیں گے اور یہ داغتا رہے گا۔ اس سلسلے میں اخبار کا نام تجویز ہوا "علیگ"۔ کہیں اس کی کاپی لٹریٹ جائے، شاید پٹنہ میں ہو۔ ۴۲ صفحہ کا اخبار تھا دس سولہ تیس پرچے نکلتے تھے۔ وہ ۳۳-۳۲ ۱۹ء کا زمانہ تھا۔ ۱۹۳۴ء تک وہ رہا لیکن ۱۹۳۵ء میں شاید ہو یاد نہیں۔ ایک صاحب ہیں ہادی نقشبندی۔ ان کی بہت بڑی لائبریری ہے۔ وہ چونکہ یہاں طالب علم تھے، یہاں سلور تھے۔ ایسا ان کو شوق تھا۔ ہادی نقشبندی۔ مالابور۔ یہ ان کے پاس محفوظ ہے۔ انھوں نے مجھ سے ایک مرتبہ کہا تھا کہ میں نے فائل کرا لیا ہے۔ یہاں تھے، مگر ضائع ہو گئے۔ میرا معمول یہ تھا کہ میں ہفتہ میں ایک مرتبہ۔

۔یہی وہ زمانہ تھا صاحب اشرف یہاں تشریف لائے . . . ذاکر صاحب کے مخالفت کی اور ڈائس چانسلر کی حیثیت سے ان کا یہ فرض تھا کہ وہ ذاکر اشرف صاحب کی ACTIVITY پر نگاہ رکھیں، چنانچہ یہاں پر وگریسو اور اینٹی پروگریسو کا جھگڑا شروع ہو گیا۔

●●

ڈاکٹر ظہیر احمد صدیقی
دہلی یونیورسٹی

میں ذاکر صاحب کے زمانے میں ہی مسلم یونیورسٹی میں لکچرر ہوا تھا۔ انھوں نے ہی بحیثیت لکچرر کے میرا انٹرویو کنڈکٹ کیا تھا۔ میں تو اچھا بولنے والا آدمی نہیں ہوں جب تو اور بھی نہیں تھا۔ انھوں نے مجھ سے اشعار پوچھے۔ حافظ کا شعر بھی پوچھا تھا۔ پھر پوچھا کہ تم معلم کیوں بننا چاہتے ہو؟ جبکہ تم نے LAW بھی پاس کیا ہوا ہے۔ خیر میں نے اس کا جواب دیا۔

ذاکر صاحب بڑے ہردلعزیز وائس چانسلر اور بڑے محبوب شخصیت کے مالک تھے۔ مختلف جلسوں میں جہاں ان کی تقریر ہوتی تھی، میں ضرور جاتا تھا۔ اگرچہ میں لکچرر ضرور ہو گیا تھا، لیکن میرا ایک قدم طالب علمی کی دنیا میں بھی تھا۔ ذاکر صاحب، نوجوان طبقہ میں، خاص طور پر بہت مقبول تھے۔ ذاکر صاحب کی بعض باتوں سے ہم بڑے ناراض ہوتے تھے مثلاً ہندوؤں کا جوتا اٹھانا، یہ اپنے لیے عبادت سمجھتے تھے۔ لیکن اب محسوس ہوتا کہ ان کی باتوں میں بڑی حکمت تھی۔ وہ ایسا کر کے ہندوؤں کے دلوں میں مسلمانوں کیلئے دوبارہ جگہ پیدا کرنا چاہتے تھے۔ یہ انہی کی کوششوں کا ثمرہ ہے کہ آج ہم عزت کے ساتھ رہ رہے ہیں۔

میرے ایک استاد تھے۔ پروفیسر حمید الدین خاں۔ بڑے سخت مزاج اور کھرے آدمی اور بے مروتی کی حد تک ایماندار۔ وہ انجینئرنگ کالج کے TABULATER تھے ایک ہندو اکزامنر کی انھوں نے شکایت کی کہ اس نے مارکنگ میں جانبداری سے کام لیا ہے، لہٰذا اس کو سسپینڈ کر دیا جائے۔ مگر ذاکر صاحب نے انھیں درگذر کر دیا۔ اس لیے پروفیسر حمید الدین خاں کو اس بات کی شکایت ہو گئی کہ ذاکر صاحب کے یہاں موقع پرستی اور مصلحت پسندی ہے۔ لیکن اس زمانے کے لیے یہی مناسب تھا۔ اس وقت کی فضا بالکل ایسی نہیں تھی کہ ہم دو اور دو چار کی طرح حساب کر ڈالتے۔

جامعہ ملیہ کا ایک واقعہ سن لیجیے۔ وہاں ہادی صاحب پروفیسر ہو گئے، تو ضیاء الدین نے توڑنے کی CAMPAIGN شروع کی۔ ہادی صاحب، ان کے خاص آدمی تھے، انھوں نے استعفا لکھ کر جیب میں رکھا۔ جامعہ کی حمایت میں بڑی شاندار تقریر کی اور اس کے فوراً بعد استعفا دے کر مسلم یونیورسٹی جوائن کیا۔ اس کو ضیاء الدین اور ان کے گرد بیٹھے اپنی بڑی فتح سمجھا اور اسے جامعہ ملیہ کی زبردست شکست تصور کیا گیا۔ پروفیسر حمید الدین کا

بیان ہے کہ ہادی صاحب کی اس حرکت کو ذاکر صاحب کبھی نہ بھولے۔ انھوں نے ہمیشہ یاد رکھا کہ ہم کو سب سے بڑی زک اور سب سے بڑی چوٹ ہادی صاحب سے پہنچی۔

ذاکر صاحب کی وائس چانسلری کے بارے میں، ہادی صاحب کا قاعدہ یہ تھا کہ وہ چھٹیوں میں حیدرآباد چلے جاتے تھے۔ اور ۱۵ یا ۱۶ جولائی کو جس دن یونیورسٹی کھلتی تھی EXACT اسی دن وہ یہیں آتے تھے۔ وہ پندرہ دنوں کی مزید چھٹی لیا کرتے تھے۔ وہ کہتے تھے کہ علی گڑھ کی برسات میں حبس ہو جاتا ہے۔ جبکہ وہاں کی برسات میں خنکی اور ٹھنڈک رہتی ہے۔ ہمیشہ پندرہ دن بعد آ کر وہ جوائن کرتے تھے۔ انھوں نے حسب معمول ذاکر صاحب کو لکھا کہ پندرہ دن کی مزید چھٹی دی جائے۔ جواب میں ذاکر صاحب نے لکھا کہ مجھے خوشی ہوگی اگر آپ اس دن آ کر جوائن کر لیں، جس دن یونیورسٹی کھل رہی ہے۔ ہادی صاحب کو اس کا بے حد رنج ہوا۔ وہ آ تو گئے لیکن ذاکر صاحب کی شکایتیں شروع کر دیں، حالانکہ بات اصول کی تھی۔ ایک ایڈمنسٹریٹر کو بے مروت ہونا بھی چاہیئے۔ اس کے بعد ایک واقعہ اور ہوا۔ ایک روز یہ ذاکر صاحب سے ملاقات کرنے گئے، ذاکر صاحب مشغول تھے، ملاقات نہیں ہو سکی۔ ان کو اور زیادہ رنج ہوا۔ یہ اور شدومد سے شکوہ شکایت کرنے لگے۔ ذاکر صاحب نے اس کا ازالہ یوں کیا کہ وہ خود ان کے گھر گئے، اور معذرت کی کہ آپ تشریف لائے لیکن میں زبردست مشغول تھا اس لیے حاضر نہ ہو سکا۔ اب میں آپ کی خدمت میں حاضر ہوں، جو حکم ہو فرمائیے۔ تو ایسے تھے ذاکر صاحب!

پروفیسر خواجہ احمد فاروقی

دہلی یونیورسٹی

جس زمانے میں سر والٹر رالے ٹاور آف لندن میں قید تھا، وہ
سارا وقت دنیا کی تاریخ لکھنے میں صرف کرتا تھا۔ ایک روز دو قیدیوں میں لڑائی ہوئی اور ایک قیدی نے آکر سر والٹر کو
چشم دید واقعہ سنایا کہ آج ان دو قیدیوں میں سخت لڑائی ہوئی، جیک نے پیٹ کا سر پھوٹ گیا۔ دوسرا قیدی آیا اس نے
بھی لڑائی کی داستان بیان کی اور کہا کہ جیک بری طرح مجروح ہوا ہے۔ بیچارے کی کمر ٹوٹ گئی۔ کچھ دیر کے بعد تیسرا قیدی آیا
اس نے بھی یہ قصہ سنایا اور کہا "سر والٹر، تمہیں خبر بھی ہے جیک کی ٹانگوں میں اس طرح چوٹ آئی ہے کہ اب وہ شاید ہی
کبھی کھڑا ہو سکے۔ سر والٹر نے اپنا سر پیٹ لیا اور کہا کہ میں دنیا کی تاریخ لکھ رہا ہوں، جس میں ابتدائے آفرینش سے اس
وقت تک کے واقعات ہیں اور جو صدیوں پر محیط ہیں اور مختلف ملکوں سے متعلق ہیں۔ یہ واقعہ آج کا ہے آج ہی اس کی
اطلاع کی گئی ہے اور اطلاع دینے والوں نے واقعہ کو اپنی آنکھ سے دیکھا ہے، زماں و مکاں بھی ایک ہی ہیں لیکن تینوں
چشم دید گواہوں کے بیانات مختلف ہیں ممکن ہے یہ تینوں غلط ہوں یا مبالغہ آمیز ہوں یا صرف ایک ہی بیان صحیح ہو
یا تینوں بیان صحیح ہوں اور جیک کو چوٹ سر میں بھی آئی ہو، کمر میں بھی آئی ہو اور ٹانگوں میں بھی آئی ہو۔" یہ لطیفہ میں
نے اس لیے بیان کیا کہ سچائی تک پہنچنا کس قدر مشکل ہے۔ کون بیان کر رہا ہے۔ اس کے مشاغل کیا ہیں، سیرت و عادات
و اطوار کیسے ہیں۔ اسے جھوٹ بولنے اور رنگ آمیزی کی عادت تو نہیں، وہ کون سے واقعات کا انتخاب کرتا ہے، کب
کرتا ہے اور کیوں کرتا ہے۔

جب نپولین ایلبا سے بھاگا تھا تو پیرس کے سب سے مشہور اخبار نے سرخی دی تھی: "کورسیکا کا کالا دیو
جزیرہ توڑ کر بھاگ نکلا ہے" ایک ہفتے کے بعد اسی معروف اور مشہور اخبار نے یہ سرخی شائع کی۔ "وہ غاصب فرانس
واپس آگیا ہے" تیس دن کے بعد اسی اخبار میں یہ سرخی چھپی۔ "بوناپارٹ پیرس سے صرف دو سو میل رہ گیا ہے۔" دو
دن کے بعد اسی اخبار نے لکھا ہے "نوید فتح و ظفر کار رسید۔ شہنشاہ اپنے جائز تخت پر پھر متمکن ہو گیا۔"

جناب صدر! حدیث کے جانچنے کا جو علم ہے میری نظر میں اس سے زیادہ معقول اس سے زیادہ صحیح اور
ایماندارانہ طریقہ اور کوئی نہیں ہے۔ میں اس معیار تک تو ہرگز نہیں پہنچ سکتا تاہم میری کوشش ہوگی کہ ڈاکٹر صاحب
کے حالات، واقعات، ان کی باتیں اور یادیں، حتی الوسع معروضی انداز میں آپ کے سامنے پیش کر سکوں۔ میری
معلومات کا ذریعہ میں خود ہوں یا پھر میرے عزیز قریب محمد طیب صاحب جو ڈاکٹر صاحب کے طالب علم رہے ہیں
اور آخر میں جامعہ ملیہ کے اکاؤنٹس آفیسر کی حیثیت سے ریٹائر ہوئے ہیں اور اب بھی اسی جامعہ ملیہ کے احاطے میں

رہتے ہیں۔

ذاکر صاحب سے ہمارے خاندان کے خصوصی مراسم تھے۔ میرے چچا مولوی نورالرحمٰن صاحب ان کے علیگڈھ میں کلاس فیلو رہ چکے تھے، اس رشتے سے وہ دو دفعہ "بھیراؤں" گئے جو میرا وطن ہے۔ ایک مرتبہ تو ملتہ جامعہ دار جامعہ کے لیے چندہ جمع کرنے کے لیے گئے۔ شفیق الرحمٰن قدوائی صاحب مرحوم بھی ان کے ساتھ تھے۔ اس موقع کی کوئی بات یاد نہیں، صرف ذاکر صاحب کا تندرست چہرہ، سیاہ بھری بھری آنکھیں، اور ان کی کھدر کی سفید براق شیروانی یاد ہے۔

دوسری دفعہ وہ طیب صاحب کی شادی میں تشریف لے گئے، اور مولوی سلطان حسن صاحب کی کوٹھی میں مقیم رہے۔ یہیں نکاح بھی ہوا اور یہیں سہرے بھی پڑھے گئے۔ ایک صاحب نے جن کا نام ریاض الحق ہے جو بے چارے کم سواد تھے لیکن شعر کہنے کا شوق تھا اور طیب صاحب کی محبت میں سہرا بھی لکھا تھا اس میں ایک مصرعہ تھا ۔

ع اللہ یہ اکبر سہرا

اللہ اکبر کسی طرح نہیں بیٹھتا تھا تو ریاض صاحب نے مصرعے کو اس طرح توڑ دیا "اللہُ یہ اکبر سہرا" ذاکر صاحب نے اس مصرعے کو بار بار لطف لے کر پڑھا اور ساری محفل اس حاشی غلطی پر متوجہ ہوگئی۔

میں نے ذاکر صاحب کو ترنم سے بھی پڑھتے ہوئے سنا ہے۔ جامعہ جب قرول باغ سے اوکھلا آئی ہے تو ایک مشاعرہ بڑے پیمانے پر منعقد ہوا اس میں ثاقب لکھنوی اور اصغر گونڈوی اس زمانے کے سبھی معروف شعراء تشریف لائے تھے اصغر صاحب کو سرلہ ہو رہا تھا اور آواز بیٹھی ہوئی تھی۔ ذاکر صاحب نے ان کی غزل خود پڑھی اور ترنم سے پڑھی یہ فارسی میں تھی، اور اس کا ایک مصرعہ یاد رہ گیا ہے ع

"دلا تسخیر کردم ماہ و انجم را"

ذاکر صاحب بنیادی طور پر مثالی معلم تھے، استاد اور طالب علم میں جو محبت کا رشتہ ہونا چاہیے، وہ ان کے یہاں بدرجۂ غایت موجود تھا۔ یہی وجہ ہے کہ طالب علم اپنے سارے مسئلے ان کے سامنے رکھ دیتے تھے اور وہ ان کو بڑی خوبی سے سلجھاتے تھے۔ مولانا آزاد سبحانی کے بیٹے اثر سبحانی جو حیات ہیں اور میرے دوست ہیں ان کے پاس پہنچے اور کہا کہ حافظ فیاض احمد صاحب نہ معلوم کس طرح ریاضی پڑھاتے ہیں، ہمیں تو خاک سمجھ میں نہیں آتا۔ انھوں نے کہا اچھا، آج میں پڑھاؤں گا۔ پوچھا حسن صاحب ایک اور ایک کتنے ہوتے ہیں؟ عرض کیا دو۔ اور ایک میں سے ایک گیا تو کیا رہا؟ عرض کیا کہ صفر۔ ذاکر صاحب فرمانے لگے تم کون کہتا ہے کہ آپ ریاضی نہیں جانتے۔ آپ تو سب جانتے ہیں اور ریاضی اس سے زیادہ کچھ نہیں۔ جو آپ نے ابھی بتائی ہے، وہ اصل میں معاملہ کی تہہ تک پہنچ گئے تھے اور سدا قمی

ریاضی اور اس سے زیادہ کچھ نہیں ہے۔

ایک طالب علم تھا دس تیرہ برس کا، دہلی کی گول ٹوپی اوڑھے اور صدری یا نیچا پہنے اور تسبیح ہاتھ میں لیے مسجد سے آ رہا تھا اس نے عصر کی نماز میں اتنا وقت لگا دیا تھا کہ مغرب کا وقت قریب ہو گیا تھا ذاکر صاحب نے پوچھا "میاں کہاں سے آ رہے ہو؟ کہا نماز پڑھ کے۔ فرمایا ہم جب اتنے بڑے تھے تو محنت کرتے تھے اور کچھ نہیں تو اس پیڑ ہی سے لپٹ جاتے تھے اور جب وقت بچتا تھا تو کبڈی اور گلی ڈنڈا کھیلتے تھے مسجد کے اندر کبھی سدنہیں ہوئے۔ اسی طرح ذاکر صاحب کے دل میں اپنے استادوں کے لئے غیر معمولی محبت اور عزت تھی۔

یہاں ایک اور واقعہ یاد آگیا۔ افسانہ از افسانہ می خیزد۔ مولانا آزاد اور ذاکر صاحب میں بڑے خصوصی مراسم تھے وہ "الہلال" اور "البلاغ" کے ذریعہ بڑھے تھے۔

ایک رئیس اور تاجر تھے حافظ محمد صدیق، وہ نہرو پر بہت مہربان تھے اور اپنے بیٹے سے بہت ناراض تھے۔ کہتے تھے کہ میری وطن دوستی کی توہین کی۔ ذاکر صاحب نے فرمایا "یہ تو آپ کی وطن دوستی کی سب سے بڑی سرٹیفکیٹ ہے۔ کون سا پیغمبر اور مصلح ہے جس کو کہ دشمنوں نے برا بھلا نہیں کہا۔

"ہوتی آئی ہے کہ اچھوں کو برا کہتے ہیں"

حضرت عیسیٰ کو پتھروں سے لہولہان کیا گیا اور آخر میں مصلوب کر دیا گیا۔ حضور سرور کائنات ﷺ کے جسم اطہر پر گرم گرم ریت بکھیری گئی اور ببول کے کانٹوں سے پیروں کو زخمی کر دیا گیا۔ دور نہ جائیے ہندستان میں گاندھی جی کو اپنوں . . قتل کر دیا گیا تھا یہ بات رنج کی نہیں خوشی کی ہے کہ آپ اتنے اچھے اور بڑے لوگوں کے ساتھ ہیں۔

پروفیسر محمد محسن

کچھ لوگوں کا خیال ہے کہ ذاکر صاحب جیسے ابتدا میں تھے، شاید وہ انتہا میں

ویسے نہ رہے۔ اس کا سبب بہت بڑا ہے۔ یہ کہ ہم لوگوں کے یہاں چونکہ عصبیات سے کچھ تعلق ہے۔ ہم لوگ (Personality)، شخصیت کی تھیوری کو Contingency Theory کہتے ہیں یعنی شخصیت بھی حالات سے متاثر ہوتی ہے اور سب سے زیادہ اس کا جو منصب ہوتا ہے Role or Status اس سے شخصیت بہت کچھ متاثر ہوتی ہے۔ ذاکر صاحب کی جو شخصیت پہلے تھی بحیثیت استاد کے، اور اس کے بعد جواں کی شخصیت ہوئی وائس چانسلر کی حیثیت سے اس کے بعد نائب صدر، پھر صدر کی حیثیت سے، ظاہر ہے اس میں فرق ہونا ضروری تھا۔ اس لئے کہ منصب بدل گیا Status بدل گیا، حالات بدل گئے اس کا اثر شخصیت پر پڑتا ہے اس لئے جو لوگ یہ کہتے ہیں وہ غلط نہیں کہتے اور میں سلسلہ واقعات پیش کرنا نہیں چاہتا، لیکن بہت سے ایسے واقعات ہوئے ہیں کہ جس سے مجھ کو بھی یہ اندازہ ہوا کرتا تھا کہ ذاکر صاحب جو پہلے تھے، وہ اب نہیں رہے اور ذاکر صاحب کے متعلق میرے دماغ میں، ان کی شخصیت میں جو تبدیلی کچھ ہوئی ہے میرے خیال میں ان کے متعلق ایک جملہ آیا تھا انگریزی میں وہ کچھ اس طرح ہے

Zakir Sb started as an institution

انھوں نے زندگی شروع کی حیثیت ادارے کے۔

but he ended as a person

اور ایک عظیم شخصیت کی حیثیت سے انھوں نے اپنا سفر ختم کیا۔ تو ادارہ تھے وہ ادارے کی حیثیت سے ان کی شخصیت بلند تھی، اس سے انکار نہیں کیا جا سکتا ہے، لیکن as a person یعنی وہ بڑے مقام پر پہنچے، لیکن ان کی شخصیت کچھ دوسری ہو گئی تھی۔ میرے خیال میں یہ ایک فاکر ہے ان کی زندگی میں جو تبدیلی ہوئی ہے اس کا، metamorphosis جو ہو گئی ہے۔

جناب سید حسن

خواجہ صاحب کی تقریر سے ذاکر صاحب کی شخصیت کے بہت سے سارے پہلو روشن ہوئے میری ذاکر صاحب سے زیادہ ملاقات نہیں تھی، جب وہ وائس چانسلر تھے علیگڈھ یونیورسٹی کے، تو میرا ایک بیٹا وہاں بی۔ ایس۔ سی کلاس میں تھا اور ہوسٹل میں رہتا تھا لیکن اتفاق سے وہ امتحان میں ایک پیپر میں فیل کر گیا تھا اور سپلیمنٹری کے امتحان کے لئے وہ دوبارہ وہاں گیا لیکن اس کو اس روم میں جگہ نہ ملی جہاں وہ پہلے رہتا

تھا اور وہ مجبوراً اپنے ہوسٹل کے قریب ایک گاؤں تھا وہاں ایک شخص کی کوٹھی میں اس نے پناہ لی تو مجھے اس نے
خط لکھا کہ امتحان نزدیک ہے اور میری یہ حالت ہے۔ میں پڑھ نہیں سکتا ہوں جہاں میں ہوں، وہاں روشنی کا
انتظام نہیں ہے۔ مرغیاں ہیں، وہ آکر تنگ کرتی ہیں تو بڑی مشکل ہے امتحان کو چند دن رہ گئے ہیں تو میں
نے ایک خط لکھا ذاکر صاحب کو، اور وہ خط دیا تھا کہ میرا بیٹا گیا ہے۔ وہیں کا اسٹوڈنٹ تھا اور وہ
امتحان دینے آگیا ہے اس کے ساتھ یہ واقعہ پیش آیا ہے کہ ہوسٹل سے نکال دیا گیا ہے مجھے بہت افسوس
ہے کہ آپ کے زمانے میں اس کو پناہ نہیں ملی میں یہاں خود ہوسٹل سپرنٹنڈنٹ ہوں، میں نے یہاں بہت لوگوں
کو پناہ دی۔ یہ سب میں نے لکھا کہ آج میرا بیٹا وہاں مارا مارا پھر رہا ہے، مہربانی کر کے آپ اس پر توجہ دیجئے اور جگہ
دیجئے۔ اس درمیان میں نے، ایک دوست وہاں تھے ہندو دوست، ان کو خط لکھا کہ میرا بیٹا وہاں گیا ہے وہ اس طرح
ہے انھوں نے کہا ٹھیک ہے میں اس کو لا کر رکھ دوں گا اپنی جگہ پر۔ چنانچہ انھوں نے اپنی کوشش سے پھر اسے
اپنی جگہ پر لا کر رکھ دیا۔ اس وقت ڈاکٹر نورالحسن صاحب ان کے پرووسٹ تھے تو ذاکر صاحب کا خط آیا کہ وہ لڑکا
اپنی مرضی سے ہوسٹل چھوڑ کر چلا گیا تھا جیسا کہ ڈاکٹر نورالحسن صاحب نے لکھا ہے اور پھر بلا لیا گیا ہے اس کے
بعد ذاکر صاحب یہاں گورنر ہو کر تشریف لائے اور پٹنہ کالج میں ہم لوگ بیٹھے تھے تو تعارف کے لئے ایک جلسہ
ہوا، میں بھی وہاں تھا، تو میری آنکھ ان کے نزدیک عجیب گئی کہ میں نے ان کو خط لکھا تھا لیکن بڑے اخلاق
سے وہ ملے اور کوئی بات ایسی نظر نہیں آئی کہ وہ خفا ہوں مجھ سے، اس کے بعد پھر موقع ملا ان سے ملنے کا میں
اپنی کتاب لے گیا وہاں، وہ ساتھ ساتھ مجھے وہاں تک چھوڑنے آئے مجھ کو، میں نے انھیں دیکھا کہ بڑے صاحب اخلاق
تھے اور وہ خندہ پیشانی سے ملتے تھے ایک بار پھر جانے کا اتفاق ہوا، وہ یہ کوشش کر رہے تھے کہ حضرت
شاہ شرف الدین احمد یحییٰ منیریؒ کی کتابوں کے ایڈیشن شائع ہوں۔ ایک کمیٹی بنی تھی اس میں میں بھی تھا تو اس وقت
بھی ان کو دیکھا کہ کس اخلاق سے ملے اور کس طرح گفتگو کی لوگوں سے بڑا گہرا اثر ہوا، اور میں شرمندہ واقعی ہوا کہ
میں نے ان کو ایک خط لکھا سخت قسم کا لیکن انھوں نے برا نہیں مانا اس خط کا۔ وہ یہاں اچھا اثر چھوڑ گئے، ہم
لوگوں کو افسوس ہوا۔ ان کے جانے کے بعد گویا یہاں سے ایک اچھا گورنر چلا گیا۔

جناب ناصر حبیبی:

ذاکر حسین صاحب کی اتنی بڑی شخصیت کے بارے میں، میں کیا کہوں؟ میری پہلی ملاقات ان سے ۱۹۴۹ء ہوئی ہے،
جب میں علیگڑھ مسلم یونیورسٹی کا طالب علم تھا۔ پہلی دفعہ ہی ملنے کے بعد ایسی شفقت ملی کہ میں بارہا موقع کی تلاش میں
رہتا تھا کہ ان سے بار بار ملوں اور جب بھی ملا ان سے میں بڑی مسرت ہوئی ان سے میری ملاقات پھر ایسی بڑھی

کہ ایک بار جب وہ وی ایم ہال تشریف لائے تو میرے کمرے تک تشریف لائے۔ ان دنوں میں سگریٹ پینے کا عادی تھا۔ یوں تو کمرہ میرا صاف ستھرا رہا کرتا تھا لیکن اتفاق سے ایک ایش کی تیلی گری ہوئی تھی۔ یوں تو سنا آتا تھا کہ وہ کچھ کہتے نہیں ہیں اور کچھ انھیں لگتا ہے تو وہ شیروانی کی جیب میں ڈال لیتے ہیں۔ مگر یہی ہوا، انھوں نے وہ تیلی اٹھائی اور جیب میں رکھ لی میں بڑا شرمندہ ہوا، ان کے پیچھے پیچھے کمرے سے باہر نکلا، اتفاق سے سامنے ڈسٹ بن تھا اس میں انھوں نے ڈال دیا

ذاکر صاحب یہاں آئیں اور میں نہ ملوں، یہ کیسے ہو سکتا ہے مجھے بیچینی ہو گئی، پھر میں نے سوچا کہ انھیں ذاتی خط لکھوں میں نے اردو میں ان کو ایک خط ذاتی لکھا اس کے دوسرے تیسرے یا چوتھے دن مجھے اس کا جواب ملا۔ تو جب میں پہلی دفعہ ان سے ملا تو لگ بھگ چالیس منٹ تک ان سے باتیں ہوئیں۔ انواع و اقسام کی باتیں، کیسے کام کر رہے ہیں آپ، کیا کام کر رہے ہیں، کیا ہو رہا ہے، نہیں ہو رہا ہے۔ کیا تکالیف ہیں، نہیں ہیں ایسا لگتا تھا کہ وہ بالکل دل کھول کر رکھ دینا چاہتے ہیں، اور میری ہر طرح سے مدد کرنا چاہتے ہیں اس درمیان میں کچھ اور لوگ ملنے والے آئے اور اس زمانے میں وہ شروع شروع آئے تھے اور شاید شری بابو اس زمانے میں مر بھی گئے تھے کوئی دوسرے چیف منسٹر تھے، تو جتنا گر صاحب شاید تیسری بار جب تشریف لائے، دروازے سے جھانکا انھوں نے، تب میں نے خود محسوس کیا۔ پھر بھی انھوں نے یہ نہیں کہا کہ آپ چلے جائیں۔ بھئی میری حیثیت کیا تھی، میں تو سمندر میں قطرہ کے مانند لیکن انھوں نے اپنے کسی بھی انداز سے یہ نہیں ظاہر کیا کہ مجھے اب بات ختم کر دینی چاہیے۔ بہر حال میں نے خود پہل کی اور جب میں اٹھا تو میرے ساتھ ساتھ وہ خود بھی اٹھے اور مجھے دروازہ تک چھوڑنے کے لیے تشریف لائے۔ یہ اتنی بڑی شخصیت تھی، پھر کئی بار اتفاق ہوا۔ ایک بار انھوں نے مجھ سے کہا میں نے ذکر کیا کہ مجھے ایسی ایسی facility ہونی چاہیے یہ ہونی چاہیے، وہ ہونی چاہیے تو انھوں نے مجھ سے برجستہ کہا کہ آپ فلاں سے فلاں سے ملیں جتنے بہار کے اس وقت کے بڑے لوگ تھے ان سے ملیے، اور انھوں نے یہ لفظ استعمال کیا کہ آپ ان سے کہیں کہ میں نے آپ کو بھیجا ہے۔ یہ بہت بڑی بات ہے۔ ایسی کھلی چھٹی کون دیتا ہے گرچہ میں نے ان کے تعلقات کو استعمال نہیں کیا، میں نے کبھی کوشش بھی نہیں کی کہ غلط طریقے سے ان کے تعلقات کو میں استعمال کروں لیکن یہ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ وہ کتنے خواہشمند تھے کہ معمولی سے معمولی میرے جیسا ایک ادنیٰ آدمی بھی ان سے جتنی زیادہ فوائد ہوں وصف۔۶۹۹

میں جب وہ رحلت فرمائے، اس سے چند ماہ قبل میری ملاقات ان سے ہوئی راشٹرپتی بھون میں شاید مئی کا مہینہ تھا، ان دنوں میں ایک تو لیڈی ہارڈنگ کالج ہے دہلی میں، اس میں ایک سیمینار تھا جس میں میں بہار سے گیا تھا تو اسی دوران میں نے وقت نکالا ان کے سکریٹری سے درخواست کی راشٹرپتی بھون میں جا کر ملنے کی، میں نے بتایا کہ مجھ سے وہ ذاتی طور پر واقف ہیں تو انھوں نے میرے لیے وقت متعین کیا۔ جب میں ان سے ملا تو ادھر ادھر کی باتیں تو ہوتی ہی رہیں لیکن گفتگو کے دوران میں نے کچھ ایسا محسوس کیا، ہو سکتا ہے میں غلط ہوں، ایسا محسوس کیا کہ وہ بہت تھکے تھکے سے ہو، حالات تھے اس وقت کے، ان حالات سے وہ بہت زیادہ تھکے ہوئے تھے، اور شاید وہ ان کے چہرے پر میں نے ایسی مایوسی دیکھی کہ شاید وہ سمجھتے ہیں کہ یہ حالات سدھرنے والے نہیں ہیں۔ اب چونکہ غذائیات سے میرا تعلق ہے تو کچھ غذاؤں کے بارے میں باتیں ہوئیں، کچھ لوگوں کی food habits کی تبدیلیوں کی باتیں ہوئیں تو ادھر کے ایک سردار جی تھے ان کے اسٹاف میں، پاس ہی موجود ہوتے تھے، انھوں نے اتنے بلند آواز سے کہا شاید انھوں نے سنا سی ہو کر بھائی یہ لوگ کیا بدلیں گے —— —— ———— —— —— اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ کتنے مایوس ہو گئے تھے وہ — میرا اپنا اندازہ یہ ہے کہ ان کے دل کا دورہ وہ شاید اس مایوسی کا نتیجہ تھا میں نے کسی سے نہیں بیان کیا، لیکن آج مجھے اتفاق ہوا، تو میرا اپنا تجربہ یہی ہے۔

جناب اکبر رضا جمشید

آج ذاکر حسین صاحب کے متعلق جو گفتگو ہو رہی ہے۔ "ذاکر ہماری یاد میں" - ایک واقعہ ہمارے ساتھ ہوا، ۱۹۶۹ء میں جب کہ ساری دنیا غالب کی صد سالہ سالگرہ منا رہی تھی، اس موقع پر میں نے ایک کتاب "مئے ناشنیدۂ غالبؔ" کے عنوان سے لکھی تھی ——— اس کتاب کو لکھنے سے قبل میں نے دو ماہرین غالب کی خدمت میں رجسٹری سے بھیجا لیکن افسوس کہ ان کا کوئی جواب نہیں آسکا وقت پر اور جب وقت پر جواب نہیں آیا تو میں نے جلدی میں ایک خط ڈاکٹر ذاکر حسین صاحب کو اور فخرالدین علی احمد صاحب کو کتاب کے سلسلے میں لکھا اور ایک کاپی ڈاکٹر ذاکر حسین صاحب کی خدمت میں اسی کا مسودہ بھیج دیا تو کچھ دنوں بعد ہمارے پاس جواب آیا، اور وہ کاپی واپس آگئی —— —— ——— کہ میں غالب کا ماہر نہیں ہوں، اسے کسی ماہر غالبؔ کو دکھائیے۔ میری نیک خواہشات آپ کے ساتھ ہیں، وغیرہ وغیرہ۔ ۱۹۶۹ء میں فخرالدین علی احمد صاحب جب پٹنہ تشریف لائے تو انھوں نے میری کتاب کا اسی خدابخش لائبریری میں اجرا کیا۔ اس وقت قاضی عبدالودود صاحب بھی زندہ تھے، انھوں نے ہی اس کا پروگرام کیا تو ڈاکٹر ذاکر حسین صاحب کو میں نے اس وقت تک کتاب نہیں دی تھی، میری کتاب فخرالدین علی احمد صاحب مرحوم لے کر گئے، اور کہا کہ دیکھو

غالب کا جشن منایا جا رہا ہے وہاں تم آؤ۔ میں نے کہا ضرور آؤں گا۔ تو ۱۵ فروری کے موقع پر میں دلی گیا اور ایک دن فخر الدین علی احمد صاحب کے گھر پہنچ گیا۔ فخر الدین علی احمد صاحب سے میں نے کہا میں چاہتا تھا کہ ذاکر صاحب سے ملوں۔ انھوں نے کہا "چلو ملا دیتے ہیں ہم" تو میں ملنے گیا۔ ان سے ملے بھی۔ انھوں نے کتاب دیکھی، کچھ مشورہ دیا۔ اس کے بعد کہا کہ تم عمر میں مجھ سے بہت چھوٹے ہو، اس لیے میں صاحبزادے کہنے کا پورا حق رکھتا ہوں، برا نہ ماننا۔ میں نے کہا "یہ تو میری خوش نصیبی ہے کہ آپ مجھ سے مخاطب ہیں آج" پھر انھوں نے کہا "ایسا کرو کہ جب تمہیں شوق ہے تو کوئی ایسی چیز غالب پر لکھو جو بالکل نایاب ہو، نئی چیز ہو۔ میں نے کہا آپ کی دعا رہی تو میں کوشش کروں گا۔ اس کے بعد میں واپس چلا آیا۔ اس کے بعد میں سوچتا رہا کہ غالب پر میں کیا لکھوں۔ کیا چیز لکھوں اور کس انداز سے لکھوں۔ بہرکیف سوچتے سوچتے آج آپ لوگوں کی دعاؤں سے اور ان مقدس لوگوں کی blessings سے میں نے ایک کتاب غالب پر لکھی ہے وہ یقیناً نئے انداز کی ہے۔ نیا انداز اس سلسلے میں یہ ہے کہ میں نے غالب کی پوری سوانح حیات کو ڈرامائی انداز میں لکھا ہے۔

محترمہ شکیلا اختر

ذاکر صاحب کے بارے میں اختر صاحب نے ہم کو سنایا تھا۔ وہ تو بہت ملا کرتے تھے۔ ذاکر صاحب سے بار بار ملتے تھے تو وہ ایسے تو بہت سی باتیں ہیں اور جب تک آدمی باضابطہ طور پر لکھے نہیں، وہ سلسلہ وار سنا نہیں سکتا زبانی لیکن ایک بات ابھی ہم کو یاد آ رہی ہے کہ ذاکر صاحب نے بڑی حسرت کے ساتھ کہا تھا کہ اختر صاحب آپ میرے دل کی حالت نہیں سمجھ سکتے ہیں کہ ہم دریا کے کنارے بیٹھے ہوئے ہیں، لیکن پیاسے ہیں۔ پٹنہ میں ہم ہیں اور خدا بخش لائبریری یہاں ہے۔ میری خواہش تو یہی ہوتی ہے کہ سرکاری کاموں سے جب بھی فرصت ملے ہم اپنے سارے اوقات وہیں گزاریں۔

جناب اشتیاق محمد خان

علی گڑھ ... کی ... کے ساتھی

○

- ذاکر صاحب بہار کے گورنر تھے (۱۹۵۹) یونیورسٹی میں پہلی مرتبہ میں نے "ریج لوک گیت سمیلن" منظم کیا تھا ذاکر صاحب سے اس سمیلن کے افتتاح کے لئے درخواست کی گئی تھی۔

- مئی ۱۹۶۱ء میں علی گڑھ سے بمبئی ہجرت کی اسماعیل بیگ محمد ہائی اسکول میں ٹیچری کی جگہ مل گئی ذاکر صاحب کو اپنی مصروفیات کے سلسلہ میں برابر مطلع کرتا رہا۔

- علی گڑھ سے بمبئی ایک خاص خواہش اور مقصد کے تحت آیا تھا یعنی میوزک ڈائرکٹر بننے میری اس خواہش کا علم ذاکر صاحب کو تھا بمبئی کی پہلی ملاقات میں انہوں نے سب سے پہلے یہی پوچھا "آپ کی موسیقی کا کیا حال ہے؟" میں نے جواب میں مایوسی کا اظہار کیا اور بتایا کہ فلم انڈسٹری میں کتنا سخت مقابلہ ہے۔ نئے آدمی کا آنا بہت محال ہے جب تک آپ Backing نہ ہو۔ ذاکر صاحب نے فرمایا "فلم انڈسٹری میں میرا کوئی جاننے والا نہیں ہے۔ ہاں محبوب خان دہلی حسب اور ڈلینے آئے تھے تو ملاقات ہوئی تھی۔" اس کے بعد فرمایا "ڈاکٹر حمید سے کہوں گا کہ وہ آپ کے لئے کچھ کریں" یہ خط اس سلسلہ میں ہے۔

- "نوجوانوں کی صلاحیتوں کو اجاگر کرنا، ان کی ہمت افزائی کرنا اور اچھے مواقع بہم پہنچانا" ذاکر صاحب کی خوبیوں میں سے ایک یہ بھی خوبی تھی۔

- جعفر سلیمان مسلم اسٹوڈنٹس ہوسٹل کی نئی عمارت کے "سنگ بنیاد" رکھنے کے سلسلہ میں خط و کتابت ہوئی۔ دعوت قبول کرلی گئی اور ذاکر صاحب کے ہاتھوں ہی اس ہوسٹل کی نئی عمارت کا سنگ بنیاد ۲۲ ستمبر ۱۹۶۴ء کو رکھا گیا۔

- ہوسٹل کی نئی پانچ منزلہ عمارت میں جو پبلک کے چندہ کی رقم (۲½ لاکھ) سے ۱۹۶۶ء میں مکمل ہوئی، ۲۵۰ طلبا (مسلم) رہتے ہیں ورنہ ایک منزلہ پرانی عمارت میں صرف ۵۰ طلبا رہتے تھے بمبئی شہر میں مسلم طلبا کیلئے بالخصوص سب سے بڑا ہوسٹل ہے

- ذاکر صاحب نے سنگ بنیاد رکھنے کی اس تقریب پر چند جملے (یادگار) میرے متعلق بھی کہے تھے اور وہ اس طرح۔

"یوں تو بمبئی میں آتا ہی رہتا ہوں لیکن اس مرتبہ میں یہاں اپنے عزیز شاگرد کے دعوت نامہ پر آیا ہوں۔ دراصل اس پتھر پر (پتھر کی طرف اشارہ کرتے ہوئے) اسکا نام (میری طرف اشارہ کرتے ہوئے) ہونا چاہئے تھا۔ اس لئے کہ کام تو انکا ہے نام میرا لیکن کیا کیا جائے اچھے اور سعادت مند شاگرد جب کوئی اچھا کام کرتے ہیں تو استاد کو آگے کر دیتے ہیں اور خود پیچھے رہ جاتے ہیں"

۱۹۶۵ء میں میں نے اسکول کی ملازمت چھوڑ دی اور بینک کی ملازمت اختیار کی۔ بینک کی دعوت میں دو اشخاص کے نام بطور حوالہ دینا ہوتے ہیں۔ میں نے ڈاکٹر صاحب اور کرنل بشیر حسین زیدی صاحب کے نام دیدیے اور دونوں حضرات کو لکھ دیا کہ اس سلسلے میں آپ کا نام دیدیا ہے۔ انکوائری ضرور آپ کے پاس آئے گی۔ (یہ خط اسی سلسلہ میں ہے)

ڈاکٹر صاحب کے متعلق میری یادوں میں اس واقعہ یا یاد کو شامل کیا جاسکتا ہے۔ بی اے فائنل ۱۹۵۱-۵۲ کے موقع پر امتحان سے ایک ہفتہ پیشتر رجسٹرار آفس نے مجھے ہال ٹکٹ دینے سے انکار کر دیا وجہ ہال (تعلیمی) کے dues کی عدم ادائیگی تھی میں ڈاکٹر صاحب (وائس چانسلر) کی رہائش گاہ پر پہنچا ان سے ملاقات تو نہ ہوسکی لیکن ان کے پرسنل سکریٹری مرید صاحب سے ملاقات ہوئی ان کو تفصیل حالات بتادیے کہ ڈاکٹر صاحب سے ملا دیں دوسرے دن پھر ڈاکٹر صاحب کے مکان پر پہنچا ڈاکٹر صاحب موجود تھے لیکن مرید صاحب نے یہ بتاکر (ان سے ملنے کی امید ہی پر پانی پھیر دیا) کہ ڈاکٹر صاحب کچھ نہیں کرسکتے انہوں نے لمبے لمبے ہال کے dues ادا کر دیئے اسی دن شام کو مجھے خبر ملی کہ دو تین اور طلباء کے ہال کے dues وائس چانسلر نے معاف کر دیئے ہیں تیسرے دن علی الصباح پھر ڈاکٹر صاحب کے مکان پر پہنچا۔ ڈاکٹر صاحب کے سکریٹری مرید صاحب نے بہت ٹالا لیکن میں بہت غصہ میں بھرا ہوا تھا میں نے مرید صاحب سے کہہ دیا کہ آج میں ڈاکٹر صاحب سے ملکر ہی جاؤں گا چاہے شام تک بیٹھنا پڑے۔

غصہ مجھے اس بات پر تھا کہ ڈاکٹر صاحب نے دوسرے طلباء کے dues تو معاف کر دیئے میرے کیوں نہیں کئے وائس چانسلر فنڈ سے بھی مجھے وظیفہ ملتا تھا اور ڈیوائرس کی اسٹیٹ سے بھی۔

بہر حال ڈاکٹر صاحب آدھا گھنٹہ بعد باہر نکل کر آئے۔ میں فوراً ان کے پاس پہنچا سلام کیا اور کہا ہال dues کی وجہ سے میرا ہال ٹکٹ روک دیا گیا ہے آپ نے بھی اس مسئلہ میں معذوری کا اظہار کیا ہے۔ میں آپ کے پاس اس لئے آیا ہوں کہ وائس چانسلر فنڈ سے جو مجھے وظیفہ دیا جا رہا ہے اس کو بھی بند کر دیا جائے مجھے کوئی حق

نہیں چاہیے" یہ چار پانچ جملے میں نے بہت محنت سے لکھے تھے ذاکر صاحب میرے قریب آئے مسکراتے ہوئے میرے کاندھے پر ہاتھ رکھتے ہوئے فرمایا "اچھا میاں، آپ کے حکم کی تعمیل کی جائے گی"۔ میں فوراً چلا آیا لیکن ایسا محسوس ہوا کہ جیسے ذاکر صاحب نے اپنے ایک جملے سے آگ پر گھڑوں پانی ڈال دیا ہو غصہ رفوچکر ہو گیا تھا بلکہ شرمندگی کا احساس ہونے لگا تھا۔ بہر حال دوسرے دن علی الصباح امتحان سے ایک دن پہلے وائس چانسلر کے آفس کا چپراسی میرے کمرہ پر آیا ایک خط دیا۔ مرید صاحب نے لکھا تھا "آپ کے ... ادا کر دیئے گئے ہیں رجسٹرار آفس سے ہال ٹکٹ لے لیجئے"۔

از عبداللطیف اعظمی

محبی سیدار صاحب تسلیم

جی ہاں منظور جامعہ میں پہلے چپراسی تھے۔ ایک طویل عرصے سے ڈرائیور ہیں مگر یہ کیوں پوچھ رہے ہیں کیا جالندھر کے واقعہ کے سلسلے میں؟ اگر واقعہ ریکارڈ کرنا ہے تو آپ خود ذاکر صاحب کے قلم سے یہ بات منظر عام پر آگئی جشن ذاکر کے موقع پر رسالوں نے جو نمبر شائع ہوئے ہیں، احترالواسع صاحب ان میں سے کسی میں انٹرویو بھی شائع ہوا ہے جو منظور اور ایک اور چپراسی بدلو سے لیا گیا ہے

ڈاکٹر ذاکر حسین مرحوم نے انجمن (کورٹ) کے جلسہ منعقدہ ۳۰ اکتوبر ۱۹۴۸ء میں جو رپورٹ پیش کی تھی، غیر مطبوعہ ہے جسے محلہ جامعہ نے ۲۷ مارچ ۱۹۴۹ء کو حسب ذیل نوٹ کے ساتھ جاری کیا تھا:

"مکرمی • السلام علیکم

جامعہ کی سالانہ رپورٹ بابت ۴۸-۱۹۴۷ء ارسال خدمت ہے یہ رپورٹ انجمن جامعہ ملیہ اسلامیہ کے جلسہ منعقدہ ۳۰ اکتوبر ۴۸ء میں پیش کی گئی تھی۔ جلسے کی روداد اس سے قبل دسمبر میں ارسال کی جا چکی ہے دستخط ارشاد الحق
نائب معتمد

اس رپورٹ کی اہمیت یہ ہے کہ بحیثیت شیخ الجامعہ ذاکر صاحب کی یہ آخری رپورٹ ہے۔

آپ نے جو اقتباس نقل کیا ہے اس کا مقصد ظاہر ہے یہ تھا کہ آنے والے انتخاب میں ذاکر صاحب کو شیخ الجامعہ کے عہدے پر منتخب نہ کیا جائے۔ مگر ایسا نہیں کیا گیا۔ انجمن کی روداد میں درج ہے۔

"(۱۱) آخر میں شیخ الجامعہ کے انتخاب کا مسئلہ پیش ہوا ڈاکٹر ذاکر حسین نے اپنی رپورٹ کے آخری حصے میں درخواست کی تھی کہ انہیں آئندہ اس عہدے کے لئے منتخب نہ کیا جائے لیکن ان کا نام اس عہدے کے لئے پیش کیا

گیا اور قرار پایا کہ انجمن ڈاکٹر ذاکر حسین کی سالانہ رپورٹ کے آخری جملوں پر اچھی طرح غور کرنے کے بعد اس بات کو تسلیم کرتی ہے کہ ڈاکٹر ذاکر حسین صاحب کو اپنی گوناگوں مصروفیت کی وجہ سے جو انجمن کی رائے میں ملک و قوم کی خدمت نیز جامعہ کے مفاد کے لئے ضروری ہیں شیخ الجامعہ کے عہدے کے روزمرہ کام کے لئے پورا وقت نہیں نکال سکتے لیکن انجمن کے اراکین کا یقین ہے کہ موصوف کا تعلق جامعہ سے بہ حیثیت شیخ الجامعہ قائم رکھنا جامعہ کی ترقی کے لئے مفید ہے اس لئے انجمن فیصلہ کرتی ہے کہ:

(الف) ڈاکٹر ذاکر حسین صاحب کو دسمبر ۴۸ء سے پانچ سال کے لئے شیخ الجامعہ منتخب کیا جائے (ب) ایک عہدہ نائب شیخ الجامعہ کا قائم کیا جائے (ج) شیخ الجامعہ کو اختیار دیا جائے کہ وہ کسی ساتھی کو نائب مقرر کر کے شیخ الجامعہ کے کل اختیارات و فرائض یا ان کا جتنا حصہ وہ مناسب سمجھیں اس کو تفویض کر دیں۔" یہ فیصلہ ۲۰ اکتوبر کو کیا گیا تھا اور اگلے مہینے ذاکر صاحب مسلم یونیورسٹی کے وائس چانسلر مقرر ہو گئے اور وہ علیگڑھ چلے گئے اور پروفیسر مجیب صاحب نائب شیخ الجامعہ کی حیثیت سے شیخ الجامعہ کے فرائض انجام دینے لگے۔ دوسری قابل ذکر بات یہ ہے کہ انجمن کی یہ روداد خود ذاکر صاحب کے قلم سے لکھی گئی ہے۔

کرنل بشیر حسین زیدی

مکرمی جناب بیدار۔ تسلیم

بہت دنوں سے خط لکھنا چاہتا تھا اور یہ تحریک شاید آپ کے خاموش جذبۂ خلوص کی مرہون منت ہے۔ پٹنہ کے سفر اور پھر چند روزہ قیام میں آپ کی فرمائش "ذکر حبیب" کے سلسلہ میں کچھ نہ ہو سکا۔ میں مرحوم ذاکر صاحب کے خطوط اپنے بکھرے ہوئے سامان میں تلاش کرنے میں تقریباً ناکام ہی رہا ہوں اس کا ازالہ شاید یوں ہو سکے کہ ذاکر صاحب مرحوم کے ایک گمنام خاموش پرستار میرے ایک عزیز سید ابوالکاظم قیصر زیدی کے نام جو خطوط ۱۹۳۶ء سے ۱۹۴۹ء تک ذاکر صاحب مرحوم نے لکھے تھے ان کی xerox copies آپ کے کتب خانہ میں محفوظ کرا رہا ہوں کاتب اور مکتوب الیہ کا رشتہ ستمبر ۱۹۴۵ء تک بزرگانہ شفقت اور محبانہ لطف و عنایات کا رہا اس کے بعد کے خطوط ہر چند کہ ایک قسم کے % .o ہیں مگر وہ مرحوم کی سیرت کے اس نفسیاتی عمل کے آئینہ دار ہیں جو وہ اپنے رفیقان کار کی تہذیب نفس کے لئے کیا کرتے تھے۔ ان خطوط پر مزید تبصرہ کرنے سے گریز کر رہا ہوں یوں کہ میں ایک ایسا واقعہ بیان کر رہا ہوں جو مرحوم کی سیرت کے ایک اور فقید المثال پہلو پر روشنی ڈالتا ہے۔ یہ واقعہ ان کے سوانح نگار اپنی لاعلمی کی وجہ سے منظر عام پر نہیں لاسکے ہیں۔

۱۹۶۴ء میں ذاکر حسین خاں صاحب مرحوم نائب صدر جمہوریہ ہند تھے اور میں ممبر پارلیمنٹ تھا۔ مرحوم کے عہدے سے متعلق حفظ مراتب کے بہت سے اصول ان کی درویشانہ روش پر گراں گزرتے تھے۔ اور وہ میرے مستقر پر جو ان سے زیادہ دور نہیں تھا کبھی کبھی خاموشی سے تشریف لاتے تھے۔ قیصر زیدی صاحب جن کو چند سال ان کے ساتھ جامعہ میں کام کرنے کا شرف حاصل تھا، اس زمانے میں سخت بیمار ہوئے اور ان کی صحت یابی کی طرف سے بالکل مایوسی پیدا ہو چکی تھی مرحوم کو اس بیماری کی خبر ہوئی تو انہوں نے عیادت کے لئے جانے کا خیال ظاہر کیا ہم لوگوں کی گفتگو سے انہوں نے یہ اندازہ لگایا کہ ان کا وہاں جانا مریض اور اس کے تیمارداروں کے لئے شاید انتظامی دشواریوں کا سبب ہو۔ یہ بات ان کے ذہن میں تھی نومبر ۱۹۶۴ء کی ایک رات کو تقریباً ۹ بجے جب وہ میرے وہاں تھے انہوں نے مجھ سے بہ اصرار یہ کہا کہ میں انہیں جامعہ نگر لے چلوں تاکہ وہ قیصر زیدی کی بیمار پرسی کر سکیں۔ مجھے کچھ تامل ہوا۔ انکی صحت کی نزاکت اور پھر حفظ مراتب کے آداب پیش نظر تھے۔ اِدھر یہ اندیشہ کہ ان کی ذکی الحس طبیعت پر اسکا اثر گراں گزرے گا بالآخر میں ان کو لے کر قیصر زیدی صاحب کے مکان پر پہونچا۔ اولڈ بوائز لاج کی یہ بلڈنگ جامعہ کی عام آبادی سے دو فرلانگ پیچھے ہے رات کے سناٹے میں ہم وہاں پہونچے میں نے اوپر جاکر قیصر زیدی صاحب کو ان کے آنے کی خبر دی قیصر زیدی صاحب کے لئے اٹھنا بیٹھنا تو درکنار اس وقت ہاتھ یا پاؤں کو حرکت دینا بھی بغیر سہارے ممکن نہ تھا۔ دل و دماغ بفضلہ کام کر رہے تھے انہوں نے سن کر کہا "میری طرف سے بہ ادب عرض کر دیجئے کہ وہ زینہ چڑھنے کی زحمت نہ فرمائیں وہ بیمار ہیں میں انکی اس محبت کی تاب نہ لا سکوں گا۔" میں نے یہ پیغام ان کو پہونچا دیا مگر وہ اوپر تشریف لے گئے۔ کم از کم پندرہ منٹ قیصر صاحب کے ساتھ رہے۔ میں اس تخلیہ میں شامل نہ تھا۔

قیصر صاحب صحت یاب ہو کر ان سے ملے ذاکر صاحب خوش تھے اور اس ملاقات کو دولت بازیافتہ سے تعبیر کرتے تھے۔ ان خوبیوں کا مالک ۱۹۶۹ء میں اس جہان فانی سے چلا گیا اللہ ہمیں ان کی خوبیوں کا ذکر کرنے کی توفیق عطا فرمائے۔ ہم کار اور رفیق کار کی ایسی دلجوئی کی مثالیں خال خال ہی پائی جاتی ہیں۔

امید ہے آپ خیریت سے ہوں گے آپریشن کے بعد اب میں اچھا ہوں۔ مگر کمزوری باقی ہے۔ آپ میرے لئے دعا فرمائیں۔

خیر طلب

بشیر حسین زیدی

پروفیسر سلیم الزماں صدیقی کراچی

ذاکر صاحب کا اور میرا ساتھ ۱۹۱۳ء سے ۱۹۱۹ء تک علی گڑھ میں یوں رہا کہ ان کو بس دور سے دیکھ لیا کرتا تھا اور یونین میں ان کی تقریروں اور خاص کر جوابی تقریروں پر عش عش کیا کرتا تھا۔ لہٰذا ان سے جرمنی میں ہوا لیکن وہ بھی کم کم کیوں کہ میں ۱۹۲۱ء سے ۱۹۲۸ء تک فرینکفرٹ یونیورسٹی میں تھا اور وہ برلن میں۔ بہر حال جب کبھی میرا وہاں جانا ہوتا تو ان کے اور دوسرے احباب کے ساتھ بڑی خوشگوار نشستیں رہتیں جنھیں چھوڑ کر فرینکفرٹ کی واپسی کھل جاتی ۱۹۲۸ء میں میری واپسی ہوئی تو حسن اتفاق سے مجھے طبیہ کالج میں ریسرچ انسٹی ٹیوٹ کی ڈائرکٹری سنبھالنی پڑی اور ان کا ساتھ جس عنوان سے جامعہ ملیہ کے اوکھلے میں منتقل ہونے سے پہلے رہا، اس کا ذکر پروفیسر مجیب صاحب نے ذاکر صاحب کی جو سوانح لکھی ہے اس میں خاصی تفصیل سے آچکا ہے۔ میرے لئے کچھ اور کہنے کی گنجائش نہیں رہتی، اس لئے بھی کہ میرے اور ان کے درمیان مخلص مالیلیع قسم کی جو رسم و راہ تھی اس کا بیان مشکل ہے۔ ۱۹۵۱ء میں پاکستان آنے کے بعد ان کے ایک خط کے جواب میں خاصی تاخیر ہوئی تو یاد دہانی کے طور پر انہوں نے خط میں صرف ایک مصرع لکھا تھا "یادم نمی کنی و زیادم نمی روی"۔ اس پر ٹپ ٹپ میرے دو آنسو گرے مگر اب نہ ان کی یہ طویل تحریر کہیں تھی نہ ان کے اپنے آنسوؤں کا نشان۔

کراچی میں ان کے چھوٹے بھائی ڈاکٹر محمود حسین سے برابر ملتا رہتا تھا خصوصیت کے ساتھ جب وہ کراچی یونیورسٹی کے وائس چانسلر تھے اور انھیں کے کہنے پر میں نے یونیورسٹی میں کیمسٹری کی ریسرچ انسٹی ٹیوٹ قائم کرنے کی ذمہ داری اٹھائی تھی۔ ذاکر صاحب تو خیر میرے ہم عمر تھے لیکن ڈاکٹر محمود حسین اپنی کم عمری ہی میں ساتھ چھوڑ گئے مرحوم پر ایک خصوصی نمبر میں میں نے "کچھ یادیں کچھ باتیں" کے عنوان سے ایک تحریر پیش کی تھی جس میں ذاکر صاحب کا ذکر بھی شامل ہے، اس کی ایک فوٹو کاپی آپ کی خدمت میں بھیج رہا ہوں۔

سلیم الزماں صدیقی

ڈاکٹر اطہر پرویز

O

میں جامعہ میں تھا وہاں ... زیدی صاحب کے یہاں سے میرا گھر کا سا معاملہ تھا۔ ایک روز ان کا فون آیا کہ گاڑی بھیج رہا ہوں، فوراً آجاؤ۔ میں پہنچا۔ کہنے لگے ہم لوگ ایک بڑی مصیبت میں گرفتار ہو گئے ہیں۔ آج ذاکر صاحب بالکل اچانک آگئے حالانکہ آج انہیں میسور جانا تھا اور ان کا یہاں کوئی پروگرام نہیں تھا۔ اور ستم یہ کہ آج رات کو میرا اور بیگم زیدی کا ڈنر رادھا کرشنن کے یہاں ہے۔ اب رات کے کھانے کا مسئلہ ہے۔ ہم لوگوں نے سوچا تو فوراً خیال تمہارے نام پڑا۔ تم میزبانی کے فرائض انجام دو۔ کوئی نوجوان کا ساتھ دے۔ پھر ذاکر صاحب کو بھی یہ بات معلوم ہو گئی کہ آج میں ان کے ساتھ کھانا کھا رہا ہوں۔ اس رات ہم دونوں اکیلے تھے۔ ایسا موقع بہت کم ملا کہ ذاکر صاحب سے تنہائی میں اتنی لمبی گفتگو رہی ہو۔ کھانے کے وقت ہم لوگ ڈرائنگ روم میں آن بیٹھے۔ ان کے یہاں ایک "آتش دان" بنی ہوئی تھی جس سے جھانک کر وہاں کے لوگ دیکھتے تھے کہ کھانا کم تو نہیں رہا ہے۔ کھانا لگ چکا تو ذاکر صاحب نے ملازم کو بلا کر کہا دیکھو بھئی ہم پرانی وضع کے آدمی ہیں۔ جب کوئی جھانکتا رہتا ہے تو ہم سے کھانا نہیں کھایا جاتا لہٰذا تم یہاں سے چلے جاؤ ہم دونوں اطمینان سے کھا لیں گے۔ وہ چلا گیا اس کے بعد مجھ سے کہنے لگے حضرت! آپ سے صرف ایک درخواست ہے کہ آپ کی اور ہماری نشست میں تبدیلی ہونی چاہئے۔ آپ ادھر تشریف لائیے میں آپ کی طرف آتا ہوں۔ پہلے تو میں سمجھا نہیں پھر بعد میں یہ بات سمجھ میں آئی کہ ان کا کھانا بغیر نمک مرچ کے تھا۔ کہنے لگے آپ اس کو کھائیے! آج آپ کو پتہ لگے گا کہ کس کھانے پر میری زندگی گذر رہی ہے اور میں آج بد پرہیزی کروں گا۔ آپکا کھانا کھاؤں گا۔ میرے بھی منہ میں زبان ہے۔ میرا بھی جی چاہتا ہے کہ اچھی چیز کھاؤں۔ میں نے کہا صاحب! آپکو نقصان کریگا کہنے لگے، نصیحت کرنیوالے بہت ہیں خدا کے واسطے آپ نصیحت نہ کیجئے۔ میں خاموش ہو کر وہ کھانا کھاتا رہا بے نمک اور مرچ کا سوپ تھا۔ دوسری طرف مسالے دار اچار اور پلاؤ مرغ تھا وہ ذاکر صاحب شوق سے کھاتے رہے۔ فارغ ہو کر بیٹھے تو کہنے لگے۔ جو کچھ ہونا تھا وہ ہو چکا۔ اب اگر تم نے ان لوگوں سے کہہ دیا تو اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ مجھے جتنا نقصان نہیں پہنچے گا اس سے زیادہ ان لوگوں کو تکلیف پہنچے گی۔ اسلئے بہتر یہ ہے کہ یہ راز ہمارے تمہارے درمیان ہی رہے میں نے بھی کسی سے نہیں کہا۔

علی گڑھ سے جانے کے بعد وہ بڑے مردم بیزار ہو گئے تھے۔ جامعہ میں شبیر زیدی صاحب نے اعلان کرا دیا تھا کہ ذاکر صاحب سے ملنے کوئی نہ جائے۔ وہ یہاں صرف آرام کرنے کے لئے آئے ہیں۔ میں وہاں گیا تو مجھے یہ باتیں معلوم ہوئیں، تو میں ذاکر صاحب سے قصداً ملنے نہیں گیا۔ ایک روز میں ادھر سے گذر رہا تھا تو میری نظر پڑ گئی۔ میں سلام کر کے آگے نکل گیا۔ انھوں نے بلوایا اور بولے: کیوں حضرت! علی گڑھ جا کے یہ بے نیازی! میں نے کہا مجھے معلوم ہوا ہے آپکی صحت ٹھیک نہیں ہے۔ لوگوں سے

ملنا پسند نہیں کرتے۔ کہنے لگے یہ تو میں جامعہ کے لوگوں سے کہہ رکھا ہے۔ علی گڑھ سے کوئی ہوا بھی آتی ہے تو جی چاہتا ہے کہ اس سے پوچھ لیں کہ وہاں کا کیا حال ہے۔ پھر دیر تک باتیں کرتے رہے۔ اس کے کافی دنوں کے بعد انہوں نے پٹنہ سے مجھے ایک خط لکھا جلد کچھ اس طرح کا تھا کہ حضرت بڑے مردم بیزار بنتے تھے آج آدمیوں کو ترستے ہیں۔ کہنے لگے اب یہاں کسی سے ملاقات نہیں ہو نہ سکا۔ ملاقاتیں ہوتی ہیں، کسی سے دوستانہ رشتہ نہیں ہے۔

ایک بار ۲ اکتوبر کو صرف بچوں کو جمع کرکے ہم گاندھی جینتی منانا چاہتے تھے۔ ہم لوگ چاہتے تھے اس موقع پر کوئی ہنگامہ نہ ہو، کچھ خاص لوگوں کو مدعو کر لیا جائے۔ جواہر لال سے ہم لوگوں نے درخواست کی تو انہوں نے ہماری بات مان لی۔ میں انہیں اس خیال سے بھی بلا رہا تھا کہ وہ ذاکر صاحب سے مل لیں۔ انہوں نے کہا ذاکر صاحب اگر اس جلسے میں آگئے تو میں ضرور آؤں گا۔ میں علیگڑھ گیا اور ذاکر صاحب کو دعوت دی، انہوں نے کہا میں ضرور آؤں گا اور خطبہ بھی دوں گا۔ جواہر لال سے کہہ دیجئے، وہ آخر میں تقریر کریں۔ چنانچہ ذاکر صاحب آئے اور خطبہ دیا۔ بچوں کے لئے سادہ زبان میں، انتہائی خوبصورت اور باوقار خطبہ تھا وہ۔ آخر میں جواہر لال نہرو تقریر کرنے کے لیے کھڑے ہوئے۔ انہوں نے کہا آپ نے میرے ساتھ بڑی ناانصافی کی کہ ذاکر صاحب کے بعد مجھ سے تقریر کرنے کیلئے کہا، چونکہ وہ اکھڑے اکھڑے لہجہ میں بولتے تھے اور ذاکر صاحب ان کے برخلاف جم کر بولتے تھے۔

ان کی فرمائش پر ایک اسکول ہم لوگوں نے کھولا تھا جو آج ذاکر حسین مڈل اسکول کے نام سے چلایا جاتا ہے۔ میں جب مدراس جا رہا تھا تو انہوں نے کہا کہ وہاں کے پرائمری ایجوکیشن کی تعریف سنی ہے تم ذرا اسٹڈی کرکے آنا اور اسی نہج پر یہاں ایک اسکول کھولنا لیکن یاد رکھو، گورنمنٹ سے ایک پیسہ نہیں لینا۔ یہ صحیح ہے کہ میں پریسیڈنٹ آف انڈیا ہوں، اور میں گورنمنٹ کو لکھ دوں تو مل ہی جائے گا لیکن اس قسم کے بہت سے ادارے چلتے رہتے ہیں تم ایسا نمونہ کا اسکول کھولو جو گورنمنٹ کی مدد کے بغیر چلے۔ چنانچہ ذاکر صاحب کی ہدایت کے مطابق ہم نے اسکول کھولا۔ بعد میں ہمیں یوپی گورنمنٹ کی طرف سے آفر بھی آئے لیکن ہم نے انکار کر دیا۔ اور کمال یہ ہے کہ ٹیچروں کو بھی ہم نے کم تنخواہ پر راضی کر لیا۔ اس زمانے میں صرف پچاس روپے تنخواہ تھی۔ اب ساڑھے تین سو تک (Rs 350/:) پہنچی ہے۔

میری طرف سے انہیں ایک شرمندگی ہو گئی تھی۔ انہوں نے مجھے جامعہ سے اسلامک اسٹڈیز کیلئے علی گڑھ بلایا۔ جب میں یہاں آیا تو قاضی عبدالغفار کا انتقال ہو گیا۔ انہوں نے سرور صاحب کو انجمن کا سکریٹری مقرر کیا ـــــ سرور صاحب نے کہا میں اتنی افراتفری میں کیا کروں۔ انہوں نے کہا میں ایک مناسب آدمی آپ کو دوں گا۔ پھر انہوں نے مجھ سے کہا ابھی میں نے تو آپکو بلایا تھا اسلامک اسٹڈیز کیلئے، لیکن ابھی انجمن کو بڑی سخت ضرورت پیش آگئی ہے۔ حالانکہ انہیں معلوم بھی نہیں تھا کہ ایسے کاموں سے مجھے دلچسپی ہے بھی یا نہیں۔ انہوں نے کہا جب انجمن کے حالات سدھر جائیں، تو پھر بعد میں یونیورسٹی آجانا،

بہر حال جب میں یہاں آیا تو سرور صاحب سے میرے تعلقات خوشگوار نہیں رہ سکے۔ ذاکر صاحب کو کسی ذریعہ سے یہ بات معلوم ہو گئی، انہیں بہت افسوس ہوا۔ ایک روز انہوں نے مجھ سے کہا تم فارسی میں ایم اے کرو، اسوقت میں اردو میں ایم اے کر رہا تھا۔ میں نے عرض کیا کہ میں اردو میں ایم اے کر رہا ہوں، فارسی میں کر کے کیا کروں گا۔ کہنے لگے یہ میرا حکم ہے۔ میں نے انکے حکم پر فارسی میں ایم اے کر لیا۔ لیکن اسوقت تک ذاکر صاحب وہاں سے جا چکے تھے۔ ادھر سرور صاحب سے میرے تعلقات خراب ہوتے گئے۔ بات چیت بند تھی سوچئے یہ کتنی خراب بات ہے کہ آدمی کام کر رہا ہو اور ہیڈ آف دی انسٹی ٹیوشن سے بات چیت نہ ہو۔ اور استعفا صرف اسلیے نہیں دے رہا تھا کہ ذاکر صاحب نے وہاں رکھا تھا۔ ذاکر صاحب کو برابر اسکا افسوس رہا کہ میں نے اس کو بلایا اور کیا کچھ نہیں۔ کافی دنوں کے بعد ذاکر صاحب کو میں نے خط لکھا کہ میں نے بچپن میں ایک کہانی پڑھی تھی جو آج بھی مجھے بہت پسند ہے کہانی کچھ یوں تھی کہ ایک شخص نے اللہ سے دعا کی کہ مجھے ایسی طاقت عطا فرما کہ میں جس چیز کو چھو دوں، وہ سونا ہو جائے اللہ نے اس کی دعا قبول کی، اس کے بعد اس کا کھانا پینا سب سونا ہو جاتا تھا۔ یہاں تک کہ اس نے اپنی بچی کو اٹھایا تو وہ بھی سونے کی ہو گئی۔ تب اس کو اپنی بے توفی کا احساس ہوا جبکہ اس نے دوبارہ دعا کی کہ اس سے یہ قوت سلب کر لی جائے۔ اس کی دعا قبول ہوئی ــــ یہ کہانی آپ نے بھی پڑھی ہو گی۔ مجھ میں یہ صلاحیت تو نہیں پیدا ہوئی لیکن ایک عجیب و غریب صلاحیت پیدا ہو گئی ہے اور وہ یہ کہ میں جس انسان کو چھو لیتا ہوں وہ پتھر کا ہو جاتا ہے اسلئے آپکو میں دور ہی سے دیکھنا چاہتا ہوں۔ اس خط کا جواب بہت اچھے انداز میں دیا تھا انہوں نے۔

●●

جناب عبدالماجد خاں
(دہلی)

ہمارے جامعہ کے ماسٹر صاحب

شاید ۱۹۴۴ء میں میں جامعہ ملیہ میں پڑھتا تھا۔ وہیں ڈاکٹر ذاکر حسین صاحب پڑھاتے تھے۔ ان کے پڑھائے ہوئے بعض لیسن آج تک مجھے یاد ہیں۔ جامعہ چھوڑنے کا اتفاق ایسے ہوا کہ مجھے نمونیہ ہو گیا تھا اور بہت بری حالت ہو گئی تھی۔ ڈاکٹر صاحب اسپتال میں تشریف لاتے تھے۔ میں نے ایک دن ان سے کہا کہ ماسٹر صاحب (ماسٹر صاحب) بہت کڑوی دوائیاں پینی پڑتی ہیں۔ میں گھر پر ہوتا تو مزیدار دوائیاں ملتیں، خمیرہ وغیرہ ملتا۔ انہوں نے شربت، خمیرہ کا انتظام کرا دیا۔ خمیرہ آیا، میں روز کھاتا تھا۔ ایک واقعہ ایسا ہوا کہ کلاس کا ٹائم تھا۔ کلاس لگ رہے تھے۔ محمد علی ہال تھا۔ آج کل کی شکل میں تو نہیں تھا۔ پہلے مسجد کی شکل تھی۔ محمد علی ہال کہلاتا تھا۔ میں مسجد کے باہر کھڑا ہوا تھا۔ وہاں کسی لڑکے کو میں نے آواز دی "اے لونڈے" کر کے۔ ڈاکٹر صاحب وہیں کہیں کھڑے ہوئے تھے یا گذر رہے تھے ادھر سے۔ وہ اکثر دل میں بیٹھ گئے اور مجھے پکڑ لیا اور بولے کہ دیکھو "لونڈا" نہیں کہتے "لڑکا" کہتے ہیں۔ ایک جرمن لیڈی تھیں جن کو ذاکر صاحب لائے تھے۔ مس آپا جان کہلاتی تھیں۔ وہ ہوسٹل میں بچوں کی دیکھ بھال کیا کرتی تھیں۔ تیل لگانا، نہلانا، کپڑے پہنانا۔ یہ سب چیزیں کرتی تھیں۔ اور بچوں میں بڑی رچی بسی ہوئی تھیں وہ۔ یہ بڑی خاص بات تھی اور وہ جنگ کے دنوں میں رہتے تھے۔ برٹش گورنمنٹ نے جرمن جو تھے، ان سب کو یہاں پکڑ لیا تھا۔ تو وہ آپا جان بھی جیل میں رہیں۔ وہ اس دوران پریشان ہو گئیں۔ ان کا بڑا بہت استقبال کیا گیا اور بڑا جوش و خروش تھا۔ لیکن اس کے بعد وہ زیادہ دن تک زندہ نہیں رہ سکیں [illegible] ہی میں ان کا انتقال ہو گیا۔ جامعہ ملیہ سے تھوڑے سے فاصلے پر ان کی قبر تیار کی گئی۔ بچوں نے وہاں تک [illegible] بنائی اور وہاں انہیں دفن کیا گیا۔ ڈاکٹر صاحب بہت زمانے کے بعد کویت ایمبیسی کے ایک فنکشن میں ملے تھے جب وہ [illegible] پریسیڈنٹ تھے۔ ان سے بات چیت کے دوران جب میں نے کہا صاحب! آپ نے تو ہمیں پڑھایا ہے۔ انہوں نے کہا بھئی میری نظر بہت کمزور ہو گئی ہے اور جن بچوں کو میں نے پڑھایا تھا ان کی شکلیں بھی بدل گئی ہیں، اس لئے پہچاننے میں دقت ہوتی ہے۔ اس طرح کی باتیں انہوں نے کیں۔

وہ درویش صفت آدمی تھے۔ اس کا کوئی شک نہیں، وہ بچوں میں گھلے ملے ہوئے تھے۔ حالانکہ میرے بہت چھوٹے تھے، تیسری جماعت میں

ہوتے ہوئے وہ ہر وقت بچوں میں رہتے تھے۔ ایسا محسوس ہوتا تھا جیسے کہ وہ والدین ہیں۔

ڈاکٹر صاحب معلومات عامہ (G.K.) کا کلاس لیتے تھے تو ان میں انہوں نے سانپ کے بارے میں پڑھایا تھا۔ کیسے دانت ہوتے ہیں۔ کیسی تھیلیاں ہوتی ہیں زہر کی۔ اور اس کی ساری ڈرائنگ بنا کر بورڈ پر دکھایا تھا۔ وہ لیسن (lesson) آج تک یاد ہے۔

جناب اولاد احمد صدیقی

ذاکر صاحب اور علی گڑھ

۱۔ ابتدائیہ، علیگڑھ اور تقسیم ہند

اس صدی کے چوتھے دہے میں جب ہندستان کی جنگ آزادی نے ایک فیصلہ کن موڑ کے خدوخال فراہم کرنا شروع کیے، مسلمان قوم سیاست کے گرداب میں پڑ گئی۔ اس کا اثر مسلمانوں کے تمام تہذیبی اور علمی مراکز پر پڑا، جن میں مسلم یونیورسٹی خصوصیت کے ساتھ قابل ذکر ہے۔ سرسید نے اس ادارہ کو قائم کرتے وقت اسے ملک کی وقتی سیاست سے اجتناب کرنے پر اصرار کیا تھا، اور سیاست سے بڑی حد تک لاتعلقی بیسویں صدی کی تیسری دہائی تک برقرار رہی۔ اس کے اچھے اور برے اثرات کا تجزیہ کرنا مقصود نہیں۔ مقصد یہ واضح کرنا ہے کہ تقسیم ہند سے پیش آنے والے مسائل کے نتیجے کے طور پر اس ادارہ کا وجود خطرہ میں پڑ گیا اور خود مسلمانوں کو اس کا مستقبل غیر یقینی نظر آنے لگا۔ ہندستان کی سیاسی قیادت جو کانگریس کے زیر سایہ پروان چڑھی تھی اور جس کی سطوات میں ہندستان کے تمام مذہب کے ماننے والوں کی روایات کا احترام عقیدہ کی حیثیت رکھتا تھا، آزاد ہندستان میں ایک مسلم ادارہ کے برقرار رکھنے کی ضرورت کا احساس رکھتی تھی چنانچہ آزادی کے بعد ہندستان کے سربرآوردہ اشخاص نے مسلم یونیورسٹی کی بقا اور استحکام کی جو کوششیں کیں، ان کی طرف ڈاکٹر ذاکر حسین کا یونیورسٹی کی سربراہی کیلئے انتخاب ایک اہم قدم تھا۔

آزادی کے بعد یونیورسٹی کو چند اہم سیاسی اور سماجی مسائل کا سامنا تھا۔ سیاسی سطح پر ملک کے ایک طبقہ میں اس کا فرقہ وارانہ تصور قائم ہو چکا تھا اور اسے لوگ شک و شبہ کی نظر سے دیکھنے لگے تھے۔ ان میں سے بعض انتہا پسند ادارہ کو بیرون ملک کے مفادات سے وابستہ اغراض رساں تصور کرنے لگے تھے۔ دوسرا مسئلہ اس ادارہ کے اندر اساتذہ اور طلبا کی کم ہوتی ہوئی تعداد پیدا کر رہا تھا۔ اساتذہ کی ایک خاصی تعداد نئی قائم شدہ مملکت میں اپنی قسمت آزمائی کیلئے جا چکی تھی اور اس ادارہ کے اکثر شعبے قابل اور تجربہ کار اساتذہ کی رہنمائی سے محروم ہو چکے تھے۔ طلبا کی تعداد بھی کم ہو گئی تھی۔ ان غیر یقینی حالات میں یونیورسٹی

---

* یہ مضمون ڈاکٹر ذاکر حسین کے مسلم یونیورسٹی کے وائس چانسلری کے دور سے متعلق ہے، اور تاثراتی ہے۔ اس میں ایک خاص نقطۂ نظر کی وضاحت کی گئی ہے۔ بقول مولانا ابوالکلام آزاد "ملی کاموں کو کہ ہم پر شہادت دینی چاہئے، بہتر ہے کہ خود آپ ہی اپنے لئے شاہد بن جائیں" (تذکرہ) صدیقی

کے اندر اعتماد کی ایک عام فضا کا قیام کرتا اور علمی ماحول کو بحال کرتا" ایسے سنگین مسائل تھے جو نئے سربراہ کی راہ تک رہے تھے۔

یونیورسٹی کی سربراہی کے لیے، ڈاکٹر ذاکر حسین کی موزونیت میں کلام نہیں ہو سکتا۔ ان کے مستعد credential ہر لحاظ کے شبہ سے بالاتر تھے۔ وہ بیس سال تک ایک اعلیٰ ادارے کی قیادت کر چکے تھے اور سماجی، علمی اور سیاسی سطح پر ان کی لیاقت کا اعتراف عام تھا۔ مسلم یونیورسٹی سے بظاہر بے تعلق کے باوجود اُس کی علمی اور تعلیمی تحریک سے اصولی رابطہ قائم رکھا تھا۔ ان سب پر مستزاد وہ اسی ادارہ کے طالب علم رہ چکے تھے۔ ان کی شخصیت میں وقار، ان کے کردار اور گفتار کی استقامت، ان کی فکر کی وسعت اور وفاداری بشرط استواری کا اعتراف، اُن کی موزونیت کا ثبوت فراہم کرتے تھے۔ روایت ہے کہ مولانا ابوالکلام آزاد کی تحریک پر جواہر لال نہرو نے ان کے انتخاب پر اتفاق کیا تھا۔ ڈاکٹر ذاکر حسین نے بہر لحاظ ذہنی کے اسی آمادگی سے اس ادارہ کی آبادکاری کی ذمہ داری سنبھالی جس طرح ۱۹۲۶ء میں انھوں نے جامعہ ملیہ کی ڈوبتی ہوئی کشتی کو بھنور سے نکالنے کی کوشش کی تھی۔

سوال یہ ہے کہ آزاد ہندوستان میں علی گڑھ اتنی اہمیت کا مستحق کیوں قرار دیا گیا؟ اور اس ادارہ کی آبادکاری کی طرف ہندوستان کے مقتدر اشخاص نے اس کی ضرورت کیوں محسوس کی؟ اس کی وجہ صاف طور پر یہ نظر آتی ہے کہ علی گڑھ مسلمان قوم اور آزاد ہندوستان کی سیکولر جمہوری ریاست دونوں کی نظر میں ملک کی سماجی اور تعلیمی زندگی میں ایک اہم مقام کا مالک نظر آتا تھا۔ علی گڑھ انیسویں صدی کی سب سے بڑی اور پُر عظمت مسلم تعلیمی اور سماجی تحریک کے تحت وجود میں آیا تھا۔ سرسید اور ان کے رفقا نے علی گڑھ تحریک کے ذریعہ زوال آمادہ مسلم معاشرے کے جمود میں ہلچل پیدا کرنے کی کوشش کی تھی۔ اُن کی یہ خواہش تھی کہ مسلمان اپنے قدیم سرمایہ کے قیمتی عناصر کو تلاش کر کے جدید سائنسی اور تکنیکی علوم کے روز افزوں، اضافہ پذیر سرمایہ کے امتزاج سے ایک نئے مسلمان ذہن کی تشکیل میں مدد دیں۔ ۱۸۷۵ء سے لے کر ۱۹۴۷ء تک ستّر سال سے چند سال زیادہ ہوتے ہیں۔ اس مدت میں پہلے کالج اور پھر یونیورسٹی نے جو سب سے بڑا اثر مسلمانوں کی معاشرت پر ڈالا وہ جدید تعلیم سے رغبت اور اس کے حصول کی کوشش کی سعی تھی۔ جدید مغربی تعلیم کا حیات آفریں اثر قوم کو متاثر کرنے لگا تھا۔ اس نے اگرچہ مسلمانوں میں تشکیک کے جذبے کو جنم نہیں دیا جو معاشرت کی اصلاح کی طرف پہلا قدم ہے، مگر اس نے مسلمانوں میں قدیم تعلیم سے ناآسودگی کا احساس ضرور پیدا کر دیا۔ کالج کی نئی تربیت یافتہ نسل مسلمان قوم کی مذہبی، علمی اور سیاسی قیادت نئے اصول سے حالات کی روشنی میں وضع کرنے سے قاصر رہی۔ وقت گزرنے کے ساتھ یہ ادارہ مسلمانوں کے متوسط طبقہ میں موجود خیالات کا ترجمان اور عام مسلمانوں میں ایک جذباتی لگاؤ کا مظہر بن گیا۔ اس طرح یہ ادارہ ملک کی آزادی سے قبل ہندوستان کے اندر اور ہندوستان کے علاوہ دنیا کے دوسرے ممالک میں بھی اسلامی تہذیب و تمدن اور اسلامی تحریکات کا محور تصور کیا جانے لگا۔ مسلمانوں میں موجود رجحانات کی ترویج اور ان میں کام کرنے والی تحریکات یا انگریزوں کی تسلیم شدہ ہندوستانی مسلم ریاستوں میں دیکھے جا سکتے تھے۔

یا پھر علی گڑھ میں۔ ہندستان میں مسلمان قوم علی گڑھ کو اپنی روایات کا بہترین ترجمان اور ملک میں اپنی سماجی اور سیاسی شناخت کا نقیب سمجھتی تھی۔

آزاد ہندستان کی حکومت وسیع جمہوری بنیادوں کے علاوہ سیاست کے اصول کے پیش نظر اور اس ملک کی برصغیر والی وسعت کو ملحوظ رکھ کر اور اس میں نسلی، لسانی، مذہبی اور جغرافیائی فرق کے زیر اثر اس ملک کے ہر باشندہ کو یکساں سلوک اور یکساں ترقی کے مواقع فراہم کرنے کے لئے اپنے آپ کو پابند سمجھتی تھی۔ اقلیتی مسلمان فرقہ کے مفادات دستور ہند کے عطا کردہ حقوق کی روشنی میں محفوظ کرنا جمہوری سیکولر ریاست کو اپنا فرض نظر آیا۔ چنانچہ اس ادارہ کو ریاست اپنی کل مالی کفالت دینے کے لیے اور اس کی سالمیت برقرار رکھنے کے لیے ایسے شخص کو سربراہی سپرد کرنے کی خواہش رکھتی تھی جو نئے حالات میں مسلم قوم اور ہندستانی ریاست کے درمیان مقاصد میں ہم آہنگی پیدا کرنے کے لیے ایک پل کا کام دے سکے۔ ذاکر صاحب پر ملک کے ارباب حل و عقد کو کل بھروسہ تھا کہ وہ دونوں فریقوں کو مطمئن کر سکیں گے۔ ایک طرف تو مسلمان قوم کو علی گڑھ کے توسط سے ریاست کی ہمدردی اور معاونت کا یقین دلاتا، اور دوسری طرف مسلمانوں کو آزاد ہندستان میں ان کے فرائض کی نشان دہی کراتا۔ ذاکر صاحب نے اس حقیقت کو اچھی طرح محسوس کر لیا تھا کہتے ہیں:

"... میں آنے پر اور یہاں ٹھہرنے پر صرف اس لیے اپنے آپ کو راضی کر سکا کہ مجھے صاف محسوس ہوا کہ یہاں ایک اہم قومی کام کا نادر موقع ہے — کرشمہ دامن دل می کشد کہ جا اینجاست، وہ کام ہے ہندستانی تمدن اور ہندستانی تعلیم دونوں کا بنیادی کام یعنی ایک سیکولر جمہوری ریاست میں ایک متحدہ قوم کی تعمیر کا کام اور اس کی زندگی میں چار کروڑ مسلمان شہریوں کا حصہ اور مقام۔"

آگے چل کر زیادہ وضاحت سے کہتے ہیں

"ہماری قومی زندگی میں فرقہ وارانہ کشاکش کی یاد سے ان تنگ دل اور کوتہ اندیش لوگوں کو موقع مل جاتا ہے کہ اپنی غیر ہمدردانہ غلط بیانیوں کو لوگوں سے باور کرا لیں۔ ایک ہندستانی کی حیثیت سے میں اپنا فرض سمجھتا ہوں کہ اس غیر صالح طرز فکر کو اس نامراد کوشش میں ناکام بناؤں کہ وہ وفادار مسلمان شہریوں کو یہ محسوس کرائے کہ وہ اپنے دیس میں پردیسی ہیں۔"

مسلمانوں کے وقار کی علامت یعنی علی گڑھ پر جو ذمہ داری عائد ہوتی ہے اس کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہتے ہیں

"علی گڑھ جس طرح کام کرے گا، علی گڑھ جس اسلوب پر سوچے گا، علی گڑھ ہندستانی زندگی کے مختلف شعبوں کے لئے خدمت کی جو پیش کش کر سکے گا، اس سے متعین ہوگا ہندستانی قومی زندگی میں مسلمانوں کا مقام۔ ہندستان جو سلوک علی گڑھ کے ساتھ کرے گا اس پر یہاں بڑی حد تک اس پر منحصر ہوگی وہ

شکل جو ہماری قومی زندگی مستقبل میں اختیار کرے گی۔ میں اعتماد کے ساتھ کہتا ہوں کہ علی گڑھ قومی زندگی کے
مالا مال کرنے میں کوئی دقیقہ اٹھا نہیں رکھے گا اور جائز طور پر امید رکھے گا کہ عالم بھی خوبی کے سہارے اور اس حق
سے جو خدمت سے پیدا ہوتا ہے وہ اس چمن میں ایک معزز جگہ بنا سکے گا۔

علی گڑھ تحریک کے جاندار عناصر

ڈاکٹر ذاکر حسین علی گڑھ اس لئے آئے تھے کہ ہندوستان کے بدلے ہوئے حالات میں وہ علی گڑھ تحریک کے جاندار عناصر کی شناخت کریں اور ان کو دوبارہ فروغ دینے کے امکانات کو مستحکم کر سکیں۔ کالج کے یونیورسٹی میں تبدیل ہونے تک کا زمانہ سرسید کی اصلاحی تحریک کے نشوونما کا زمانہ ہے۔ یونیورسٹی قائم ہونے کے بعد یہ تحریک صرف ایک یاد کے طور پر باقی رہ گئی۔ سرسید کا خیال تھا کہ جدید تعلیم مسلمانوں کو اصلاح معاشرت کی طرف خود بخود مائل کرے گی اور ان کے اندر مذہب کی روح کو سمجھنے اور اس کے ذریعہ زندگی گذارنے کے اعلیٰ ترین مقاصد کے حصول میں فیضان حاصل کرنے کی ضرورت کا احساس دلائے گی۔ مگر ہوا یہ کہ جدید تعلیم کے صرف چند پہلوؤں پر توجہ مرکوز ہو کر رہ گئی، جس میں سرکاری ملازمتوں کا حصول سرفہرست تھا اور اصلاح معاشرت اور آزاد پیشوں کے اختیار کرنے کی طرف رجحان ظاہر نہیں ہو سکا۔ ذاکر صاحب کے نزدیک علی گڑھ تحریک کے جاندار عناصر کی کارفرمائی جامعہ ملیہ کے تعلیمی اور تربیتی پروگرام میں دیکھے جا سکتے تھے۔ جامعہ ملیہ نہ صرف علی گڑھ تحریک کو زندہ رکھنے میں کامیاب ہوئی تھی، بلکہ اس نے ایک متحدہ قومی زندگی میں مسلمانوں کے مقام اور ان کے کردار کا نقشہ بھی پیش کر دیا تھا۔

علی گڑھ تحریک کے جاندار عناصر ذاکر صاحب کے نزدیک مندرجہ ذیل نکات پر مشتمل ہیں۔

۱۔ اسلامی علوم اور اسلامی تاریخ کا مطالعہ اور ان کی تحقیق میں اعلیٰ معیار قائم کرنا۔

۲۔ ہندوستان کے مسلمانوں کی آئندہ زندگی کا ایسا نقشہ تیار کرنا جس کا مرکز مذہب اسلام ہو اور اس میں ہندوستانی قومی تہذیب کا وہ رنگ بھرنا جو عام انسانی زندگی میں کھپ جائے۔

۳۔ جماعت کا اپنی صالح روایات پر اعتماد، اجتماعی زندگی کی تعلیم اور تربیتی تاثیر کا اقرار۔

۴۔ ذہنی کاہلی اور روحانی تعطل کا خاتمہ۔ ۵۔ علم کی تعمیری اور تنویری قوتوں پر یقین۔

۶۔ سوسائٹی کی خدمت کے لیے ہر قسم کے مفید پیشے سکھانا اور روزی کمانے کے قابل بنانا۔

ڈاکٹر ذاکر حسین یہ سمجھتے تھے کہ آزاد ہندوستان میں علی گڑھ کو ایک اہم کردار ادا کرنا ہے اور یہ اسی وقت ممکن ہے جب یونیورسٹی کے طالب علم حسن خدمات اور صفات عالیہ اپنے اندر پیدا کر کے ملک میں اپنا معزز اور

ممتاز جگہ بنائیں۔ یہ اُسی وقت ممکن ہے جب علی گڑھ تحریک کے پائیدار عناصر پر عمل مرکوز ہو۔ اس لیے انھوں نے یہ ضروری سمجھا کہ ان عناصر کو واضح کر دیں اور ان کو بروئے کار لانے کی کوشش کی ہمت افزائی کریں۔ اس ضمن میں اسلامی علوم و فنون میں تحقیق کا کام شروع کیا جائے، تاکہ مختلف شعبہ جات میں مسلمانوں کے کارناموں کو تنقید کی بے لاگ کسوٹی پر پرکھا جاسکے، اور ماضی پرستی کے بوجھ کو کندھے سے اتار پھینکا جائے۔ تقلید و توارث کے بجائے اجتہاد و وسعت کے انداز فکر کو اپنایا جائے۔ آزاد ہندوستان میں ایسے شہریوں کی ضرورت تھی جو وقت کے تقاضوں کو پورا کر سکیں۔ اس میں جماعتی زندگی کی تعلیم اور تربیتی تاثیر ان کے نزدیک اہم تھے۔ جماعتی زندگی جزو اور کُل میں ہم آہنگی پیدا کرنے کی تعلیم دیتی ہے۔ شخصی اختلافات کو بحث و مباحثہ کے ذریعہ طے کرنے پر اصرار کرتی ہے اور مناقشہ اور تصادم سے اجتناب پر زور دیتی ہے۔ ڈاکٹر ذاکر حسین کے ذہن میں علی گڑھ تحریک کو دوبارہ اس طرح زندہ کرنا مقصود تھا کہ اسلام کی راہ پر چلتے ہوئے ہندوستان کی قومی تہذیب کی تشکیل میں مسلمان بغیر تحفظات ذہنی کے حصہ لیں، تاکہ متحدہ قومیت کا خواب عملی صورت اختیار کرلے۔ اس کے علاوہ تحصیل علم میں انہماک وہ دستگاہ فراہم کرے گا جس سے مسلمان ایسے پیشے اختیار کرنے کے قابل ہوں گے جو زندگی کی نعمتوں کو ان کی دسترس میں پہنچا دے سکیں۔ مولانا ابوالکلام آزاد نے بھی اسی حقیقت کی طرف اشارہ کیا تھا جب وہ ۲۰ فروری ۱۹۴۹ء کو جلسۂ تقسیم اسناد میں خطبہ دینے کے لیے علی گڑھ آئے تھے:

"تم اس آزاد ہندوستان کے باشندے ہو، اور ملک کی قسمت کی باگ خود تمہارے ہاتھوں میں آچکی ہے ... ایک آزاد ملک کا فرد جو کچھ اور جہاں تک حاصل کرسکتا ہے وہ سب کچھ تمہارے لیے موجود ہے۔ آج کوئی بھی دروازہ تم پر بند نہیں، بشرطیکہ تم قابلیت کی پختگی اور محنت کی سرگرمی اور سب سے بڑھ کر یہ کہ سیرت کی مضبوطی کے ساتھ قدم بڑھا سکو ... تمہیں اب زندگی کی جدوجہد میں نئے ارادوں اور نئی اولوالعزمی کے ساتھ قدم اٹھانا ہے۔ اجنبی حکومت کی وفاداری تمہارے لیے محض ایک وقتی مصلحت تھی، اپنی قومی حکومت کی وفاداری تمہاری قومی زندگی کا بنیادی فریضہ ہے۔"[۵]

یونیورسٹی کی توسیع و ترقی

خود اعتمادی کی فضا کی بحالی کے بعد یونیورسٹی کی توسیع و ترقی دوسرا اہم مسئلہ ڈاکٹر ذاکر حسین کے سامنے تھا۔ انھوں نے کہا:

"میرا ارمان ہے کہ جس یونیورسٹی سے میرا تعلق کسی نہ کسی حیثیت سے اب کوئی چالیس برس سے ہے اور جس سے اس وقت میں ایک ذمہ دار حیثیت سے وابستہ ہوں، اور جو آپ سب کی بھی آنکھ کا تارا ہے، وہ ہندستانی جامعات میں ایک ممتاز مرتبہ حاصل کرے ... تو اس ملک میں مسلمانوں کے لیے باشرف و باعزت شہریت کی ضمانت ہو جائے۔"[۶]

یونیورسٹی کی ترقی کے سلسلہ میں معقول مذہبی تعلیم کا انتظام انھوں نے ایک قومی ضرورت سمجھا:

"ہماری مذہبی تعلیم کی کوئی تین چوتھائی صدی میں ہم اپنے اسلامیہ مدرسوں اور کالجوں کے لیے کوئی قابل اطمینان نصاب بھی نہ بنا سکے . . . میرا ارادہ ہے کہ بہترین دینی مفکروں اور معلموں کی مدد سے یہ نصاب ترتیب دلاؤں، اور اس کے طریق تعلیم میں بھی ضروری تبدیلیاں کروں۔ اس میں مذہب لڑنے لڑانے کا ہتھکنڈا نہ ہوگا، بلکہ زندگی کو معنی و مقصد بخشے گا۔ اقدار عالیہ سے تعلق و شیفتگی پیدا کرے گا۔"

اس مقصد کے تحت یونیورسٹی کے سنّی اور شیعہ نصاب دینیات میں نئے موضوعات شامل کیے گئے اور پرانے نصاب پر مکمل نظر ثانی کی گئی۔ دینیات کے شعبہ جات کی اصلاح کار کمیٹیوں میں ملک کے ممتاز اشخاص کو شامل کیا گیا۔ خود وائس چانسلر نے ان شعبہ جات سے ذاتی دلچسپی کا اظہار کیا اور ان کی مجالس میں شرکت کی۔

ذاکر صاحب نے یورپ اور امریکا کا سفر اسی زمانہ میں کیا تاکہ ان یونیورسٹیوں میں رائج نئے رجحانات تعلیم و تنظیم سے اپنے آپ کو واقف کر سکیں، اور ان کو علی گڑھ میں نافذ کر سکیں۔ امریکا کے دورہ میں انھوں نے بعض یونیورسٹیوں کے اساتذہ کو علی گڑھ آنے کی ترغیب دی۔ ان میں مشہور ماہر معاشیات پال سویزی خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ سویزی اگرچہ اپنے مشاغل کی وجہ سے علی گڑھ نہ آسکے تاہم انھوں نے بہت سے مفید مشورے ذاکر صاحب کو دیے:

"میں مارچ میں امریکہ اور یورپ کے دورہ پر گیا تو یہ بھی علی گڑھ ہی کے لیے تھا۔ میں وہاں کے اداروں اور یونیورسٹیوں کے طریقہ تعلیم کو دیکھنا چاہتا تھا۔ وہاں کے اساتذہ اور تعلیمی کام کرنے والوں سے ملنا چاہتا تھا تاکہ علی گڑھ آکر اس سے فائدہ اٹھاؤں۔"

اس سے قبل انھوں نے امریکن یونیورسٹی کے ایک فاضل پروفیسر ہارا سنگر کی شعبہ نرگس کے لیے خدمات حاصل کیں۔ اس کے علاوہ انھوں نے ہندستان میں قائم شدہ ریاستہائے متحدہ ایجوکیشنل فاؤنڈیشن سے رابطہ قائم کیا، جس نے ہندستانی طلبا اور اساتذہ کی علمی لیاقت کی تربیت کے لیے امریکن یونیورسٹیوں میں داخلوں اور وظائف کی سہولتیں بہم پہنچائی تھیں۔ اس ادارہ سے تعلق کی وجہ سے یونیورسٹی کے بہت سے طالب علم اور اساتذہ فیضیاب ہوئے۔ اس کے علاوہ علمی اداروں نے بھی یونیورسٹی کے اساتذہ اور طالب علموں کو داخلے اور وظائف کی سہولتیں فراہم کیں۔ ان تمام کوششوں میں یہ جذبہ کام کر رہا تھا کہ جہاں تک ممکن ہو اس ادارہ ہی کے طالب علم اور اساتذہ مستقبل میں یونیورسٹی کے شعبہ جات کی قیادت سنبھالنے کے قابل ہو جائیں، اور اس طرح علمی روایات کے آگے بڑھنے کی راہ ہموار ہو جائے۔

تعدادِ طلبا

مندرجہ ذیل نقشہ ذاکر صاحب کے آنے کے وقت اور ان کے یونیورسٹی چھوڑنے کے وقت طلبا کی تعداد ظاہر کرتا ہے:

	۱۹۴۸-۴۹ء	۱۹۵۳-۵۴ء	۱۹۵۶-۵۷ء
آرٹس فیکلٹی	۸۶۰	۱۵۱۷	۲۶۶۱
سائنس فیکلٹی	۱۱۵	۱۳۵۲	۴۰۸۳
انجینئرنگ	۳۲۰	۴۸۲	۱۲۶۳
ویمنس کالج	۱۵۰	۲۲۲	۲۵۸
طبیہ کالج	۴۵	۱۲۲	۱۹۰
سٹی اسکول	۱۱۰۰	۱۲۰۰	۱۴۱۸
کل تعداد	۲۶۲۵	۴۹۰۰	۹۸۷۳

ذاکر صاحب نے جب ادارہ کو چھوڑا تو طالب علموں کی تعداد پہلے کے مقابلہ میں تین گنا زیادہ ہو گئی تھی۔ اور زیادہ مطمئن انداز میں طالب علم داخلوں کے لئے آنے لگے تھے۔ جہاں تک طلبا کی تعداد اور یونیورسٹی کے ماحول کا تعلق ہے، ذاکر صاحب کی موجودگی نے حالات کو خوشگوار بنانے میں مسیحا کا کام کیا تھا۔

بجٹ

حکومت ہند سے یونیورسٹی کو ۱۹۲۱ء سے تین لاکھ روپیہ سالانہ کی گرانٹ ملتی تھی، جس میں آزادی سے کچھ پہلے تین لاکھ کا اور اضافہ کیا گیا تھا۔ اس طرح تقریباً چھ لاکھ کے قریب یونیورسٹی کی مجموعی گرانٹ ہوتی تھی۔ ۱۹۵۰ء سے یہ گرانٹ گیارہ، بارہ لاکھ کے درمیان کر دی گئی۔ اس میں وہ عطیات شامل نہیں ہیں جو مخصوص اسکیموں کے تحت حکومت ہند یا اس کے متعلقہ اداروں سے حاصل ہوئے۔

معزز مہمانان

داخلوں اور بجٹ کے بعد ہماری توجہ یونیورسٹی میں تشریف لانے والے معزز مہمانان کی طرف جاتی ہے۔ جتنے معزز مہمانان کرام ذاکر صاحب کے زمانہ میں آئے، اتنے کسی وائس چانسلر کے زمانہ میں نہیں آئے۔ بیرونی سربراہان مملکت میں شاہ سعود اور شہنشاہ ایران قابل ذکر ہیں۔ ان کو استقبالیے دیئے گئے اور ان کے اعزاز میں خاص تقریبات منعقد کی گئیں۔ صدر مملکت ہند راج گوپال آچاریہ، ڈاکٹر راجندر پرشاد اور نائب صدر

ڈاکٹر رادھا کرشنن۔ یو۔پی کے وزرائے اعلیٰ پنڈت گووند بلبھ پنت اور ڈاکٹر سمپورنانند، سر مرزا اسماعیل اور State Reorganisation Commission کے ممبران جن میں سردار پانیکر قابل ذکر ہیں۔ یہ سب مختلف اوقات میں یونیورسٹی میں آئے۔ پنڈت جواہر لال نہرو نے بنفس نفیس اپنے عزیز دوست مولانا ابوالکلام آزاد کے نام پر موسوم یونیورسٹی لائبریری کی عمارت کا سنگ بنیاد رکھا۔ مولانا ابوالکلام آزاد نے ایک جلسہ تقسیم اسناد میں خطبہ پڑھا اور یونیورسٹی کو وزارت تعلیم کی سرپرستی کا یقین دلایا۔ ان کے علاوہ بہت سے ماہرین فن جو اس ادارہ کے مختلف شعبہ جات میں تشریف لائے، ان میں قابل ذکر آصف فیضی، ڈاکٹر وی۔ کے۔ آر۔ وی۔ راؤ، ڈاکٹر تارا چند ہیں۔ شعرا اور ادبا نے تو گویا علی گڑھ میں اپنا مقام دوبارہ حاصل کر لیا۔ جگر مراد آبادی، جوش ملیح آبادی، کنور مہندر سنگھ بیدی سحر، روش صدیقی، مولانا امتیاز علی خاں عرشی، قاضی عبدالودود، ڈاکٹر عبدالستار صدیقی، پنڈت برجموہن دتاتریہ کیفی نے مختلف مجالس کی صدارت کی یا شرکت کی۔ کئی کل ہند علمی کانفرنسیں بھی اسی زمانہ میں منعقد ہوئیں، جن میں سے چند کل ہند سائنس کانفرنس اور کل ہند اکنامکس کانفرنس ہیں۔ کھیل کے میدان میں کئی انٹر یونیورسٹی مقابلے علی گڑھ میں منعقد ہوئیں، اور اندرون خانہ اور بیرون خانہ کھیلوں کے بجٹ میں اضافے کیے گئے اور گیمس ٹیموں کی دوبارہ تنظیم کی گئی۔ غرض کہ پانچویں دہائی میں علی گڑھ کا "ذرہ ذرہ روشن خورشید عالم تاب" نظر آنے لگا۔

یونیورسٹی سے انجینیرنگ کالج کی ڈگری کے تسلیم کرنے کا مطالبہ التوا میں پڑا ہوا تھا۔ ڈاکر صاحب نے اسے حکومت سے تسلیم کرایا۔ اسی کی وجہ سے علی گڑھ کے سند یافتہ طالب علم حکومت کے مختلف شعبہ جات میں ملازم رکھے جانے لگے۔ فزکس کے پروفیسر گل نے کشمیر یونیورسٹی کے تعاون سے گل برگ میں ایک ریسرچ ابزرویٹری قائم کی جس کا سامان ایک امریکن یونیورسٹی نے فراہم کیا۔

ایک اور کارنامہ جس نے علی گڑھ کے ماحول کو خوشگوار بنا دیا اور جس کے لیے یونیورسٹی ہمیشہ ان کی شکر گزار رہے گی وہ یونیورسٹی کی چمن بندی ہے۔ ذاکر صاحب کے آنے سے پہلے علی گڑھ تند اور تیز ہواؤں کے چلنے کے موسم میں گرد اور طوفان کا سماں پیش کرتا تھا۔ ذاکر صاحب نے کئی طاقتور ٹیوب ویل نصب کرائے اور پانی کی فراہمی کے لیے نالیاں نکلوائیں۔ اسی کی وجہ سے یونیورسٹی کیمپس تھوڑے عرصہ میں سایہ دار درختوں، پھولوں اور سرسبز لانوں کا ایک چمن دکھائی دینے لگا۔ مجھے اکثر باہر کے مہمانوں کو یونیورسٹی کیمپس دکھانے کی خدمت سپرد ہوتی ہے۔ میں نے ان سب سے یہی سنا کہ وہ ہندستان کی جتنی یونیورسٹیوں میں گئے، ان میں سب سے خوبصورت کیمپس مسلم یونیورسٹی کا معلوم ہوا۔ پھولوں سے شوق پیدا کرنے کے لیے ذاکر صاحب نے فلاور شو منعقد کرائے۔

ان کے انہماک کی وجہ سے یونیورسٹی میں پھولوں سے شوق میں اضافہ ہوا۔ یونیورسٹی میں ایسا معلوم ہونے لگا کہ " فرش سے تا عرش وہاں طوفان تھا موج رنگ کا۔"

اساتذہ اور طلبا

تقسیم ہند کے بعد یونیورسٹی بہت سے لائق اور تجربہ کار اساتذہ کی خدمات سے محروم ہو گئی تھی۔ چنانچہ یونیورسٹی کی آبادکاری کے سلسلے میں ایک اہم مسئلہ اس خلا کو پورا کرنا تھا جو لائق اساتذہ کی کمی کی وجہ سے پیدا ہو گیا تھا۔ ذاکر صاحب نے اپنے سامنے یہ مقصد رکھا کہ ایسے استادوں کا تقرر کیا جائے جو نوجوان اساتذہ کی تربیت کر سکیں اور ان کی رہنمائی کے فرائض انجام دے سکیں۔ چنانچہ اس سلسلے میں تین چیزیں سامنے آئیں۔ ایک تو انھوں نے اپنے شناساؤں کی مدد سے ہندستان کی دوسری یونیورسٹیوں سے قابل اور ہونہار اساتذہ کو علی گڑھ لانے کی کوشش کی۔ دوسرے انھوں نے امریکن ایجوکیشنل فاؤنڈیشن اور دوسرے عالمی اداروں کے ذریعہ یہاں کے طلبا اور استادوں کو وظائف اور وظایف فراہم کرنے کا انتظام کیا۔ تیسرے، انھوں نے لائق اور تجربہ کار دوسری یونیورسٹیوں کے ریٹائرڈ پروفیسروں کو ایک مخصوص مدت کے لیے آنے پر مائل کیا۔ اس سب کا نتیجہ یہ ہوا کہ بہت تھوڑے عرصے میں یونیورسٹی میں اچھے استادوں کی تعداد بڑھنے لگی۔ اسی کے ساتھ نوجوان اساتذہ میں تحقیق کا جذبہ پیدا کرنے کے لیے شعبہ جات میں تحقیق کے وسایل میں اضافے بہم پہنچائے گئے، اور یہ سمجھ کر اگر مالی منفعت کو تحقیق کے فروغ سے جوڑ دیا جائے تو اساتذہ کی مستعدی میں اضافہ ہو جائے گا، پی۔ ایچ۔ ڈی اور ڈی لٹ کرنے والوں کو پچاس روپیہ اور سو روپیہ ماہانہ کے اضافے ڈگری حاصل کرنے کے بعد منظور کیے گئے۔

ذاکر صاحب چاہتے تھے کہ اساتذہ میں تحصیل علم کا شوق بڑھے اور وہ اپنے ذہنی افق کو متعلقہ مضامین میں دستگاہ حاصل کر کے، اپنے اندر علمی بصیرت پیدا کریں۔ اس سلسلے میں انھوں نے ایک دلچسپ ریسرچ کی۔ یونیورسٹی لائبریری سے اساتذہ کے نام جاری کتابوں کا رجسٹر منگایا اور یہ معلوم کرنے کی کوشش کی کہ اساتذہ بالعموم کس قسم کی کتابیں پڑھتے ہیں۔ اس تحقیق کے نتائج ایک نجی صحبت میں اپنے مخصوص انداز میں بتاتے ہوئے فرمانے لگے کہ یونیورسٹی کے اکثر اساتذہ کا نامۂ اعمال سادہ ہے، اور وہ چند خوش قسمت جو کتابیں اپنے نام جاری کرواتے ہیں وہ سستی اور پست معیار اردو ناولیں ہوتی ہیں۔ ان کو اس کا رنج تھا کہ اساتذہ عام طور پر وہی کتابیں پڑھتے ہیں جن سے انھیں پڑھانا ہوتا ہے، اور ان کی دلچسپیاں بالعموم غیر علمی ہوتی ہیں۔ اساتذہ کے لیے ذاکر صاحب سے ملاقات ایک امتحان ہوتی تھی۔ وہ اپنے ملاقاتی سے اس کے علمی کام کے بارے میں سوالات کرتے تھے

اس دور سے اہلِ علم اعلیٰ تصنیفات سے متعارف ہوتے ہیں۔ ذاکر صاحب چاہتے تھے کہ تعلیمی کاروبار کو توسیع دی جائے اور علی گڑھ میں
تحقیق کا اعلیٰ معیار قائم کیا جائے، اساتذہ کی علمی دلچسپیوں میں تنوع دکھائی دے اور ان کی زندگی میں اعلیٰ اقدار کی جھلک نظر آئے۔
افسوس ہے کہ ذاکر صاحب کے زمانے کے تربیت شدہ اساتذہ جو بعد میں شعبہ جات کی سربراہی پر معمور ہوئے، اپنے ہمعصر رفیقوں میں
علمی ذوق اور تحقیقی انہماک پیدا کرنے سے قاصر رہے۔ بیشتر اشخاص نے شعبہ کی سربراہی سے شخصی ترقی اور شخصی مفادات کے
حصول کا کام لیا۔ انھوں نے اپنے عمل سے کوئی مثال قائم نہیں کی۔ یونیورسٹی میں جس علمی ماحول پیدا کرنے کی ضرورت کا
احساس ذاکر صاحب نے دلایا تھا اس سے روگردانی کی۔ نتیجہ یہ نکلا کہ اساتذہ اپنے مفاد کے پیشِ نظر مختلف گروہوں
میں منقسم ہو گئے اور علی گڑھ ہندوستان کی دیگر یونیورسٹیوں کی طرح اوسط درجہ کی سطح سے بلند نہ ہو سکا
طلبا میں بھی جس شعور کے ارتقا کی ذاکر صاحب کو خواہش تھی وہ بھی تشنۂ تکمیل رہا۔ ذاکر صاحب نے طلبا سے اپنی
توقعات کا اظہار ان کی ایک خیالی تصویر پیش کر کے کیا۔ اس بات کو ذہن میں رکھ کر کہ شاید طلبا ان کی خواہشات اور
توقعات کو سمجھیں، اور اپنے کردار سے ادارہ کا نام روشن کرنے میں کامیاب ہوں۔ یونیورسٹی کے چانسلر سیدنا طاہر سیف الدین
کو یونیورسٹی میں خوش آمدید کہتے ہوئے ذاکر صاحب نے طلبا کو خطاب کرتے ہوئے کہا:

"میں طلبا کی طرف سے بہت پُر امید ہوں۔ میں نے ان کی سمجھ داری اور ذمہ داری کے مظاہرے
دیکھے ہیں۔ جو نوجوانوں سے جہاں دیدہ لوگوں کی طرح زمانہ سازی یا ریاکاری یا مصلحت اندیشی
کا مطالبہ کرتا ہے وہ شاید اپنی جوانی کو بہت جلد بھول گیا۔ یا اُن بدنصیبوں میں سے ہے جو کبھی جوان
ہی نہ تھے۔ بڑے ہونہار ہیں یہ نوجوان، اور مجھے تو اس قوم کے مستقبل پر پورا بھروسہ ہے جس کے نوجوان
علی گڑھ کے سے نوجوان ہوں۔ نوجوان دوستو! میں سب کے سامنے کچھ غلط تو نہیں کہہ رہا ہوں۔ کچھ تھوڑا
بہت غلط بھی ہو اور محبت تمہارے بعض عیب نہ دیکھنے دے تو بھی تم مجھے سچا ثابت کر سکتے ہو، اور
اگر میں تمہیں کچھ بھی جانتا ہوں تو مجھے یقین ہے کہ تم مجھے سچا ہی ثابت کرو گے۔" ؎

ذاکر صاحب کا یہ طرزِ تخاطب ان کا مخصوص طرزِ ادا ہے۔ یہی صفت ان کی اشخاص کے بارے میں رائے ظاہر کرنے میں
جھلکتی ہے۔ ان مواقع پر وہ اپنی رائے کو اس طرح ظاہر کرتے تھے کہ مخاطب کو سطح پر تعریف نظر آئے۔ لیکن غور
کرنے پر اس کا دوسرا مطلب نکلتا ہو۔ اوپر مندرج رائے میں ذاکر صاحب نے یونیورسٹی کے طالب علموں کو جن صفات
سے متصف کیا ہے، وہ صفات وہی ہیں جن کی کمی ذاکر صاحب شدت سے محسوس کرتے تھے۔ ذاکر صاحب نے اپنے زمانہ
میں ہر قسم کے طلبا سے اپنا ربط قائم رکھا۔ وہ ان کے اقامت خانوں میں جاتے تھے۔ سال کے شروع ہونے پر یونین میں

ان سے خطاب کرتے تھے۔ ان کو مفید مشوروں سے نوازتے تھے، اور عام طور پر ان کے جذبات کی پاسداری کرتے تھے۔ انھوں نے طلبا کو مختلف اوقات میں جو نصیحتیں کیں۔ ان کو مختصر طور پر ذیل میں پیش کیا جا سکتا ہے۔

۱۔ طالب علموں کو سرسیّد کی سوانح عمری پڑھنا چاہیے، تاکہ سرسیّد کی تحریک، اور ان کے مقاصد کا ان کو علم ہو سکے۔ نیز سرسیّد کے ادھورے کاموں کی تکمیل کو وہ زندگی کا مقصد بنائیں۔

۲۔ زندگی کی معراج حصول ملازمت نہیں ہے، بلکہ سیرت کی درستگی اور شخصیت کی تکمیل ہے۔ لیاقت خود بخود کسب معاش کا ذریعہ بن جاتی ہے۔

۳۔ یونیورسٹی کے قوانین کی پابندی اشد ضروری ہے۔ اس لیے کہ یہ قوانین طالب علموں کی مضمر صلاحیتوں کو پیدا کرنے کی غرض سے بنائے جاتے ہیں۔

۴۔ ذاکر صاحب طالب علمانہ شان قایم کرنے پر زور دیتے تھے۔ صاف ستھرا لباس، اور لباس پہننے کے اصول کے تحت ریب تن ہو، بارہا ذاکر صاحب کو طالب علموں کی شیروانی کے بٹن لگاتے ہوئے دیکھا گیا ہے۔

۵۔ تقریر کرنے کے ساتھ دوسروں کی تقریر خاموشی سے سننے کی عادت ڈالنی چاہیے، تاکہ ہر شخص کو اظہار خیال کی پوری آزادی میسر آئے۔

۶۔ ذاکر صاحب کے نزدیک یونیورسٹی یونین، ٹریڈ یونین نہیں۔ یونین کا مقصد طالب علموں میں تقریر اور تحریر کا ذوق ابھارنا ہے۔ طالب علموں کو پورا حق ہے کہ وہ اپنے مطالبات کو یونیورسٹی کے منتظمین تک پہنچائیں، مگر ہنگامہ آرائی ایک علمی ادارہ کے شایان شان نہیں۔

۷۔ یونیورسٹی میں لڑکیاں بڑی تعداد میں شریک ہونے لگی ہیں۔ "لڑکی وں، بہن، بیوی سب کچھ ہے۔ یہی لڑکیاں آپ کی بیویاں بنیں گی۔ کیا آپ کی بیوی سے کوئی بدتمیزی کرے تو آپ خوش ہوں گے۔" ؎

ذاکر صاحب اس ادارہ کے طالب علموں کو دوسرے اداروں کے طالب علموں سے مختلف اور ممتاز دیکھنا چاہتے تھے۔ چنانچہ جب کبھی طلبا ان کی توقعات کے برخلاف مظاہرہ کرتے تھے تو ان کو دلی صدمہ ہوتا تھا۔ یونیورسٹی میں فیس کے اضافہ پر جب لڑکوں نے مظاہرہ کیا تو اس سے بد دل ہو کر ذاکر صاحب نے کہا:

"یہ نہ سوچیے کہ دوسری یونیورسٹیوں میں کیا ہوتا ہے وہاں کے طلبا کیا کرتے ہیں۔ ہمارے ملک میں اچھی یونیورسٹیاں ہیں ہی کہاں، چودہ پندرہ برس تعلیم حاصل کرنے کے بعد آدمی اپنے آپ کو قابو میں نہ رکھ سکے تو اس میں اور حیوانوں میں کیا فرق ہے۔" ؎

افسوس کے ساتھ کہنا پڑتا ہے کہ جس طرح ذاکر صاحب کی اساتذہ سے توقعات پوری نہیں ہوئیں، اسی طرح طالب علموں کے رویے نے بھی انہیں سخت مایوس کیا۔ علی گڑھ سے رخصت ہوتے وقت یونین میں الوداعی تقریر میں ذاکر صاحب نے اپنی ذہنی کیفیت کا اظہار یوں کیا۔

"میں اس لیے مایوس ہوں کہ آپ میں ابھی پختگی نہیں آئی۔ کوئی شخص بھی آکر آپ کو بہکا سکتا ہے آپ نے جذبات کے سلسلہ میں عقل سے کام لینا ابھی تک نہیں سیکھا۔ آپ آزادی کی قیمت دینا نہیں جانتے۔ آزادی حاصل کرنا جتنا مشکل ہے اُس سے زیادہ مشکل ہے اس کا قایم رکھنا۔ کوئی بھی آپ کی سمجھ کو خرید سکتا ہے۔ آپ کے جذبات کو بھڑکا سکتا ہے۔ اعتدال وہ ہے جسے اپنے خلاف سن سکنے کی عادت ہو۔ دوسروں کے اعتراض کا جواب ٹھنڈے دل سے دے سکے۔ تمہیں صبر کرنا چاہیئے۔ تم صبر کے لیے مجبور بھی ہو اور یہ تمہارا فرض بھی ہے۔"

اس تقریر کے سال بھر کے بعد جب علی گڑھ جلسہ تقسیم اسناد میں آئے تو یہ برہمی شفقت میں بدل گئی۔ یہ اس انسان کا ظرف تھا جو معاف کرنا جانتا تھا، اور معاف کرنا چاہتا تھا۔ اُس وقت کا تاثر یہ تھا:

"اس دانش گاہ سے برابر دل کو تعلق رہا۔ گہرا تعلق، نہ ٹوٹ سکنے والا تعلق ... اس مادر علمی کی طرف سے دل میں کبھی کوئی تلخی محسوس نہیں کی۔ آج کاسۂ دل کہ جگہ جگہ سے ٹوٹا ہوا بھی ہے اور اس پر جو بال ہے یا یا شکر گزاری سے بھرا ہوا بھی ہے، اور ان تمام کوتاہیوں پر جو اس دانش گاہ عزیز کی خدمت میں رہ گئیں شرمساری سے چھلک بھی رہا ہے ... میرے لیے تو اس دانش گاہ سے وابستگی کی یاد ہی سب سے بڑا انعام ہے۔"

ذاکر صاحب کا یونیورسٹی پر اثر

اوپر ہم نے ذاکر صاحب کے علی گڑھ پر اثرات کا مختلف عنوانات کے تحت تذکرہ کیا ہے۔ یہاں صرف ان کا اعادہ کرنا مقصود ہے۔

ذاکر صاحب دسمبر ۱۹۴۸ء میں بحیثیت وائس چانسلر علی گڑھ تشریف لائے، اور ان کے قایم مقام کا تقرر اکتوبر ۱۹۵۶ء میں ہوا۔ اس لحاظ سے ذاکر صاحب کا علی گڑھ میں قیام چھ سال نو مہینے یا سات سال دس مہینے کے عرصہ پر پھیلا ہوا ہے۔ اس میں ایک وقفہ ان کی ایجوکیشن کمیشن کی ممبری کی مصروفیات اور قلب پر دورہ پڑنے سے غیر حاضری کا بھی شامل ہے۔ علاوہ اس وقفہ کے ان کا پورا وقت یونیورسٹی کی آباد کاری میں صرف ہوا۔ ۱۹۵۱ء کے پہلے پہلے وہ یونیورسٹی میں خود اعتمادی کی فضا قایم کرنے میں کامیاب ہو گئے تھے۔ ۸ دسمبر ۱۹۵۱ء کو ڈاکٹر راجندر پرشاد کی تشریف آوری کے موقع پر وہ یہ کہنے کے قابل ہو گئے تھے "میرا عام احساس

یہ ہے کہ یونیورسٹی جو بڑے مشکلات کے چکر میں پڑ گئی تھی۔ اس گرداب سے نکل گئی ہے۔ تیس سال کے خاتمہ پر میرے دل میں نمایاں احساس اس پر اطمینان کا ہے جو ہم کر سکے ہیں اور شکر گزاری کا اس تعاون پر جو ہر طرف سے مجھے ملا ہے اور جو کچھ ہو سکا ہے وہ اسی وجہ سے ہو سکا ہے۔ [۲۵]

ذاکر صاحب نے یونیورسٹی پر جو اثر چھوڑا اس کا پہلا نکتہ اوپر بیان کیا گیا یعنی یونیورسٹی میں خود اعتمادی کی فضا کا قائم کرنا۔ دوسرے انھوں نے یونیورسٹی کے شعبہ جات میں نئے تقرریات کئے جس کی وجہ سے نامی شعبے آمادہ اور کارگزار نظر آنے لگے۔ اسی کے ساتھ طالب علموں کی تعداد میں نمایاں اضافہ ہوا۔ تیسرے انھوں نے یونیورسٹی کو اندرون ملک اور بیرون ملک کے معتبر اشخاص کے لئے کھول دیا۔ اُن کی آمد سے اور یونیورسٹی میں ان کی علمی مشاغل میں شرکت سے، علی گڑھ نے اپنی پرانی تہذیبی شہرت حاصل کر لی اور یونیورسٹی کے بارے میں شکوک و شبہات کا ازالہ ہوا

لیکن ذاکر صاحب کی یونیورسٹی سے یکایک علیحدگی ایک سانحہ سے تعبیر کی جا سکتی ہے۔ وہ علی گڑھ سے خاصے مایوس اور بددل گئے۔ ان کو سب سے زیادہ تکلیف اس بات کی پہنچی کہ وہ اس ادارہ میں جن خیالات کو عام کرنا چاہتے تھے، اس سے یہاں ہمدردی کرنے والے اشخاص بہت کم تھے۔ اوپر ہم نے اساتذہ کی گروہ بندی اور شخصی مناقشات کا ذکر کیا ہے۔ یہاں اس طرف اشارہ کرنا مقصود ہے کہ ذاکر صاحب چاہتے تھے کہ مختلف شعبہ جات کے رہنما اپنے رفیقوں کی تربیت اور ان کی حوصلہ افزائی میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیں، اور خود اپنے کردار اور عمل سے اچھی مثال قائم کریں۔ لیکن جو صورت حال سامنے آئی وہ اس کے برعکس تھی۔ اکثر اساتذہ اپنے رفیقوں کے لئے مشعل راہ نہ بن سکے۔ اور اپنی علمی فضیلت کے حصار میں محصور ہو کر رہ گئے۔ تقرریات میں بھی شخصی اور غیر علمی مفادات کام کرنے لگے اور اس طرح یہ ادارہ ایک اوسط درجہ کا ادارہ بن کر رہ گیا۔ افسوس اس بات کا ہے کہ علی گڑھ نے خود اپنی سابقہ روایات سے روگردانی کی تھی، جب کہ اس میں ذاکر صاحب کی وجہ سے اتنی صلاحیت پیدا ہو گئی تھی کہ وہ قبل از آزادی کی اداروں کی علمی سرگرمیوں سے سبقت لے جائے۔

ذاکر صاحب علی گڑھ سے مایوس واپس گئے۔ انھیں جو کچھ کرنا تھا وہ انھوں نے انجام دیا مگر یہاں کے اساتذہ اور طلبا میں وہ نظر پیدا نہیں ہو سکی جس کے ذاکر صاحب خواہش مند تھے۔

ذاکر صاحب کی شخصیت

ہر کارنامہ کے پیچھے صاحب کارنامہ کی شخصیت ہوتی ہے۔ جس کا سمجھنا ایک دلچسپ کوشش ہے۔ یہاں ہم ذاکر صاحب کی شخصیت کے ایسے مظاہر کی نشاندہی کریں گے جو مختلف اشخاص نے ان کے یہاں پائے ہیں۔ ذاکر صاحب کی ایک

خصوصیت جس کا متعدد لوگوں نے تذکرہ کیا ہے، وہ ان کا تدبر اور حکمتِ عملی ہے۔ یہ عنصر شروع ہی سے ان کے یہاں پایا جاتا ہے جسے ڈاکٹر مسعود حسین "ضبطِ نفس" سے تعبیر کرتے ہیں۔ یہ حکمتِ عملی جذبات پر مکمل قابو رکھنے سے ترکیب دی گئی تھی جو آخر وقت تک ان کی رفیق رہی۔ بچپن میں یہ ضبطِ نفس چھوٹے بھائی سے پٹ جانے میں ظاہر ہوتا تھا جس کی تہہ میں اہلِ خاندان کی ہمدردی حاصل کرنا اور عدم تشدد کی پالیسی پر عمل پیرا ہونا جھلکتا تھا۔[۱۹] بڑی عمر میں جب جامعہ کی سربراہی کا موقع ملا تو یہ حکمتِ عملی سب کو ساتھ لے کر چلنے اور ہر قسم کے لوگوں سے رابطہ رکھنے کی صورت میں نمودار ہوئی۔ اس نے مخالفت کے تیز دھار والے خنجر کی کاٹ کو زائل کر دیا، اور سخت سست برداشت کرنے کی عادت ڈالنے سے عام ہمدردی کے جذبہ کو بیدار کر دیا۔ خود کہتے تھے:

"زندگی کا کھیل ایک قسم کی پتنگ بازی ہے۔ پتنگ کا پیچ ڈھیل سے بھی لڑایا جاتا ہے اور کھینچ کر بھی۔ میں ڈھیل کا پیچ لڑانے والوں میں سے ہوں۔"[۲۰]

اس صفت کی بنا پر رشید احمد صدیقی نے لکھا ہے کہ "مرشد کے مخالف ہو سکتے ہیں، ان کے دشمن نہیں ہو سکتے۔" اسی اس صلاحیت سے ذاکر صاحب نے بڑا کام لیا۔ ایک طرف تو کارکنان اور کارساز صاحبانِ اقتدار کی ہمدردیاں حاصل رہیں تو دوسری طرف عوام میں مقبولیت کے مواقع فراہم ہوتے رہے۔ یہی وجہ ہے کہ آج بھی علی گڑھ میں ان سے اختلاف کرنے والے مل جائیں گے، مگر نفرت کرنے والے نہیں ملیں گے۔

ذاکر صاحب کی دوسری صفت ان کی وہ صلاحیت تھی جو اجتماعِ ضدین اور مختلف الخیال اشخاص اور مسائل میں ایک مشترک عنصر تلاش کر لیتی تھی۔ اسے ہم مصلحت اندیشی نہیں کہہ سکتے اور نہ اس کو ہم سب کو خوش رکھنے کی خواہش کہہ سکتے ہیں۔ یہ ذہن کی درّاکی اور جلد سے جلد معاملہ کی تہہ تک پہنچ جانے کی صلاحیت ہے، جو ایک طرف مخالف خیال یا مخالف رائے میں ملے جلنے والے عنصر کی افادیت کو سمجھ سکتی ہے تو دوسری طرف مسائل کی طرف ایک عام ہمدردانہ رویہ اختیار کر سکتی ہے۔ اس سلسلہ میں مسلم یونیورسٹی کے ٹریژرر قاضی عزیز الدین بلگرامی کی رائے قابلِ غور ہے:

"ذاکر صاحب کی ذہانت، ایثار، محنت، اور دردمندی تو رہی اپنی جگہ، پر ان جیسا مردم شناس اور پیچیدہ سے پیچیدہ مسئلہ کی تہہ تک جلد سے جلد پہنچ جانے والا آدمی میں نے اپنی عمر میں کسی اور کو نہ پایا۔ مسائل کا بہتر سے بہتر حل ذاکر صاحب کے ذہن میں جتنا جلد آتا تھا کسی اور کے نہیں آتا تھا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ جیسے ہر دشواری اپنا حل ان کو بتا دیتی تھی۔"[۲۱]

ذاکر صاحب کے ذرائع فیضان اسلام اور فارسی شاعری میں تلاش کیے جا سکتے ہیں۔ رشید احمد صدیقی کا بیان ہے کہ ذاکر صاحب اپنی پسند کے اشعار ایک کاپی میں درج کر لیتے تھے، جس سے وہ تاثر حاصل کرتے تھے۔ ڈاکٹر مسعود حسین نے بیان کیا ہے کہ "میں نے انھیں اکثر غالب، اقبال یا کسی فارسی شاعر کے اشعار گنگناتے سنا۔ انھیں وہی اشعار پسند تھے جو خود ان کی زندگی کے ترجمان تھے۔" اس خصوصیت میں ذاکر صاحب مولانا آزاد کے شریک ہیں جو فارسی شعرا سے فیضان حاصل کرتے تھے۔ میرا خیال ہے کہ فارسی کے اعلیٰ اشعار جن اقدار کے ترجمان ہیں اور مسائل کو جس سطح پر دیکھنے کے لیے اصرار کرتے ہیں وہ انسان میں "سوز و ساز و درد و داغ و جستجو و آرزو" پیدا کر دیتے ہیں جو تخلیقی صلاحیتوں کو بروئے کار لانے کے سب سے بڑے محرک ہیں۔ ذاکر صاحب نے فارسی اشعار سے جو فیضان خود حاصل کیا وہ تو ان کی زندگی میں نظر آتا ہے، مگر اس فیضان کو انھوں نے اپنے جامعہ کے رفیقوں کے کردار میں بھی پھیلا دیکھ لیا۔ واقعی رفاقت کی معراج نظر آتی ہے۔ جب جامعہ کی جشن سیمیں کے موقع پر اپنے جامعہ کے رفقا کا قوم کی طرف سے شکریہ ادا کرتے ہوئے، غالب کے اس شعر میں معمولی ترمیم کے ساتھ اپنی تقریر ختم کرتے ہیں سے

آشفتہ اند بر سرِ خارے بخوں دا — قانون باغبانی صحرا نوشتہ اند

اس کا اثر اس وقت جوان کے رفیقوں پر ہوا ہو اس کا اندازہ نہیں، مگر آج اس تقریر کو پڑھتے وقت ہماری آنکھیں نم ہو جاتی ہیں۔

اسلامی تعلیمات کے اثر کا بہت لوگوں نے تذکرہ کیا ہے۔ وہ اسلام کے خدمت خلق کے جذبے سے بہت متاثر ہوئے تھے۔ اور اسی کشش نے ایک زمانہ میں انھیں مولانا الیاس سے بہت قریب کر دیا تھا۔ اسلامی تاریخ کے عظیم واقعات نے ان پر فکر و عمل کے بہت سے گوشے روشن کیے تھے۔ چہلم کے موقع پر شہادت حسین پر علی گڑھ کے اسٹریچی ہال میں تقریر کرتے ہوئے انھوں نے فرمایا:

"مجھے تو اس واقعہ میں انسانی ارتقا کے اصل اصول کا راز چھپا نظر آتا ہے۔ یہ یاد کرکے انسانیت اس واقعہ کو یاد کرکے اپنی صحیح راہ کو یاد کرتی ہے۔ شہادت حسین کی کہانی، انسانی سرفرازی اور سربلندی کی داستان ہے۔ انسان کی پستی سے بلندی کی سفر کی روداد ہے۔" [۲۲]

ڈاکٹر ذاکر حسین کی صلاحیتیں اس وقت مکمل طور پر بروئے کار دیکھی جا سکتی تھیں جب ان کا سامنا نامساعد حالات اور سخت تر چیلنج سے ہوا اور اس کے مقابلہ میں کامیابی کے امکانات صفر کے برابر ہوں۔ ایسا ہی واقعہ انھیں جامعہ ملیہ کے زمانہ میں پیش آیا۔ حکومت نظام نے ایک ماہانہ رقم جامعہ کے اخراجات کی کفالت کے لیے منظور کی

اور اس کی ادائیگی کی یہ تہ دل لگا دی کہ وہ دلّی کے چیف کمشنر ٹامس کی منظوری کے [illegible]

میں تحریک عدم تعاون عروج پر تھی اور جامعہ کے بعض اساتذہ اس تحریک میں [illegible] تھے کہ جامعہ بحیثیت

ادارہ اس میں کوئی شمولیت نہیں تھی" اس واقعہ کو یہ وہ عجیب کی رسائی سے"۔

میں بہت دیر سے تشکیک میں مبتلا تھا جب ڈاکٹر ذاکر حسین اُس سے ملے [illegible] میں ان

ان کے ساتھ رہتا تھا، اور اس بات کو واضح طور پر یاد کر سکتا ہوں کہ کس طرح وہ تانگے میں سوار ہوئے

بے داغ سفید لباس میں ملبوس اور بہت مضطرب، مجھے ایسا محسوس ہوا کہ وہ ایک یونس کی ہستی پر روا

ہیں، ایک ناامید مقصد کا تنہا محافظ، میں اس اطلاع کو حاصل کرنے میں کامیاب ہو گیا کہ اگرچہ ٹامس بہت

سخت حاکم کی طرح نظر آیا وہ تمام وقت مداہنت پر غور کیا گیا اور اُسے یہ محسوس کرایا گیا کہ اس کے

طرزِ عمل کے بارے میں اس کے پاس کوئی قائل کرنے والی دلیل جامعہ کے خلاف نہیں ہے[22]۔"

ڈاکٹر ذاکر حسین کے بارے میں ایک اور رفیق محب صاحب لکھتے ہیں

"عام مواقع پر کسی بھی چیز کو فرض کرنے کی اُنھوں نے اپنے آپ کو تربیت دی تھی "

توقعات سے جو اُن سے وابستہ کی جاتی تھی ہر وقت باخبر رہتے تھے۔ اور اس میں ہم آہنگ دکھاتے تھے بغیر

کسی شعوری کوشش کے توقعات کو پوری ہونے سے زیادہ ظاہر کریں۔" [23]

ہم اور ذاکر صاحب

آج ذاکر صاحب کو علی گڑھ سے گئے ہوئے چونتیس[34] سال اور انتقال کئے ہوئے اکیس[21] سال ہو گئے ہیں اگر مولانا ابوالکلام آزاد کی زبان استعمال کی جائے تو کہا جا سکتا ہے کہ ذاکر صاحب اور ان کے کارنامے تاریخ کے صفحوں کی زینت بن چکے ہیں۔ ہم آج ان کی عظمت میں نہ اضافہ کر سکتے ہیں اور نہ کمی۔ ہاں اس زمانہ میں خود ذاکر صاحب کو لا، اور اُن مسائل کے ذیل میں جو ان کو پیش آئے، ہم اپنے ورثہ کے طور پر ان کی کل فکری اور عملی زندگی کی تعبیر آج کے حالات اور تقاضوں کے تناظر میں ضرور کر سکتے ہیں۔ اس پر سب سے مدلل بحث جناب سید حامد نے کی ہے۔ ان کے خیالات کا خلاصہ اس طرح پیش کیا جا سکتا ہے۔

۱۔ ذاکر صاحب علی گڑھ اپنی میعاد پوری کرنے سے پہلے چھوڑ آئے۔ چھوڑنے کے بعد علی گڑھ[25] سے بے تعلق ہونے کا جواز ڈھونڈنا قدرے مشکل ہے۔

۲۔ انھیں چاہئے تھا کہ علی گڑھ تحریک کو جسے سر سید نے شروع کیا تھا، اور جو امتدادِ ایام غلط

ستھے۔ اور کیا ملک جو سیکولر جمہوری سیاست کے قائم کرنے کا دم بھرتا ہے اور اس پر فخر کرتا ہے، اقلیتی فرقہ کے ایک معزز شخص کو اعلیٰ منصب کے لیے منتخب کرکے اس نے کسی پر کوئی احسان کیا ہے؟

ڈاکٹر ذاکر حسین بیسویں صدی کے مسلمانوں کے سربرآوردہ اشخاص کی فہرست میں ضرور شامل کیے جائیں گے، اس لیے کہ ان کی بعض صلاحیتیں مسلمانوں کے عروج کے دور کی یاد دلاتی ہیں۔ ذہانت، علمیت، ثابت قدمی اور سربراہی کی صلاحیت

مولانا ابوالکلام آزاد کے سوانح نگار ڈگلس نے لکھا ہے جب وہ ذاکر صاحب سے ایوان صدر میں ملے اور مولانا آزاد کے بارے میں ان کے خیالات معلوم کرنا چاہے تو ذاکر صاحب نے ان سے درخواست کی کہ وہ غیر علمی اور تحقیقی نقطۂ نظر ترک کیے ہوئے مولانا کے ساتھ دریادلی سے پیش آئیں۔ ڈگلس نے لکھا ہے کہ انھوں نے اس کی حرف بحرف تعمیل کی۔ کیا ہم یہ درخواست ذاکر صاحب کے مداحین سے نہیں کر سکتے؟

●●

حواشی:

۱ صدر مملکت ڈاکٹر راجندر پرشاد کی تشریف آوری کے موقع پر بحیثیت وائس چانسلر ذاکر صاحب کی رپورٹ مسلم یونیورسٹی گزٹ ۲۴ دسمبر ۱۹۵۱ ۲ جامعہ ملیہ ہم نے جامعہ سے عداوت کرکے قائم کی تھی، مگر جامعہ کو ہم علی گڑھ سے علیحدہ کوئی چیز نہیں سمجھتے تھے۔ میں نے ستائیس سال جامعہ کا کام صرف اس لیے جان لگا کر کیا کہ میں اسے بھی علی گڑھ کا کام سمجھتا تھا" سر سید ہال مسلم یونیورسٹی میں ذاکر صاحب کی تقریر (یونیورسٹی گزٹ ۱۴، ۲۴ اگست ۱۹۵۲ء) ۳ سیدنا طاہر سیف الدین، چانسلر مسلم یونیورسٹی کے استقبال کے موقع پر (یونیورسٹی گزٹ ۱۸ اور ۲۴ نومبر ۱۹۵۲ء)۔ ۴ جامعہ کیا ہے؟ (یونیورسٹی گزٹ ۱۰ اگست ۱۹۵۴ء) ۵ تہذیب الاخلاق۔ یونیورسٹی کانووکیشن کے موقع پر خصوصی پیش کش، اپریل ۱۹۸۰ء۔ ۶ خطبۂ صدارت، آل انڈیا مسلم ایجوکیشنل کانفرنس (یونیورسٹی گزٹ ۱۰ مارچ ۱۹۵۲ء) ۷ یونیورسٹی گزٹ۔ ۲۴ مارچ۔ ۸ اپریل ۱۹۵۲ء ۸ یونیورسٹی گزٹ ۱۴، ۲۴ اگست ۱۹۵۲ء ۹ یونیورسٹی گزٹ ۲۴ نومبر ۱۹۵۵ء پنڈت جواہر لال نہرو کی آمد کے موقع پر ان کا استقبال کرتے ہوئے۔ ۱۰ یونیورسٹی گزٹ ۱۸-۲۴ نومبر ۱۹۵۳ء، ۱۱ یونیورسٹی گزٹ، ۱۴، ۲۴ اگست ۱۹۵۱ء، ۲۴ اگست ۱۹۵۳ء، ۲۴ دسمبر ۱۹۵۷ء ۱۲ یونیورسٹی گزٹ ۲۴ اگست ۱۹۵۵ء۔ ۱۳ "فکر و نظر" علی گڑھ ۱۹۸۹ء شمارہ ۲ ص ۲۶۔ ۱۴ یونیورسٹی گزٹ، اشاعت خاص، ۷ جنوری ۱۹۵۷ء۔ ۱۵ یونیورسٹی گزٹ ۲۴ دسمبر ۱۹۵۱ء۔ ۱۶ ڈاکٹر مسعود حسین، ورود مسعود، خدا بخش لائبریری جرنل پٹنہ، نمبر ۴۸ ص ۷۶ ۱۷ ایضاً ص ۷۳۔ ۱۸ یونیورسٹی گزٹ ۱۴، ۲۴ اگست ۱۹۵۳ء ۱۹ ورود مسعود، ص ۷۱ ۲۰ یونیورسٹی گزٹ ۸، ۱۸ دسمبر ۱۹۵۱ء ۲۱ محمد مجیب ڈاکٹر ذاکر حسین، ایک سوانحی خاکہ، ص ۹۱ ۲۲ ایضاً ص ۲۳۱ ۲۳ سید حامد: ذاکر صاحب کی علمی خدمات اور ان کی شخصیت۔ "فکر و نظر" علی گڑھ ۱۹۸۹ء شمارہ ۲، صفحات ۵ تا ۲۳

ایک صاحب (نامعلوم)

بیگم ذاکر حسین میرے والدہ کے رشتہ کی خالہ زاد بہن تھیں جب تک ان کا انتقال نہیں ہو گیا، میں نے یہاں کسی پر یہ ظاہر نہیں ہونے دیا کہ میں ان کی کچھ ہوں۔ رشتہ داری تو بڑی دور کی بات ہے میں زبان پر نہیں لایا کبھی۔ وہ یہ کہنے لگے کہ یہاں کی مجبوری تو میں نے آپ کو شادی کی کہ یہاں کی POLITICS اجازت نہیں دے رہی ہے کہ میں تم کو اپوائنٹ کروں۔ مسلم یونیورسٹی سے فرسٹ کلاس فرسٹ تھے وہ پروفیسر چیشر تی کا نام سا ہوگا آپ نے۔ ان کا خاص اسٹوڈنٹ ٹاپ کیا ہوا تھا وہ نہیں ہو سکا۔ اور سکنڈ کلاس جو ہوا وہ آدمی موجود ہے جو کہ تھرڈ کلاس پاس ہوا۔ اب میں یہ OFFICIALLY کہہ رہا ہوں کہ جناب تھرڈ کلاس پاس ہوا پھر وہ لڑکا کوٹھی پر لاتا ہے کہ مجبور جوں میں اس وقت کوئی مدد نہیں کر سکتا بیٹا تم جاؤ۔ پھر دیکھا جائے گا کسی وقت۔ تو اس نے کہا کہ یہ پڑھ کے میری ڈگری کی اس وقت اس ڈگری کی کوئی قدر نہیں۔ پھر بعد میں اس نے ایک آدھ بار یہ کہا کہ مجھے امریکہ جانا ہے۔ کچھ اس میں مدد کر دیجئے اس وقت وائس پریسیڈنٹ تھے وہ تو انہوں نے کہا ہاں، میں کوشش کروں گا کسی سے کہوں گا، لیکن بعد میں کچھ نہیں کر پایا۔ ان کا جی چاہتا تھا مگر ان کا یہ تو بات اچھا تھا لکھنے کو۔ زبان کھلتی تھی کہنے کو۔ میری سمجھ میں نہیں آ رہا ہے اس کو کیا کہیں گے AS VICEPRESIDENT بابا کی سعید ہاتھ روم سلیپر پہنے بیٹھے ہوئے ہیں۔ میں نے کہا، یہ بہت غلط بات ہے آپ ایک یہ عادتیں چھوڑیئے وہاں سے جوتا لایا، وہ پیش کیا، اپنے ہاتھوں سے وہ چپلیں اٹھائیں اور وہ جوتے پہن لئے۔

جذبی صاحب کی ایک نظم کے سلسلے میں کسی ہادی صاحب نے تو سایا تھا کہ یہ نظم ذاکر صاحب کو بھیج دی گئی تھی وہ انہیں پسند تو کیا آئی ہوگی بلکہ ناگوار خاطر ہی ہوئی ہوگی۔ مگر جذبی موجود ہیں، ہم تو اس کے شاہد ہیں۔ ہیں نظم کو سنا ہے اور نظم کو سن کے جذبی صاحب نے اس کو روانہ کیا باوجودیکہ رشید صاحب نے منع کیا تھا۔ میں لکچرر ہوا ہوں ان کے زمانے میں اور میرا انہوں نے بحیثیت لکچرر کے انٹرویو کیا۔ میں تو اچھا ہونے والا آدمی نہیں ہوں، جب تو ورنہ بھی نہیں تھا بہر حال، انہوں نے مجھ سے اشعار پوچھے حافظ کا شعر انہوں نے پوچھا تھا پھر ایک بات مجھ سے یہ پوچھی کہ تم یہ بتاؤ کہ تم کیوں معلم بننا چاہتے ہو اور اس پیشے کو کیوں تم نے انتخاب کرنے کے لیے طے کیا جبکہ تم نے LAW بھی پاس کیا ہے۔ بس یہ سوال تھا جو انہوں نے کیا۔ جب تک ذاکر صاحب یہاں رہے چونکہ وہ بڑے

مقبول اور ہر دلعزیز قسم کے وائس چانسلر ہی نہیں بلکہ شخصیت تھے اور مجموعی طور سے ایک عظیم ہستی، ان کی تقریروں
اور جلسوں میں جہاں جہاں وہ بولتے تھے اور جب بھی وہ بولتے تھے میں وہاں پہونچتا ضرور تھا۔ شامل رہتا تھا
اور سنتا تھا۔ میں لکچرر ضرور ہوگیا تھا۔ مگر طالب علمی سے ایک دم لکچرر کی طرف گیا تھا تو گویا ایک قدم میرا طالب علمی کی دنیا
میں بھی تھا۔ لوگوں میں ذرا ایک ذہنی معیار تھا اس زمانے کے نوجوان طالب علموں میں اور ان میں بھی جو لکچرر نہیں تھے،
وہ سمجھتے بھی تھے داد دیتے تھے اور قدر کرتے تھے ڈاکٹر صاحب کے، نوجوانوں میں لوگ بڑے قدر داں تھے۔

اسوقت نیشنلزم کی بات ہمیں بڑی بری لگتی تھی اور ہم پھر اس پورے نیشنلسٹ موومنٹ کی تذلیل کرتے تھے اور کہتے تھے کہ
ان نیشنلسٹوں کی ذہنیت بنیادی طور پر غلامی کی ہے اور ہندوؤں کا جوتا اٹھانا یہ اپنے لیے عبادت سمجھتے ہیں تو ہم بڑے
ناراض ہوتے تھے ڈاکٹر صاحب کی ان باتوں سے اب میں محسوس کرتا ہوں کہ اس میں بڑی حکمت تھی، بڑی بصیرت تھی انہوں نے
ایسا کر کے ہندوؤں کے دلوں میں دوبارہ مسلمانوں کے لیے جگہ پیدا کرادی اور دوبارہ ہم لوگوں کو مجموعی طور پر اس قابل
بنایا کہ ہم یہاں رہ بھی رہے ہیں اور عزت کے ساتھ رہ رہے ہیں۔ میرے استاد پروفیسر حمید الدین خاں بڑے سخت مزاج
اور بڑے ایماندار اور کھرے آدمی تھے۔ ایمانداری میں اتنے بے لچک کہ شاید وہ اپنے بڑے بھائی کے ساتھ
ذرا سا بھی مروت نہ کریں۔ جیسے میں قاضی عبد الودود کو کہتا ہوں غالباً ایک بار میں نے قاضی صاحب کو لکھ بھی دیا کہ آپ
بے مروتی کی حد تک ایماندار آدمی ہیں تو ایسے ہی پروفیسر حمید الدین خاں تھے وہ لکچرر تھے انجینئرنگ کالج کے ایک ہندو
اکزامنر کی انہوں نے رپورٹ کی کہ۔ تو وہ باقاعدہ اکزامنر تھا اور نہ ٹیچر ہی تھا وہ ایگزیکیٹو انجینئر قسم کا کوئی
آدمی تھا۔ ایڈمنسٹریٹر آدمی انہوں نے شکایت کی کہ یہ مارکنگ میں گڑبڑ کر رہا ہے مگر ڈاکٹر صاحب نے اسے
درگذر کر دیا اور انہوں نے کہا تھا کہ اس اکزامنر کو سسپنڈ کر دو وہ ڈاکٹر صاحب نے نہیں کیا۔ تو انہیں ڈاکٹر صاحب
سے بڑی شکایت تھی کہ ڈاکٹر صاحب کے ہاں یہ مصلحت پسندی کا ہے، یہ موقع پسندی ہے وغیرہ یہ گڑبڑ بات ہے
مگر سچ پوچھئے تو اس وقت کے لیے وہ ٹھیک تھا اب ہمیں محسوس ہوتا ہے کہ اس وقت کی فضا ہی کچھ ایسی تھی۔
اس وقت اس کا موقع نہیں تھا کہ آپ، دو اور دو چار کی طرح حساب کر ڈالیے۔

ڈاکٹر صاحب آج تک بھلے ہی طرح چاہتے ہیں جس طرح پہلے چاہتے تھے۔ چونکہ ان کے بڑے بھائی کا ہیں کلاس فیلو تھا اور یہ آیا کرتے تھے
یہاں۔ تو ہمارے پاس ٹھہرتے تھے اور ہم انکے ساتھ اسی طرح چھوٹے بھائی کی طرح برتاؤ کرتے تھے۔ ڈاکٹر صاحب میرے ساتھ آج تک اسی رویے میں ہیں
ڈاکٹر صاحب کے خلاف ایک لفظ بھی کبھی نہیں کہا ہادی صاحب اور ڈاکٹر صاحب کے تعلقات بہت خراب تھے۔

———— ہادی صاحب تو جادوگر آدمی تھے اور تماشہ کرنا اور ایکٹنگ کرنا ان کا کھیل تھا ہی لطیفہ یہ

ہے۔ پروفیسر حمید الدین خاں نے سنایا تھا کہ جامعہ ملیہ نشاط کوٹھی میں تھی تو جامعہ میں ہادی صاحب بھی پروفیسر
ہو گئے۔ اب ضیاء الدین نے کمپین شروع کی توڑنے کی۔ اس توڑنے اور بھاگنے والوں میں ہادی صاحب بھی
تھے۔ عین اس روز جس روز وہ بھاگے ہیں ایک جیب میں استعفیٰ رکھا ہوا تھا جامعہ میں جو انہوں نے استعفیٰ دیا
وہ جیب میں تھا اور بڑی شاندار تقریر جامعہ کی حمایت میں کی۔ اس کے فوراً ہی بعد استعفیٰ دیکر مسلم یونیورسٹی
جوائن کر لی۔ ضیاء الدین کی ایما پر یا ان کے کہنے پر اس کو ضیاء الدین کے گروپ نے اپنی بڑی فتح سمجھا اور جامعہ کی زبردست
شکست سے اس کو تعبیر کیا گیا اور اس کا ایسا ورک اپ پروپیگنڈا کیا گیا کہ جامعہ سے بھاگے ہیں۔ ہادی صاحب کے استعفیٰ
کا ان کی ایکٹنگ کا اور دو عملی پالیسی کا بھی بہت بڑا رول تھا کہ جامعہ والے ایسے DEMORALISE ہوئے کہ وہ یہاں
سے بھاگ گئے۔ یہ پروفیسر حمید الدین خاں کا بیان ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ ہادی صاحب کی اس حرکت کو ذاکر صاحب
کبھی نہ بھولے۔ انہوں نے ہمیشہ یاد رکھا کہ ہم کو سب سے بڑی زک اور سب سے بڑی چوٹ ہادی صاحب سے پہونچی
پھر وہ وائس چانسلر ہو کر آئے تو ایک بات ہوئی تھی وہ یہ کہ ہادی صاحب کا یہ قاعدہ تھا کہ وہ چھٹیوں
میں حیدرآباد چلے جاتے تھے۔ راوی پروفیسر حمید الدین خاں ہیں۔ شاید میں بھی ہوں میں اس وقت یہاں موجود
تھا ایک طالب علم کی حیثیت سے اس وقت تک لکچرر نہیں ہوا تھا۔ یہ باتیں پروفیسر حمید الدین خاں سے سنا میں
جب میں لکچرر ہو کر ان کے پاس جا کر بیٹھا کرتا تھا۔ تو ہادی صاحب کا قاعدہ یہ تھا کہ ۱۵ جولائی اور ۱۶ جولائی
کو EXACTS جیسے ہی یونیورسٹی کھلتی تھی وہ اس دن نہیں آتے تھے۔ دس پندرہ روز وہ حیدرآباد میں رہتے وہ ان کا وطن
ٹھہرا۔ پھر وہ کہتے تھے کہ یہاں کی برسات میں حبس ہو جاتا ہے وہاں کی برسات میں خنکی ٹھنڈک اور ہوا رہتی ہے۔ وہ پندرہ
روز کی چھٹی مزید لیا کرتے تھے۔ ہفتہ پندرہ دن بعد وہ آکر جوائن کرتے تھے ایسا ہوا کہ حسب معمول ذاکر صاحب کو خط لکھا کہ
پندرہ دن کی چھٹی مجھے دے دیجئے مزید۔ ذاکر صاحب نے خط لکھا کہ مجھے خوشی ہوگی اگر اسی وقت جوائن کریں جس وقت
یونیورسٹی کھل رہی ہے۔ یہ خط تھا ہادی صاحب کو اس کا بہت رنج ہوا۔ انہوں نے یہاں آکر لوگوں سے ذاکر صاحب کی بہت سی
شکایتیں کیں۔ بات اصول کی تھی۔ ایک ایڈمنسٹریٹر کو ایسی ہی روک کرنی بھی چاہئے۔ اس کے بعد مزید ایک بات ہوئی۔ ذاکر صاحب
سے ایک بار ملنے گئے۔ ذاکر صاحب بہت مشغول تھے۔ اس بات کی اور زیادہ شکوہ و شکایت انہوں نے کی۔ فصیح البیان آدمی
تھے اور پھر یہ کہ اس زمانے کا علی گڑھ نسبتاً چھوٹا سا علی گڑھ تھا۔ وہ تو بڑے سینئر پروفیسر اور بڑے زمانہ دیکھے ہوئے آدمی تھے۔
اس کا ازالہ ذاکر صاحب نے یوں کیا کہ وہ خود ان کے گھر گئے اور جا کر معذرت کی کہ آپ تشریف لے گئے میں بہت ہی زبردست مشغول تھا
اس وقت کوئی میٹنگ ہو رہی تھی۔ میں نہ مل سکا اب میں حاضر ہوں آپ کی خدمت میں۔ اس کے راوی پروفیسر حمید الدین ہیں

ذاکر صاحب: ذاتی یادیں

حصہ اول کی فہرست